سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو نمبر

ریاض الفصحا

(تذکرہ ہندی گویان)

تالیف

غلام ہمدانی مصحفی

مرتبہ

مولوی عبدالحق صاحب بی، اے (علیگ) معتمد اعزازی
انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)

جامع برقی پریس دہلی

طبع اول ۱۰۰۰ ۱۹۳۴ء

قواعد و ضوابط انجمن ترقّی اردو" اورنگ آباد" (دکن)

۱۔ سرپرست وہ ہوں گے جو پانچہزار روپے یکمشت یا پانسو روپے سالانہ انجمن کو عطا فرمائیں۔ (ان کو تمام مطبوعات انجمن بلاقیمت اعلیٰ قسم کی جلد کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔)

۲۔ معاون وہ ہوں گے جو ایکہزار روپے یکمشت یا سالانہ سو روپے عطا فرمائیں گے۔ (انجمن کی تمام مطبوعات اُن کو بلاقیمت دیجائیں گی۔)

۳۔ رکن مدامی وہ ہوں گے جو اڑھائی سو روپے یکمشت عطا فرمائیں گے۔ (ان کو تمام مطبوعات انجمن مجلد نصف قیمت پر دیجائیں گی۔)

۴۔ رکن معمولی انجمن کی مطبوعات کے مستقل خریدار ہوں گے جو اس بات کی اجازت دیں گے کہ انجمن کی مطبوعات طبع ہوتے ہی بغیر دریافت کئے بذریعہ قیمت طلب پارسل انکی خدمت میں بھیجدیجائیں (ان صاجوں کو تمام مطبوعات پچیس فی صدی قیمت کم کرکے دیجائیں گی، مطبوعات انجمن کے رسالے بھی شامل ہیں)

۵۔ انجمن کی شاخیں (کتب خانے) وہ ہیں جو انجمن کو یکمشت سوا سو روپے یا بارہ روپے سالانہ دیں (انجمن ان کو اپنی مطبوعات نصف قیمت پر دیگی۔)

انجمن ترقّی اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

اپنے اُن مہربان معاونین کی فہرست مرتب کررہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو وہ بغیر ان سے دریافت کئے تیار ہوتے ہی ان کی خدمت میں بذریعہ دی۔پی۔ روانہ کردیجایا کرے۔ یہ اصحاب انجمن کے رکن ہوں گے ان کے اسمائے گرامی فہرست میں درج کئے جائیں گے اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ہوگی فوراً بغیر دریافت کئے روانہ کردیجایا کریگی۔

ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے وہ معاونین جو اردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ہیں اس اعانت کے دینے سے دریغ نہ فرمائیں گے، ان معاونین کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی۔ وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کرکے روانہ ہوں گی۔

المشتہر

انجمن ترقّی اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

فہرست

مقدمہ

اُردو شاعری کا ستارہ اُس وقت چمکا جب کہ سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقبال گہنا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ شاعری ایک پیشہ ہوگئی اور اُس عہد کے باکمال سخنور اپنے متاعِ ہُنر کو دربدر لئے پھرتے تھے کہ شاید کوئی قدر دان مل جائے۔ مصحفی ان سب میں زیادہ بدنصیب تھا۔

نام غلام ہمدانی ولد ولی محمد ابن درویش محمد، مصحفی تخلص[1]، وطن امروہہ اور مولد اکبر پور[2]۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے تذکرے میں سنہ پیدائش ۱۱۶۴ھ لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مصحفی اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں اپنے حالات کے آخر میں لکھتے ہیں کہ اس وقت میری عمر ۸۰ برس کی ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۳۶ھ میں اختتام کو پہنچا۔ اس حساب سے اُن کی پیدائش ۱۱۴۱ھ اور ۱۱۵۶ھ کے درمیان واقع ہوتی ہے۔

ابتدائی تعلیم مکتب میں امروہہ ہی میں ہوئی اس کا اشارہ انھوں نے سید محمد زمان زمان تخلص ساکن امروہہ کے حال میں کیا ہے[3]۔ اسی ضمن میں اپنے استاد کا بھی ذکر کر گئے ہیں لیکن نام نہیں لکھا۔ اصل تعلیم دلی میں ہوئی۔ چنانچہ ریاض الفصحا میں لکھتے ہیں کہ فارسی اور اُس کی نظم و نثر کی تکمیل تیس سال کی عمر میں شاہجہاں آباد میں ہوئی۔ جن دنوں میں جلاوطن ہو کر اس دیار میں تازہ تازہ پہنچا تو علمِ عربی یعنی طبیعیات، الہیات اور ریاضی مولوی مستقیم ساکن گوپامئو شاگرد مولوی حسن خواجہ تاش مولوی مبین عالم العلما سے حاصل کی اور میبذی اور صدرا پڑھا۔ قانونچہ کا درس مولوی مظہر علی سے لیا جو صرف و نحو میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ آخر عمر میں عربی ادب اور تفاسیر

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۴۰۔

(۲) تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۹۰۔

(۳) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۱۰۔ نیز دیکھو صفحہ ۲۲۷ حال محزوں و صفحہ ۱۳۰۔ حال شہید۔ (تذکرہ ہندی گویان)

قرآن مجید کا مطالعہ کیا۔ لکھتے ہیں کہ عربی سے نابلد ہونے کا جو نقص تھا وہ میں نے اس شہر میں پہنچ کر رفع کر دیا۔ دوسرا نقص علم عروض و قافیہ کی ناواقفیت تھی۔ اس کی تلافی بھی میں نے چند روز میں اساتذہ کی تصانیف کا مطالعہ کر کے کر لی اور خود اس فن میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام "خلاصۃ العروض" تھا۔

مصحفی نے اپنے استاد کا کہیں نام نہیں بتایا اور نہ کہیں اس کا ذکر کیا ہے۔ کسی اور تذکرے میں بھی اُس کا نام و نشان نہیں ملتا۔ البتہ صاحب "سراپا سخن" نے اُن کے اُستاد کا نام امانی لکھا ہے[1]۔ لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ کون تھے، کہاں کے رہنے والے تھے اور کس قماش کے شخص تھے۔

اس پر سب تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ ابتدائے شباب ہی میں وہ دلی چلے آئے تھے اور وہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی اور وہیں اُن کی شعر و شاعری چمکی۔ دلی سے انھیں خاص محبت تھی، اس کا ذکر اپنے تذکرہ میں جگہ جگہ بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ وہاں کے شاعروں، ملاقاتیوں اور یارانِ عزیز کا ذکر خیر آپ اس تذکرے میں جا بجا پائیں گے۔

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفیؔ میں رہنے والا ہوں اسی اُجڑے دیار کا

یہ وہ زمانہ تھا کہ گئی گذری حالت پر بھی دلی کا ہونا یا دلی سے منسوب ہونا یا وہاں کی بود و باش، تہذیب و شائستگی اور زباندانی کا تمغہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی بنا پر تو انھوں نے اپنے بعض حریفوں پر چوٹ کی ہے۔

بعضوں کا گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں دلی نہیں دیکھی ہے زباندان یہ کہاں ہیں

مصحفیؔ نے اپنے بزرگوں کا پیشہ "نوکریِ خانۂ بادشاہ" لکھا ہے۔ لیکن جب سلطنت کے کاروبار میں خلل واقع ہوا تو ان کا روزگار بھی درہم برہم ہو گیا۔ میر حسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ ان کی بسر اوقات تجارت[2] پر تھی۔ مصحفی نے اپنے حال میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا لیکن

---

(۱) ص ۵۴۔
(۲) تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۹۰۔ سپرنگر نے بھی بحوالہ عشقی اس کی تائید کی ہے۔

دلی کے قیام کے ذکر میں جو چند جملے ضمناً اُن کی قلم سے نکل گئے ہیں اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ میر حسن کا یہ خیال صحیح ہے کہ اُس زمانے میں اُن کی گزران تجارت ہی پر تھی۔ لکھتے ہیں :-

"میں شاہجہاں آباد میں بارہ سال تک دورِ نواب نجف خاں مرحوم میں گوشۂ عزلت میں رہا .... اور اس افراتفری کے زمانے میں تلاشِ معاش کے لئے کسی کے دروازے پر نہیں گیا"[1]

اس سے قیاس ہوتا ہے کہ دلی میں وہ اپنی معاش اپنے دست و بازو سے کماتے تھے اور کسی کے دست نگر نہ تھے۔

اگرچہ بقول خود وہ دہلی میں بارہ سال تک عزلت گزیں رہے لیکن اس پر بھی مشاعروں کی شرکت، شعر و شاعری کا چرچا برابر جاری رہا اور خود بھی اپنے ہاں مشاعرے ترتیب دیتے رہے[2] اور اُس وقت بھی اُن کی شاعری اس درجے کی سمجھی جاتی تھی کہ لوگ اُن کے شعر سننے کے لئے اُن کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔[3]

دلی کا رنگ بدلا ہوا تھا، حالات نامساعد تھے، بسر اوقات کے ذرائع تنگ ہو رہے تھے، ناچار اپنے دوسرے ہمعصروں کی طرح دل پر پتھر رکھ کر دلی کو خیرباد کہا اور وادیٔ غربت میں قدم رکھا۔ دلی کی حالت اُس وقت کیسی ہی ہو، اُس کا چھوڑنا کچھ آسان نہ تھا۔ وطن تو خیر سب ہی کو عزیز ہوتا ہے مگر اس میں کچھ ایسی کشش تھی کہ باہر سے بھی جو لوگ وہاں آ گئے تھے انھیں وہ وطن سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ پیٹ بڑا ظالم ہے اُس کی خاطر یہ مفارقت بھی گوارا کرنی پڑی۔ لیکن مرتے دم تک اس کا داغ دل سے نہ مٹا اور جب تک رہے اور جہاں رہے اُس کی صحبتوں اور خوبیوں پر مٹے رہے۔ اس

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۴۷

(۲) تذکرہ ہندی گویان، حال اسد صفحہ ۱۶، امین صفحہ ۲۰، فراق صفحہ ۱۵۷، مشتاق صفحہ ۲۱۷، محشر صفحہ ۲۴۴، نالاں صفحہ ۲۶۱، نصیر صفحہ ۲۶۱، ہاتف صفحہ ۲۷۰، نیز دیکھو عمدہ منتخبہ و مجموعہ نغز۔

(۳) دیکھو تذکرہ ہندی گویان ذکر عاقل صفحہ ۱۵۱

مقام پر ایک بات غور و تامل کے قابل ہے۔ یہ لوگ جہاں جہاں گئے (مثلاً فرخ آباد، عظیم آباد اور خاص کر لکھنؤ) وہاں والوں نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا، عزت و حرمت سے پیش آئے، آسائش پہنچائی، مسافر نہیں مہمانِ عزیز سمجھا اور وہ خدمت کی کہ غربت کی کلفت دلوں سے محو ہو گئی۔ آج کل سا حال نہ تھا کہ کوئی بھولا بھٹکا باکمال آ گیا تو سمجھے کہ غنیم چڑھ آیا۔

مصحفی دلی سے آنولہ اور ٹانڈہ پہنچے۔

جب میکدہ چھٹا تو رہی کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

ٹانڈے میں نواب محمد یار خاں امیرؔ خلف نواب علی محمد خاں، صاحبِ ذوق اور قدر شناس امیر تھے، شاعروں کا اُن کے ہاں اچھا خاصا جگھٹا تھا۔ فدوی لاہوری، میر محمد نعیم نعیمؔ، پروانہ علی شاہ پروانہ، میاں عشرت، حکیم کبیر، محمد قائم وغیرہ مجلس شعر و سخن کے رونق افروز تھے۔ میاں مصحفی بھی شریک صحبت ہو گئے۔ نواب نے میر سوز اور مرزا محمد رفیع سودا کو بھی خط لکھ کر بھیجا اور اپنے ہاں بلایا، وہ اُس زمانے میں مہربان خاں رندؔ کی سرکار میں ملازم تھے، فرخ آباد کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ لیکن یہ مجلس زیادہ مدت جمنے نہ پائی۔ سکرتال کی لڑائی (۱۱۸۵ھ) میں نواب ضابطہ خاں کو شاہ عالم نے مرہٹوں کی امداد سے ایسی شکست دی کہ ٹانڈے کی امارت درہم برہم ہو گئی۔ بیچارے فلک زدہ شاعروں کا وہاں کوئی ٹھکانا نہ رہا اور منتشر ہو گئے۔

مصحفی ٹانڈے سے ۱۱۹۰ھ کے لگ بھگ لکھنؤ پہنچے۔ یہ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا، سودا وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اُن سے اور بعض مشہور شعرا سے ملاقات ہوئی۔ ابھی سال بھر ہی رہنے پائے تھے کہ طبیعت اچاٹ ہوئی اور پھر دلی کا رُخ کیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہاں کوئی سرپرست اور قدردان نہ ملا اور روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی۔ لیکن دلی میں کیا رکھا تھا، حالت پہلے سے بھی بدتر تھی۔ آخر تھوڑے دنوں کے بعد ہی دوبارہ لکھنؤ پہنچے۔

لکھنؤ پہنچ کر چندروز صبا (لالہ کانجی مل، کایستھ سکسینہ) کے ہاں قیام رہا[1]۔ اس کے بعد

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۴۱۔

چندے میر محمد نعیم خاں کی رفاقت میں رہے[1]۔ پھر مرزا زین العابدین عرف مرزا مینڈھو سرسبز تخلص (فرزند نواب سالار جنگ) نے جو اردو شاعری کے بڑے دلدادہ تھے بہ سلسلہ شاعری اپنی رفاقت و مصاحبت میں لے لیا۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ بڑی عزت سے پیش آتے تھے اور شعر و سخن میں مشورہ کرتے تھے۔ چار سال تک یعنی ۱۲۰۶ھ تک انھیں کے پاس رہے[2]۔

دلی کے شاہزادے، شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ اُس زمانے میں لکھنؤ میں تھے۔ صاحب عالم نے لکھنؤ کی سرزمین پر چھوٹی سی دلی بسا رکھی تھی اور سارا ٹھاٹ وہی قائم کر رکھا تھا۔ دلی سے جو جاتا پہلے اُن کی سرکار میں اپنا ٹھکانا ڈھونڈھتا۔ شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے اور شعرا اور اہل کمال کے قدردان تھے۔ انشا، جرأت، سوز، مصحفی وغیرہ انھیں کے دربار میں ملازم تھے یا انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔ بارہ سو سات آٹھ ہجری میں مصحفی بھی میر انشاء اللہ کی وساطت سے اس دربار میں داخل ہوئے[3]۔

ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت و غمازی اور ساز و باز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی ہے۔ ہر منہ چڑھا مصاحب دوسرے کے اکھاڑنے اور اپنے جمانے کی فکر میں رہتا ہے اور اس میں وہ عیاریاں اور افترا پردازیاں، حرفتیں اور جدتیں کام میں لائی جاتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انشا، جرأت اور مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے۔ اول اول شاعرانہ چشمک رہی، بعد میں بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ و جدل اور فحش اور پھکڑ تک پہنچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشا نے وہ وہ کیچڑ اچھالی ہے کہ حیا اور غیرت کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ سید انشا بجد ظریف ٹھٹھول اور بیچین طبیعت کے تھے اور اس پر ذہانت اور غضب تھی۔ مصحفی پختہ اور پرانے استاد تھے، ساتھ شاگردوں کا لشکر تھا۔ انشا کی زیادتیاں گوارا نہ ہوئیں، ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس کے مزے صاحب عالم اور نواب بھی لینے لگے اور شہر والوں کو ایک دل لگی

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۵۔ (۲) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۱۸

(۳) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۲۱۔ آزاد نے جو یہ لکھا ہے کہ مصحفی پہلے سے دربار میں تھے اور انشا بعد میں آئے صحیح نہیں۔

ہاتھ آگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طراری، تیزی اور رسوخ سے بازی لے گئے۔ اور مصحفی کو خفت نصیب ہوئی۔ صاحب عالم کی نظریں ان کی طرف سے پھر گئیں، تنخواہ میں بھی تخفیف ہوئی اور آخر میں قطع تعلق کر کے خانہ نشین ہو گئے۔ اپنی تنخواہ کا ذکر کس حسرت سے کیا ہے:۔

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق | تھا مرد معمر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے | ہم بھی کبھی روزوں میں تھے پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر | ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

مصحفی طبیعت کے بہت نیک اور مرنجِ و مرنجان شخص تھے۔ اُن کے ہمعصر تذکرہ نویسوں نے اُن کے مزاج اور اخلاق کی بہت تعریف کی ہے اور اُنھیں خلیق، متواضع، مسکین وضع، مسکین نہاد اور نیک سیرت لکھا ہے[1]۔ وہ کبھی درباری شاعروں سے نہ اُلجھتے۔ لیکن جب دوسری طرف سے چھیڑ شروع ہوئی تو اُس کے جواب میں خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ کچھ تو شاعری کا گھمنڈ، کچھ درباری حالات اور اس پر شاگردوں کی شہ نے معاملہ کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

یہ حالات اُس زمانے کی معاشرت پر دُھندلی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

مصحفی کی زندگی پریشان حالی، تنگدستی اور عُسرت میں گزری۔ اگرچہ کئی امیروں کی رفاقت اور صحبت رہی اور شاگرد بھی اُن کے کثرت سے ہوئے جن میں بڑے بڑے لوگ بھی تھے مگر کبھی فراغ بالی اور معاش کی طرف سے اطمینان نصیب نہ ہوا۔ علی لطف صاحبِ گلشنِ ہند نے اُن کے احوال میں صحیح لکھا ہے "...... برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے۔ ضیق معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیب اہل کمال ہے، اسی طور پر درہم برہم اس غریب کا بھی احوال ہے"۔ آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ یا تو سعادتمند شاگرد اُن کی مدد کرتے تھے یا غزلیں بیچ بیچ کے اپنی بسر اوقات کرتے تھے۔ اس طرح کلام کا بہت سا حصہ دوسروں کی قسمت میں آگیا۔

---

(۱) دیکھو ذکر مصحفی تذکرہ قدرت اللہ شوق، تذکرہ قدرت اللہ قاسم اور عمدۂ منتخبہ میں۔

مصحفی نے عمر بھی بہت پائی، پرانے اُستاد جنھوں نے اردو کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور نئی پود جس نے آگے چل کر بڑا نام پایا، سب کو دیکھا، پرکھا اور اکثر اُن کے سامنے چل بسے۔ وفات کا صحیح سنہ معلوم نہ ہو سکا۔ تذکرہ ریاض الفصحا میں جس کا سنہ اختتام ۱۲۳۶ھ ہے لکھتے ہیں کہ اس وقت میری عمر اسّی سال کی ہو۔ شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ آج کے دن مصحفی کو مرے دس سال ہوتے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۲۵۰ھ میں لکھا گیا، اس حساب سے اُن کا سنہ وفات ۱۲۴۰ھ ہوا اور عمر چوراسی سال کی۔

مصحفی کے استاد ہونے میں شبہ نہیں۔ بڑے مشاق اور ریختہ گو شاعر تھے۔ آٹھ دیوان، متعدد قصائد اور مثنویاں اُن کی تصنیف سے اب تک باقی ہیں۔ علاوہ اس ضخیم کلام کے شعرا کے تین تذکرے بھی اُن کی بڑی یادگار رہیں جو اب تک گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔

سب سے پہلا تذکرہ فارسی گو شعرا کا ہو جس کا نام عقد ثریا ہے۔ اس میں تین قسم کے شعرا کا ذکر ہے۔ اول شعرائے ایران جو ہندوستان میں کبھی نہیں آئے۔ دوسرے وہ شعرائے ایران جو ہندوستان آئے۔ تیسرے ہندوستانی فارسی گو شاعر۔ دوسرا تذکرہ اردو کہنے والے شاعروں کا ہو۔ تیسرے تذکرے کا نام ریاض الفصحا ہے۔ اس تذکرے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جن لوگوں کے نام پہلے تذکرے میں لکھنے سے رہ گئے تھے اُن کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔

ان تینوں میں تذکرہ نمبر ۲ یعنی تذکرہ ہندی اصل ہو، باقی دو کو اُس کا تکملہ سمجھنا چاہیے یہ تذکرہ جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ہے۔ میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کی فرمائش سے تحریر میں آیا اور عہد فردوس آرامگاہ (محمد شاہ بادشاہ) سے شاہ عالم بادشاہ کے زمانے تک کے شعرا کا حال درج ہے۔ بعض متقدم شعرا کے حالات تبرکاً لکھ دیے گئے ہیں لیکن زیادہ تر اس میں معاصرین ہی کا ذکر ہے[1]۔

مصحفی کا زمانہ معمولی نہیں تھا۔ یہ اردو زبان کی ترقی و فروغ کا نہایت ممتاز دور ہے۔

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۳، ۴

اگرچہ فارسی کا رواج عام تھا، مکتبوں اور مدرسوں میں فارسی کی تعلیم برابر جاری تھی، فارسی کا پڑھنا علم و فضل ہی کے لئے نہیں بلکہ تہذیب و شائستگی کے لئے لازم خیال کیا جاتا تھا، لوگ فارسی شعر و سخن کے ایسے ہی دلدادہ تھے جیسے اکبر و جہانگیر کے زمانے میں۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ یہی تذکرے جو اُردو شعرا کے ہیں فارسی میں لکھے گئے۔ اس سے پہلے اور بعد بھی بہت سے تذکرے جو اردو شاعروں کے لکھے گئے فارسی میں ہیں۔ لیکن اردو زبان رفتہ رفتہ زور پکڑتی جاتی تھی اور مصحفی کے زمانے میں تو اُس نے یہ قوت حاصل کر لی تھی کہ ہمارے مستند شاعر فارسی کو چھوڑ کر اُردو کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ خود مصحفی جو فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی کے دو دیوان مرتب کر چکے تھے جن میں سے ایک نظیری نیشاپوری کے جواب میں ہے، اپنے حال میں لکھتے ہیں "بمقتضائے رواجِ زمانہ آخر کار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے اینکہ رواجِ شعر فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زمانناً بہ پایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ (بلکہ از و بہتر گردیدہ)[1]۔" اس سے بڑھ کر کوئی اور مستند شہادت نہیں ہو سکتی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس دور میں اُردو کے ایسے بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں جن کی بدولت اُردو نے وہ فروغ حاصل کیا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اُردو میں لطافت و شیرینی، قوت اور وسعت پیدا کی اور اُس کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ اُن کی زبان اور کلام کا اثر اب تک باقی ہے اور باقی رہے گا۔

مصحفی کی حاتم سے لے کر نصیر دہلوی تک ذاتی ملاقات تھی۔ بعض اُن میں سے بزرگ تھے جیسے حاتم، خواجہ میر درد، میر، سودا، فغاں وغیرہ، بعض ہم عمر اور ہمعصر تھے مثلاً قائم، جرأت، سوز، بقا، انشا، حسن، حسرت وغیرہ، بعض نو مشق تھے اور نام پیدا کر رہے تھے جیسے آتش، ناسخ، نصیر، رنگین، ممنون، طپش، خلیق، افسوس وغیرہ وغیرہ۔ شاگرد بھی مصحفی کے اس کثرت

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۴۸۔ قوسین کے الفاظ ایک نسخہ میں ہیں دوسرے میں نہیں۔

سے تھے کہ پرانے اساتذہ میں شاذ ہی کسی کے ہوں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

شاگردِ تازہ از پسِ شاگرد می رسد　　　یعنی رجوعِ خلق بسویت ہماں کہ بُو

ان میں سے بعضوں نے بہت نام پایا مثلاً ضمیر، خلیق، رنگین، پروانہ، تنہا اور منتظر اور گرم دونوں اُن کے خاص اور عزیز شاگرد تھے۔ اکثر کا حال ان تذکروں میں موجود ہے۔ ان تذکروں میں اکثر شعرا ایسے ہیں جن سے مصحفی ذاتی طور پر واقف تھے یا اُن سے دوستانہ تعلقات تھے۔ جن کو نہیں جانتے تھے اُن کے متعلق صاف لکھ دیا ہے کہ میں نہیں جانتا۔

مصحفی نے اپنے تذکرے صاف اور سیدھی زبان میں لکھے ہیں تکلف اور تصنع اور عبارت آرائی سے کام نہیں لیا۔ کہیں بے جا طول نہیں دیا، جو حالات جس کسی کے معلوم تھے مختصر طور پر صاف صاف لکھ دئے ہیں۔ انھیں حالات کے ضمن میں کہیں کہیں اُس زمانے کی شعر و شاعری اور اردو ادب کے اتار چڑھاؤ کی کیفیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ مثلاً حاتم کے ذکر میں اُن کی زبانی ولی کے دیوان کا شاہجہاں آباد میں آنا، لوگوں میں اُس کا چرچا ہونا، بعض صاحبوں کا ایہام گوئی پر اردو شاعری کی بنیاد رکھنا چند سطروں میں خوبی سے بیان کیا ہے۔ اُسی کے ساتھ حاتم کی بزرگی، اُن کے دیوان زادے اور رنگینیِ استادی کا تذکرہ بھی اپنے انداز میں خوب لکھا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں مشاعروں کی حالت، اپنے مشاعرے کا ذکر بعض نامور اور ہمعصر شعرا کی ملاقات کا حال جگہ جگہ لکھے گئے ہیں۔ ایک جگہ مشاعروں کے متعلق لکھا ہے کہ تجربہ میں آیا ہے کہ ایسی مجلسیں ایک سال سے زیادہ نہیں رہنے پاتیں، ضرور کوئی نہ کوئی تفرقہ اور خلل پیدا ہو جاتا ہے[1]۔

وہ اپنے تذکروں میں شعرا کے کلام کے متعلق رائے لکھتے ہیں لیکن اُس میں تنقیدی حیثیت بہت کم ہوتی ہے۔ تاہم بعض نامور شعرا کے متعلق اُن کی رائیں خاص وقعت

(۱) حال شیخ مغل خانی (تذکرۂ ثانی)

رکھتی ہیں۔ مثلاً سودا کے تذکرے میں اگرچہ پورا ایک صفحہ بھی نہیں لکھا لیکن جو کچھ لکھا ہے اُس میں اُن کے کمال اور سیرت کی تصویر کھینچ دی ہے۔ نکتہ چینوں کے اعتراضات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں "غرض ہرچہ بود، در روانیِ طبع نظیر خود نہ داشت۔" اور آخر میں کہتے ہیں "نقاش اولِ قصیدہ در زبان ریختہ اوست، حالا ہر کہ گوید پیرو و متبعش خواہد بود۔"

مظہر جان جاناں کی نسبت فرماتے ہیں کہ "در دورِ ایہام گویان اول کسے کہ شعرِ ریختہ بہ تتبعِ فارسی گفتہ اوست۔" آخر میں لکھتے ہیں "فی الحقیقت نقاش اولِ ریختہ بایں وتیرہ باعتقاد فقیر مرزاست، بعدہٗ تتبعش بہ دیگراں رسیدہ۔"

سودا سے مقابلہ کرنے کے بعد جس کا رواج اُس وقت عام تھا اور جس کا اثر اب بھی باقی ہے۔ میر صاحب کی نسبت فرماتے ہیں "غرض ہرچہ ہست استادیِ ریختہ بر و مسلم است ... ... ہمہ ریختہ گویان ہند سند از کلامش می آرند و او را دریں فن مستثنیٰ می دانند و الحق چنین است۔"

یقین کے کلام کے متعلق بھی قریب قریب وہی رائے ظاہر کی ہے جو مظہر جان جاناں کے حق میں لکھی ہے۔ آخر یقین ہیں تو مظہر ہی کے تربیت یافتہ۔ کہتے ہیں کہ "در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود، بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ۔"

مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے میر حسن کی مثنوی کی سچی تعریف کی ہے "در مثنویِ آخر کہ سحر البیان نام دارد یدِ بیضا نمودہ۔ الحق کہ کار کارِ اوست قطع نظر از بلاغتِ شاعری زبانش بسیار بامزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ۔"

ہمعصروں کے کلام کے متعلق صحیح رائے کا ظاہر کرنا آسان نہیں، اور خاص کر ایسے لوگوں کے متعلق جن سے آویزش اور چشمک رہی ہو۔ انشاء اللہ خاں اور اُن میں کیا کچھ نہیں گذری تھی اور ان بزرگوں نے کون سی بات تھی جو اٹھا رکھی تھی، اس پر بھی جب وہ انشا کا حال لکھنے بیٹھے تو سچی تعریف اور بے لاگ رائے ظاہر کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اُن کی سہ زبانی اور خاص کر

فارسی دانی کی تعریف کی ہے۔ انشا نے مثنوی شیر برنج مولانا بہاء الدین آملی کی مثنوی نان و حلوا کے جواب میں لکھی اُس کی نسبت لکھتے ہیں "بسیار بصفا گفتہ داد فصاحتِ زبان فارسی در و داده"۔ اُن کے اُردو کلام کے متعلق یہ فقرہ لکھا ہے "اگرچہ ہمہ کلامش در عالم ظرافت، خالی از کیفیتے نیست امّا آنچہ از اشعار سادہ اش انتخاب فقیر افتادہ اینست"۔ اُن کے کلام کا انتخاب بھی بہت اچھا کیا ہے۔ انتقال کے بعد بھی انہیں یاد کیا ہے ؎

مصحفیؔ کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں   یاد ہے مرگِ قتیلؔ و مردنِ انشاؔ مجھے

بقاؔ سے مصحفی کے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ اُس کے خلق و ظرافت اور قناعت کی تعریف کرتے ہیں لیکن کلام کے متعلق صاف لکھ دیا ہے کہ "در قصیدہ یدِ طولیٰ دارد . . . امّا در گفتنِ غزل بطی است"۔

آتشؔ اُن کے شاگرد تھے، اُن کے متعلق کیا صحیح رائے دی ہے "اگر عمرش وفا کردہ و چندیں سال برہمیں و تیرہ رفت و فکر تینش را مانعے در پیش نیاید یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد"۔

رنگینؔ بھی اُن کے شاگرد تھے کیا خوب کہا ہے کہ "ہرچند چنداں بہرۂ از علم ندارد امّا ذکاوتِ طبعش بر صاحبِ علمان غالب"۔ رنگین نے اپنا دیوان اصلاح کے لئے پیش کیا شروع سے آخر تک دیکھ کر فرمایا "کلامش بسیار کم اصلاح بر آمدہ"۔ اصل رائے یہ ہے "چوں مزاجش عشق باز افتادہ، اکثر قطعہائے خوب خوب و غزل و نامہ ہائے نغز نغز بہ سلکِ نظم کشید"۔

ناسخؔ کی نسبت ایک جگہ فرماتے ہیں "تلاش ہائے معانی تازہ می کند"۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "بہ معنی بندیٔ تازہ علمِ استادی برافراشتہ"۔ لیکن مصحفی اس قسم کی شاعری کو جس میں معنی بندی اور "اشعار خیالی" زیادہ ہوتے ہیں پسند نہیں کرتے تھے[1]۔

(۱) دیکھو ذکر واجد تذکرۂ ثانی۔

مصحفی کے تذکروں میں بیسیوں ہندو شاعروں کا حال درج ہے۔ ان کا ذکر بھی اسی گرم دلی اور خوبی سے کرتے ہیں جیسا دوسروں کا۔ اس سے اُس زمانے کی تہذیب اور آپس کی یک جہتی کا اندازہ ہوتا ہے۔

تذکرے میں اکثر نامور شعرا کی تاریخ وفات کے قطعے لکھے ہیں۔ اس فن میں انھیں خاص دخل تھا۔

میر سوز کے ابتدائی تخلص "میر" کی شہادت بھی اس تذکرے سے ملتی ہے۔

سعادت امروہوی کا حال بھی لکھا ہے لیکن میر صاحب کے تعلق تلمذ و استادی کا ذکر نہیں کیا۔

مصحفی نے اپنے تذکروں میں ضمناً صرف تین تذکروں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک تذکرہ میر حسن[1] دوسرے تذکرہ گردیزی[2] تیسرے تذکرہ قدرت اللہ شوق۔

ایک بات اور قابل لحاظ ان تذکروں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں تک تحقیق ہوا ہے اردو شعرا میں مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے "اردو" کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان تذکروں میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے۔ حضور کے حال میں ذکر کرتے ہیں کہ ایک روز شاہجہاں آباد میں لطف علی خاں ناطق کے گھر پر مشاعرہ تھا۔ میر صاحب کی طرحی غزل میں قافیہ کے بعد ردیف "اور" بمعنی طرف تھی۔ بعضے فصحا نے اُسے خلافِ "اردو" خیال کر کے اُس کی پیروی نہ کی۔ نثار کے حال میں لکھتے ہیں کہ "ادائے زبان اردو چنانچہ باید از زبانِ ندرت بیانش می شود" قہر کے تذکرے میں مرزا قتیل کے متعلق فرماتے ہیں کہ "او ہم باوصفِ فارسی گوئی دعوئے اُردو دانیٔ ریختہ داشت" اسی طرح ہجور کے حال میں لکھا ہے کہ "سہ کتاب در زبانِ اردوئے ریختہ شکر آمیختہ از خامہ فکر رونق سواد پذیرفتہ"۔ لیکن "زبانِ اردوئے معلی" کا لفظ سب سے پہلے میر صاحب نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں لکھا ہے[3]

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۸۰ ذکر خاکسار۔ صفحہ ۲۶۰ ذکر نالاں

(۲) دیکھو صفحہ ۳۴ ذکر بقا۔ (تذکرہ ہندی گویان) (۳) صفحہ ایک

انشاء نے بھی جا بجا دریائے لطافت میں اردو کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد پھر میر امن کی باغ و بہار میں نظر آتا ہے۔

پہلے تذکرے کے آخر میں چند شاعر عورتوں کا حال بھی درج ہے۔

ان تینوں تذکروں کی تصنیف کی تاریخیں یہ ہیں۔

تذکرۂ اول، ہندی گویان۔ سنہ ۱۲۰۱ھ سے قبل شروع ہوتا ہے اور سنہ ۱۲۰۹ھ میں ختم ہوتا ہے۔ تاریخ اختتام تو مصحفی نے خود لکھ دی ہے۔ ابتدا کا صحیح سنہ تو معلوم نہیں ہو سکا لیکن خاکسار کے ذکر میں میر حسن (متوفی سنہ ۱۲۰۱ھ) کا تذکرہ ضمناً آگیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس سنہ سے قبل لکھنا شروع کر چکے تھے۔

تذکرۂ دوم، ہندی گویاں۔ اس کا سنہ تصنیف اس کے نام ریاض الفصحا سے نکلتا ہے یعنی سنہ ۱۲۲۱ھ، لیکن یہ تاریخ آغاز ہے، تاریخ اختتام سنہ ۱۲۳۶ھ ہے۔

تذکرۂ فارسی گویان یعنی عقد ثریا کا سنہ تصنیف ۱۱۹۹ھ ہے۔

ہندی گو شاعروں کے دو تذکرے ہیں۔ ان میں بعض شعرا کے حالات مشترک ہیں، اس لئے کہیں کہیں بعض شعرا کے حالات کے متعلق رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ہے ایک عالم شباب کا نتیجہ ہے اور دوسرا زمانۂ شیب کا۔

ہندی گویوں کا پہلا تذکرہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے نسخے پر مبنی ہے۔ البتہ اس کا مقابلہ خدا بخش خاں کے کتب خانے کے نسخے سے کیا گیا۔ بعض مشتبہ مقامات کا مقابلہ کتب خانہ مدرسۂ ندوۃ العلماء سے بھی کیا گیا۔ باقی دو تذکرے خدا بخش خاں کے کتب خانے کے نسخوں کی نقل ہیں۔ بعد ازاں ان تینوں تذکروں کے مبیضوں کا مقابلہ کتب خانۂ ریاستِ رامپور کے نسخوں سے ہوا۔ افسوس ہے کہ کتب خانہ خدا بخش خاں اور رامپور کے نسخے بہت غلط اور بدخط نکلے۔ تاہم مقابلے سے بعض مقامات کی کچھ نہ کچھ تصحیح ہو گئی۔

میں قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا ایڈوکیٹ پٹنہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے

دونوں نسخوں کی نقل خدا بخش خاں کے کتب خانے سے لکھوا کر بھیجی اور خود بڑی احتیاط سے تینوں نسخوں کا مقابلہ وہاں کے نسخوں سے کیا۔

حاشیہ میں ان نسخوں کا حوالہ درج کردیا گیا ہے۔ ن۔خ سے مراد نسخۂ کتب خانۂ خدا بخش خاں ہے اور ن۔ر سے نسخۂ رامپور۔ جہاں صرف ن لکھا ہے اُس سے بھی نسخۂ رامپور مراد ہے۔

عبدالحق

حیدرآباد دکن

۸ر نومبر ۱۹۳۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی

اے قلم از کار رفتہ بیا در معرکۂ مرداں کہ ایں رزم بزمِ آخر است و ہر قدر قوتِ بازو وجوہر برشِ شمشیرِ فصاحت و بلاغت را بیارانِ جواہر شناس لفظ و معنی عرضہ دہی آفریں اول در آخر فزوں است و ہر قسم نزاکت و نازآفرینی را در تحریرِ جلدِ دوم تذکرۂ ہندی گویانِ حال بکار بری تحسینِ شباب در عالمِ شیب ملاحظہ کنی ، اما باید کہ آغاز بحمد باری عزّاسمہ نمای و قفلِ چندیں سالہ را بکلیدِ بسم اللہ کشائی و بگوئی کہ الحمد للہ الذی نور قلوبنا بنور معرفتک واسہل علینا مصائب الدہر ولئن بالنا کشمع الملتہب نیران الایقان و درود لاتعد و تحصی بر پیش روِ کاردانِ حقیقت کہ فصاحتِ زبانش بازارِ عجبِ بلاغتِ فصیحانِ عرب شکستہ و بر ہر ہفت قصیدۂ معلقہ در کعبہ نقش دعوئی سبعِ مثانی بر رونق تمام نشستہ۔ صلی اللہ علیہ والہ وسلم۔

اما بعد میگوید فقیر حقیر غلام ہمدانی مصحفیؔ تخلص کہ پیش ازیں چند سال زمانہ بود کہ منِ مسکیں از بے ادائی دوستانِ زبانی زبانِ نطق بکام کشیدہ، بگوشۂ عزلت و قناعت گلیمِ سیہ بختی بر دوش انگندہ، گمنام وار بسر می بردم و بر شعر و شاعراں[1] و ملاقاتِ امیراں

(۱) شاگرداں

تبرّا می کردم و وحشی وار ازیں قوم می رمیدم تا ایں کہ نظمِ طبیعت مرا اندک بازرام کردن گرفت و بسبب سلسلہ جنبانیٔ سخن گردید۔ بایں طریق کہ روزے شیخ محمد علی تنہا تخلص آمدہ عرض کرد کہ اے قبلہ اگر برائے مشقِ ما مردم صحبتِ جلسہ انعقاد دادہ شود اغلب کہ در رائے شریف ہم اولیٰ و انسب باشد التماس ایشاں را پذیرہ کردہ در ویرانۂ بیرونِ شہر کہ روشن آرا میگویند بایں روش ولے خانی[(۲)] میکردیم و شریکِ جلسہ غیر شاگردان دیگرے کم شد چوں مرا در آں روزہا تعطیل محض بود، ایں شغل را بپاسِ خاطرِ دوستاں در پیش گرفتم، و میاں نورالاسلام منتظر تخلص کہ خدا ایشانرا بیامرزاد و میرزا حیدر علی گرم تخلص کہ از مدتے بطرفِ حیدرآباد دکن در رفتہ و آنجا نام و نشانے پیدا کردہ شمعِ مجلسِ جلسہ بودند۔ دو سہ سال رونقِ جلسہ روز بروز رو بہ ترقی داشت دریں اثنا میاں نورالاسلام بسببِ بیماریٔ سِل سفرِ ناگزیر در پیش آمد، شکستِ عظیم بر دل من افتاد، وصحبتِ جلسہ معینہ بگسیخت بہمدران نزدیکے میرزا حیدر علی گرم بعد وفاتِ میاں منتظر بہ طرفِ کالپی ہمراہِ یکے از دوستاں رفت افسردہ خاطری باز مرا در یافت در ہماں ایام بہ نواب مرزا محمد تقی خاں بہادر ہوس تخلص کہ از قدیم معرفتے داشتم دوچار شدم پیل راعنان گرفتہ احوال پرسیٔ من کردند و از من وعدۂ قطعی گرفتند و مرا بر مکانِ خود طلبیدند صبیحِ من مرزا حیدر علی کہ دراں ایام بہ لکھنؤ بود در رفتم از طرفِ ایشاں بسیار سخنانِ دل گرمی درمیان آمد چوں کمال توجہ و مہربانی از شیریں زبانی ملاحظہ کردم از ہماں روز عرصہ چار سال گزشتہ باشد کہ ملازم در رفیقِ ایشانم مرا باستادی برداشتہ ہمیشہ مشورۂ سخن از من میگیرند وانچہ مقسومِ من است از دست و عطائے مہربانیٔ ایشاں می رسد، مشاعرہ تیز میکند حق تعالیٰ سلامت دارد و چوں در تذکرۂ اول اسمِ ایشاں حسبِ اتفاق مرفوعِ قلم ماندہ لہذا دریں

(نوٹ صفحہ اول، ن شاعری۔ (۱) ن مردم صحبت خواندن شعر انعقاد دادہ شود خالی از لطف نخواہد بود

(۲) ن بایں روش قرار دادم۔

جریدہ بتلافیٔ آں پرداختم وسببِ تالیفِ جلد آن است کہ روئے نظر بر کثرتِ موزوں طبعان حال کردہ بخاطر گذرانیدم کہ اگر یک تذکرہ دیگر تالیف نمائی اغلب کہ اسامیٔ ایں گروہ نیز حروفِ تہجی را وفا کند ایں بگفتم وکمیتِ قلم را در عرصۂ تحریرِ احوال واشعارِ شعرا جولاں دادم آنانکہ در تذکرۂ ہندی وفارسیٔ من نیستند آں ہر دو فریق را در جلدِ ثانی درآوردم تا جامع جمیع اسما باشد واحوالِ ہر یک را بقدرِ لیاقتِ ہر کس چنانکہ رسمِ تذکرہ نویساں است نگاشتم۔ امید کہ سوادِ ایں بیاض کہ نورِ دیدۂ اولی الابصار است سرمۂ چشمِ صاحبانِ دانش وبینش شود واز عین الکمالِ "زمانۂ ناتواں بین" اور اچشم زوال بے (۱)، مرساد وتاریخِ ایں تذکرہ لالہ چنی لال حریف کہ آغازش بہ تکلیف مومی الیہ بود چنیں یافتہ۔ تاریخ :-

صد شکر کہ ایں ذخیرۂ اہلِ سخن — شد انجمنِ سپہر را رشک افزا
از خامۂ فکرِ خود برآوردہ حریف — سال تاریخ او ریاض الفصحا
۱۲۴۱

حرف الالف

امیر

نواب قمر رکاب امین الدولہ معین الملک امیر تخلص عرف مرزا مینڈھو خلف نواب شجاع الدولہ مرحوم ومغفور رجوا نیست بزیورِ فضل وکمال آراستہ در نظم ونثرِ فارسی وعلمِ تواریخ مہارتِ کلی دارند وبر فقیر از ابتدائے ملاقات تا در شاہجہاں آباد توجہ ومہربانی می فرمودند ودر لکھنؤ ہم اکثر بخدمتِ کیمیا خاصیتِ ایشاں میسر شد اشعار موزوں کردہ در ہر دو

---

(۱) زمانہ ناتواں بیں گزندِ زوال مہرساد (ن)

زبان بسیار بلند دارند اما انچہ بالفعل بہم رسیدہ این ست :-

کہتا ہے گل سے میرے کوئی روبرو نہ آوے
عشق اور عاشقی کی کچھ گفتگو نہ آوے

نازک دماغی دیکھو ہنگام سیرِ گلشن
رکھتا ہے ہاتھ منہ پر تا گل کی بو نہ آوے

اللہ رے شان تیری اے حسن جس کے باعث
ہونٹوں پہ حرفِ شکوہ اور آرزو نہ آوے

منظور یہ نہیں ہے تم چشم تر کو دیکھو
آغشتہ خونِ دل میں داغ جگر کو دیکھو

کھل جائے تا کہ قلعی اس حسن عارضی کی
یک چند اُس کا چہرہ اور تم قمر کو دیکھو

کرتا ہے ایک پل میں یہ سیر لامکاں کی
میری نگہ کے مرغِ بے بال و پر کو دیکھو

کھویا گیا ہے میرا دل واسطے خدا کے
مٹھی کو اُس کی دیکھو جیب و کمر کو دیکھو

کل سے ہوں اسکو پایا میں آج تند و سرکش
میری دعا کے یارو! تم ٹک اثر کو دیکھو

یارو! امیر سے تم زار و نزار او پر
جاتا یہ اُس کا سج کر تیغ و سپر کو دیکھو

آتش

خواجہ حیدر علی ولد خواجہ علی بخش المتخلص بہ آتش جوان وجیہ و مہذب الاخلاق است سلسلہ نسبش بخواجہ عبد اللہ احرار منتہی می شود۔ بزرگانش در بغداد توطن داشتند بعد از جلائے وطن قدیم در شاہجہاں آباد کہ بہ قلعۂ کہنہ شہرت دارد استقامت گرفتند مومی الیہ از ابتدائے[1] موزونیٔ طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی ہر دو میکرد اما میلانِ طبعش بہ طرفِ فارسی بیشتر بود، و آں روزہا کلامِ منظومِ خود را بہ نظرِ فقیر میگذرانید و براففتِ طبعش ازاں جلوہ ظہور میداد حالانکہ سن عمرش بہ بست و نہ سالگی رسیدہ دریائے طبعش بہ جوش و خروش۔ و در زبانِ

---

(۱) از ابتدا موزونی طبع فکر شعر ہندی می کند۔ (ن)

نظمِ ریختہ کہ آنہم در متانت و رزانت از غزلِ فارسی کم نیست، کہ بر معاصرینش سبقت بردہ جستن دشوار می نماید اگر عمرش وفا کردہ وچند سال برہمیں تیرہ رفت وفکرِ متینش را ما نعے در پیش نیامدے یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد از وست :-

فزوں ہوتا ہی جمعیت سی زیرِ آسماں کھٹکا ۔۔۔ درختِ بارور ہیں باندھتا ہی باغباں کھٹکا

ہر دم تفِ دروں سے ہم آفت طلب رہی ۔۔۔ ہی دشمنِ حیات جگر میں جو تب رہے
جا کی ہی تو نے منزلِ دل میں تو اے صنم ۔۔۔ آنکھوں کا بھی حجاب یہ ہم سی نہ اب رہے
اللہ ری بے نیازئ محبوب آفریں ۔۔۔ دل سے قریب ہو کے کوئی دور جب رہے
معدوم جوشِ گریہ سے ہو گیا بخارِ دل ۔۔۔ کچھ گرد تو نہیں یہ جو باراں سی دب رہے
روپوش اک حبیب کا کشتہ ہوں چاہیئے ۔۔۔ مرقد بھی بے چراغ مرا شب کے شب رہے
رکھئے قدم رقیب نہ کوئے حبیب میں ۔۔۔ بیشے میں شیر کے نہ سگِ بے ادب رہے
آتش ظہورِ مہدیٔ دیں ہو خدا کرے ۔۔۔ تا چند بے چراغ یہ معمورہ اب رہے

حبابِ بحر میں دیوانوں کو زندانِ ہستی ہی ۔۔۔ ہمیں دشتِ عدم تک جا پہنچا جوشِ مستی ہی
سرِ جاناں رکھا کب میں نے زانوئے تصور میں ۔۔۔ شبِ ہجر آہ کیوں چوٹی کی ناگن بن کے ڈستی ہی
برہمن زلف و مردم گبر و کافر خالِ ہندو ہے ۔۔۔ رخِ محبوب ہے یا نا مسلمانوں کی بستی ہی
وہ دہقانِ غریبِ سرزمینِ عشق بازی ہوں ۔۔۔ عوضِ باراں کے میری کشت پر آفت برستی ہی
پسندِ طبعِ محبوباں دلِ عاشق نہیں ہوتا ۔۔۔ نظر میں کب کسی کے جنس چڑھتی ہی جو سستی ہی
دلِ صاف اپنا کیونکر نقشِ خوباں کا نہ طالب ہو ۔۔۔ ازل سے کارِ لوحِ آئینہ صورت پرستی ہی
فرومایہ کی گردن خمِ فلک سی بھی نہیں ہوتی ۔۔۔ بھلا تیغِ گلی کو بھی کہیں دیکھا کہ کستی ہی
مبارکباد خونِ حسرتِ نظارہ عاشق کو ۔۔۔ ہمیشہ بازوئے قاتل کو مشقِ تیز دستی ہی

ہوائے سیرِ دشت و کوہ ہے تو کر سبک باری ۔۔۔ کہ یکساں سایہ کو آتش بلندی اور پستی ہے

خاک ہوتے ہی ہر ایک دامان نے جا دی مجھے ۔۔۔ ہو گئی اقبال آخر میری بربادی مجھے
طاقِ ابروئے صنم کی یاد میں نالاں رہا ۔۔۔ برہمن سمجھے درِ کعبہ کا فریادی مجھے
ایک دم میں کٹ گئی یہ منزلِ دورِ عدم ۔۔۔ راہزن کہتے تھے جس کو ہو گیا ہادی مجھے
ہے تصور میں مرے ہر کوہ رشکِ کوہِ طور ۔۔۔ وادیٔ ایمن کی عزت ہے ہر اک وادی مجھے
کم نصیب ایسا ہوں گر ہو خرمی کو اذنِ عام ۔۔۔ ہو نہ شادی مرگ ہو نیکے سوا شادی مجھے
تالیاں لڑکے بجاتے ہیں مری آواز پر ۔۔۔ اے جنوں تو نے بنایا چغدِ آبادی مجھے
ترک کرنا جامۂ تن کا ہے یہاں ترکِ لباس ۔۔۔ روح کے قالب سے آزادی ہے آزادی مجھے
پا بہ گل جب فرقۂ آزاد پایا مثلِ سرو ۔۔۔ ہو گیا گالی سے بدتر نام آزادی مجھے
ہر نفس ہے سعیٔ تن کی پرورش کے واسطے ۔۔۔ آپ ہی کرنی پڑی ہے اپنی صیادی مجھے
جان دے کر دہر میں دیتا ہوں میں اسکو طلاق ۔۔۔ زالِ دنیا کی نہیں منظور دامادی مجھے
ہر نفس شمشیر ہے یہاں بہرِ قتلِ آرزو ۔۔۔ خاکساری نے دیا ہے حکمِ جلادی مجھے
قصرِ تن کی بے ثباتی کا غم آتش تا کجا ۔۔۔ خانہ بربادی حباب آسا ہے بنیادی مجھے

یاد بھولے سے تو وہ سرو قبا پوش کرے ۔۔۔ خاطرِ دوست کسی کو نہ فراموش کرے
کشتۂ عالمِ عریانیٔ خوباں ہوں فلک ۔۔۔ ہے سزاوار جو مجکو نہ کفن پوش کرے
صورتِ قطرۂ شبنم ہوں عزیزِ ہر دل ۔۔۔ کھینچے خورشید تو گل مجکو درِ گوش کرے
آرزو ہے جو لحد پر مری روشن ہو چراغ ۔۔۔ کسی محبوب کا دامن اُسے خاموش کرے
قتل کرتی ہے عبث مجکو حنائے کفِ یار ۔۔۔ بے گناہوں کا غضب ہے جو لہو جوش کرے
بارِ خاطر نہ کسی کے ہوں کبھی سوختہ دل ۔۔۔ شمعِ کشتہ کا جنازہ نہ گراں دوش کرے

یار سے تو نہ بغل گیر کیا گردوں نے | گور ہی سے مجھے جلاد و ہم آغوش کرے
آرزو ہے یہی آتش کہ خدا اے زاہد | مجکو غم نوش کرے مجکو قدح نوش کرے

یادِ ابروئے صنم رکھتی ہے بیتاب مجھے | نیشِ عقرب ہوئی ہے میری رگِ خواب مجھے

کشتہ ہیں مثلِ شمع ہم اپنے جلال کے | اقبال دن دکھاتا ہے ہم کو زوال کے

تنگ دامی نے نہ دم لینے کی دی فرصت مجھے | رہ گئی دیدِ رخِ صیاد کی حسرت مجھے
دستِ حاجت کو کیا تیغِ قناعت نے قلم | گنجِ قاروں سے خدا نے دی بڑی دولت مجھے
شفقتِ پیرِ دبستاں سے ہوا ابتر میں طفل | سات دن کی میلے میں دی سیر کی رخصت مجھے
تاکجا کنجِ قفس میں سر کو ٹپکوں میں اسیر | کھینچ لے موجِ نسیمِ گلشنِ جنت مجھے
جوہرِ ذاتی ہے سوزِ سینۂ شوریدگاں | مثلِ ماہی داغ بن آتش ہوئی زینت مجھے

منزلِ گور اب مجھے اے آسماں درکار ہے | مردمِ بیمار کو نقلِ مکاں درکار ہے
کچھ علاجِ وحشتِ عاشق نہیں جز خوابِ مرگ | بہرِ فیلِ مست زنجیرِ گراں درکار ہے
طالبِ زلفِ معنبر ہے دلِ سودا زدہ | جغد کو بالِ ہما کا آشیاں درکار ہے
ساحلِ مقصودِ عاشق ہے کنارا گور کا | تختۂ میت کو میری بادباں درکار ہے
دیکھئے کس کس نظارہ باز کا دل ڈوب جائے | یار کو پیراہنِ آبِ رواں درکار ہے
ہے ہوائے مرہم اپنے سینۂ پرداغ کو | پھولوں کو شاید سپر کی بھی خزاں درکار ہے
شاعرِ جاں باز ہے آتش خداوندا اسے | ذوالفقارِ حیدری جائے زباں درکار ہے

بندِ نقابِ عارضِ دلدار توڑئے ‏ ‏ یعنی ریاضِ حسن کی دیوار توڑئے

ویدنی عالمِ ایجاد میں تعمیر ہوں میں ‏ ‏ آئینہ خانۂ محبوب کی تصویر ہوں میں
چشمِ کم سے نہیں لازم ہے مرا نظارہ ‏ ‏ زنگِ آئینہ نہیں جوہرِ شمشیر ہوں میں
کوئی بے درد سمجھتا نہیں میرے دل کی ‏ ‏ مثلِ نے گرچہ سراپا لبِ تقریر ہوں میں
تا کجا سر کو جھکائے رہوں جلد آ قاتل! ‏ ‏ دیر سے منتظرِ نعرۂ تکبیر ہوں میں
نازِ معشوق اسے کہتے ہیں یوسف! کہ کبھی ‏ ‏ نہ زلیخا سے کہا خواب کی تعبیر ہوں میں
کیوں نہ لوٹیں مری آغوش میں یہ طفلِ سرشک ‏ ‏ آتشؔ ان کے لئے بازیچۂ تقدیر ہوں میں

اجل آ ورنہ اب یہ رشک مجکو قتل کرتا ہے ‏ ‏ عزیز اس پاؤں کو پھیلائی سوتی ہیں مزار و نمیں
کسے حسرت ہی دامِ دامنِ صحرا سے چھٹنے کی ‏ ‏ چمن کو بارہا دیکھا ہے جا جا کے بہار و نمیں
نہ دو آنسو بھی نکلے آنکھ سے یاد آہی میں ‏ ‏ اڑا کی خاک ہی میرے چمن کے آبشار و نمیں
دمِ آخر تو حسرت رکھ نہ رخسار و نکے بوسوں کی ‏ ‏ دلِ بیمار رہ جائے گا عیسیٰ ان انار و نمیں
امانت روح کی چھنوائی مجھ سے کس لئے تو نے ‏ ‏ الٰہی ایسا بھی تو میں نہ تھا بے اعتبار و نمیں

جلّاد کی نہ پہنچی تلوار تا بہ گردن ‏ ‏ آبِ ندامت آیا سو بار تا بہ گردن
کیا نیلوفر ہوں میں جو رکھتے ہیں مجکو ڈوبا ‏ ‏ گرداب میں یہ چشمِ خوں بار تا بہ گردن
کھینچ لے ہوائے صحرا ورنہ اٹھا چکی ہے ‏ ‏ لڑکوں کی سنگ ریزی دیوار تا بہ گردن
شمشیر کھینچنی بھی ناحق تجھے پڑے گی ‏ ‏ تصویر کر نہ میری تیار تا بہ گردن
تھی گو بلند یا رب! دیوارِ خانۂ یار ‏ ‏ روزن بھی کاش ہوتے دو چار تا بہ گردن
نخچیر بھی ہوا میں کم بخت لے کے پہنچی ‏ ‏ فتراک کی نہ ڈوری زنہار تا بہ گردن

جلتی ہے دیکھ بلبل کیوں میرا جسم پرداغ — پھولوں کا ہے یہ شاید انبار تا بہ گردن
اے محتسب سمجھ کر میخانے میں قدم رکھ — رستم کی آتی ہے یہاں دستار تا بہ گردن
اے کاش دود ماں سی میں شمع کے ہی ہوتا — گلگیر بن کے آتی تلوار تا بہ گردن
پھانسی گلے میں اپنی کیونکر نہ دوں صنم کی — پیدا کرے رسائی زنار تا بہ گردن

دو قدم غربت سے گر سوئے وطن جاتا ہوں میں — سایہ کہتا ہے مرا زنجیر بن جاتا ہوں میں
اے تپ غم فرصت اک دم دے وگرنہ جسم کو — کر کے وقفِ پنجۂ زاغ و زغن جاتا ہوں میں
چھوڑتا ہے کیوں جنوں نومید ہو کر میرا ساتھ — قبر میں لے کر گریبانِ کفن جاتا ہوں میں
نالۂ بلبل فزوں ہے تیرے میرے لئے — مول لینے دردِ دل سوئے چمن جاتا ہوں میں

آہی

الٰہی بخش آہی تخلص جوانِ صلاحیت شعار است بہ پیشۂ سر تراشی و فصادی بکمال امتیاز بسر می برد و شعر بسیار شستہ و سادہ و عاشقانہ و عارفانہ میگوید و نیز کلامِ خود را ہمراہ شیخ پیر بخش سرور بقلمِ اصلاحِ فقیر در آوردہ، در طبعش رسائی کمال معلوم میشود، اغلب اینہم درچندی گو از معاصرین خود خواہد برد و شعر نشتر بدل زنش خوں از دیدہ ہا خواہد ریخت و معاشش مفتی گنج و عمرش سی سالہ خواہد بود۔ از وست:

یارب! خمارِ بادۂ الفت عیاں نہ ہو — یا مے کشی کا مجھ پہ کسی کو گماں نہ ہو
مشتاق ہوں میں تشنہ جگر کس کے آب کا — یارب کسی گلے پہ وہ خنجر رواں نہ ہو
ہم کو بہشت سے بھی فزوں تر ہے وہ مکاں — کھٹکا شبِ فراق کا ہرگز جہاں نہ ہو
دیر و حرم میں سر کو جھکا دے وہ بے نصیب — جس کے تئیں جہاں میں دلستاں نہ ہو

ہجر کی شب ہوئی نہ صبح شمع نمط جلا کیا
جانِ حزیں پہ سوزِ غم تو نے ستم یہ کیا کیا

خواب میں بھی نہ آئے جو عاشقِ دلفگار کے
چرخِ ستم شعار نے ایسے پہ مبتلا کیا

چمن میں گل پہ کب وہ بلبلِ ناشاد نے دیکھا
جو عالم یار پر مجھ خانماں برباد نے دیکھا

نظر آیا تھا کوہِ طور پر جلوہ جو موسیٰ کو
رخِ شیریں کے پردے میں وہی فرہاد نے دیکھا

ترے انداز پر گر کوئی صورت کھنچ گئی اُس سے
تو حسرت کی نگاہوں سے اُسے بہزاد نے دیکھا

الٰہی اور ہی عالم ہوا اس کی طبیعت کا
نگاہِ لطف سے جس کی طرف استاد نے دیکھا

رکھتا ہے قصد واں دلِ مضطر قیام کا
ملتا نہیں کسی کو پتہ جس مقام کا

کس کی گلی میں ہوں نظر آتا ہے جو مجھے
عالم بہارِ گلشنِ دار السلام کا

اسرارِ عشق جس پہ کھلا، رہ گیا خموش
یعنی زباں کو یاں نہیں یارا کلام کا

کھینچی تلوار کبھی اور کبھی خنجر کھینچا
ظلم سے ہاتھ ستم گر نے نہ دم بھر کھینچا

نخلِ امید نے عاشق کے جہاں سر کھینچا
ارّہ تیغِ ستم چرخ نے اُس پر کھینچا

جس مصور نے لکھے عاشق و معشوق بہم
بے کمر اس کو بنایا مجھے بے سر کھینچا

مہرِ رخسار پہ گر اُس کے نہ تھی زلفِ دراز
اس قدر طول شبِ ہجر نے کیونکر کھینچا

مٹایا عشق نے جب صفحۂ ہستی سے نام اپنا
دو عالم سے پرے ہم کو نظر آیا مقام اپنا

زیادہ ہووے ہے ہر دم دلِ مضطر کی بیتابی
ہوا جاوے ہے نقشہ اور ہی کچھ صبح شام اپنا

رہی پامالِ رفتارِ قیامت قامتاں لیکن
نہ سمجھا ہائے ہم کو کوئی شوخِ خوش خرام اپنا

نہیں غم منزلِ مقصد کا یہاں فضلِ الٰہی سے
وصیِ مصطفےٰ ہے ساقیِ کوثر امام اپنا

منہ کو پھرایا، روٹھ کے بیٹھے، چاہت کا انکار کیا
چھیڑ کے شب، گلرو کو میں نے اپنے گلے کا ہار کیا
دامن کو گلزار بنایا، آنکھوں سے برسا کے لہو
غم نے ہماری سیر کی خاطر روز چمن تیار کیا

جانا تھا کسی شمع کا پروانہ بنے گا
ہم دل کو نہ سمجھے تھے کہ دیوانہ بنے گا

کیوں نہ تڑپوں میں بھلا مرغِ گرفتار کی طرح
نیشِ غم کھٹکے ہے پہلو میں مرے خار کی طرح
باغ میں جھومے ہے ہر سرو لبِ جو یہ کھڑا
اُس نے دیکھی ہے نشے میں کسی میخار کی طرح
خاموشی ہی مری تاثیر کرے گی اُس کو
وہ لگاوٹ نہیں آتی مجھے اغیار کی طرح

احمد

منشی محمد احمد احمدؔ تخلص خلفِ منشی اسحاق خاں متوطن لاہور قوم شیخ صدیقی۔ بزرگش ازسی سال در لکھنؤ توطن گزیدہ و بہ رفاقتِ انگریزیہ منشی گری بسر بردہ اند خودش نیز تولد ونشو و نما درہمیں جا یافتہ کورسوادی درہمیں شہر بہم رسیدہ جوانِ ظریف الطبع و شوریدہ مزاجست، پیش ازیں اصلاحِ ریختہ از قلندر بخش جرأت چندیں میگرفت(۱)، بعد فوتِ او بہ فقیر رجوع آوردہ جستہ جستہ آنچہ می گوید گاہے می نماید و گاہے نہ، در طبعش البتہ روانی کمال است۔ شنیدہ ام کہ خود ہم دو سہ شاگرد بہم رسانیدہ و عمرش تخمیناً بست(۲) و پنج سالہ خواہد بود۔ ازوست:۔

کیا میں بیخودی سے نامے کو تسطیرِ بے معنی
نہ وہ یا رب! جواب اُسکا کرے تحریرِ بے معنی
بہم ہونا جہاں میں صورت و معنی کا لازم ہے
جو دیکھو غور سے ہے صورتِ تصویرِ بے معنی

---

(۱) چندے گرفتہ ن (۲) سی سالہ۔ ن

خمِ زلفِ بتاں نے کر دیئے معنی ثبوت اُس کے — وگرنہ تھی سراسر حلقۂ زنجیر بے معنی
کبھی اقرارِ وصل اور گاہ انکار ہم آغوشی — سراسر مجھ سے ہے ظالم تری تقریر بے معنی
جوابِ نامہ آیا پر ذرا کھلتا نہیں مطلب — ہوا ثابت کہ ہے اپنا خطِ تقدیر بے معنی
گنہ کثرت سے تھے میرے نہ مضموں ان سے بن آیا — کراماً کاتبیں کی ہو گئی تحریر بے معنی
نظر کی جب سوادِ ابروئے قاتل پہ اے احمد — نظر آئی حروفِ جوہرِ شمشیر بے معنی

خیالِ مہرِ تاباں گر ہے اُسکے روئے روشن پر — تو پھر خطِ شعاعی کا گماں پڑتا ہے چلمن پر
سمجھ کر قاتلِ عالم محبت اُس سے کی ہم نے — وبالِ خونِ ناحق ہو ہمارا اپنی گردن پر
ہوئے ہیں اس قدر ہم محوِ الفت اُسکی الفت میں — کہ ہم کو دوستی کا ہے یقیں ہر ایک دشمن پر
میں وہ بیکس ہوں جس کی گور پر غربت برستی ہو — کوئی جز بیکسی روتا نہیں ہو میرے مدفن پر
فتیلہ ہے مژہ اور لختِ دل ہو روکشِ شعلہ — شبِ فرقت میں آنسو کو شرف ہو اپنے روغن پر

اندوہ

سید علی حسین خاں اندوہ تخلص خلفِ نواب شمس الدولہ ابن بارگاہ قلی خاں کہ سیادت خاندانِ ایشاں بسیار سندیست وجوہرِ شجاعت نیز بہ سندہائے معتبرہ بہ محکِ امتحاں رسیدہ۔ جوانیست قابلِ مثلِ پدرِ بزرگوارِ خود رجوع بہ ایں عاصی بسیار دارد و اعتقادش ہرگز ہرگز بہ طرفِ دیگر منحرف نمی شود بقولے کہ پیرِ من خس است و اعتقادِ من بس است کلامش رفتہ رفتہ بجائے خواہد رسید آنچہ گفتہ از نزدیک و دور بہ قلمِ اصلاحِ فقیر در آوردہ عمرش بست و ہفت سالہ خواہد بود۔ از وست :۔

ہے بوستانِ حسن میں وہ گلبدن ہنوز — چپکے ہے تن جو اُس کا تہ پیرہن ہنوز
انکارِ قتل سے ترے ہوتا ہے کیا میاں — لو ہو سے تر ہی دیکھ لے میرا کفن ہنوز

تیرِ ستم جو مارے ہیں اُس ترکِ ناز نے غربال ہو رہا ہے ہمارا کفن ہنوز

مسیح کی نہیں جرأت کہ وہ دوا دیوے خدا ہی اب ترے بیمار کو شفا دیوے
رقیب نے جو مرے دوست کو کیا دشمن خدا ہی اُس کے کئے کی اُسے سزا دیوے

مت چلو لے کے سوئے باغ مجھے دیکھنے دو جگر کے داغ مجھے
حیف اندوہ دردِ ہجراں سے نہ ملا ایک دم فراغ مجھے

بیمار مجھے سن کے عیادت کو سب آئے پر آپ نہ یوں آئے نہ وقت طلب آئے

کس سے دنیا میں رکھوں چشمِ مددگاریٔ دل جز غمِ دوست کسی نے بھی نہ کی یاریٔ دل
اے غمِ یار! خدا تجکو سلامت رکھے یاد ہے تیرے تئیں شیوۂ غم خواریٔ دل
دانۂ خال نہ دکھلا ہمیں کافی ہے فقط دامِ گیسو ہے ترا بہرِ گرفتاریٔ دل
سرِ دشمن کو میں اندوہ ملوں مثلِ مگس اسد اللہ اسد کو بہ مددگاریٔ دل

اظہار

محمد وارث اظہار تخلص برادرِ خوردِ میاں صابر تخمیم جوانِ تہذیب الاخلاق شاگردیٔ میاں پیر بخش مسرور کردہ نظمِ سخن را آموختہ، بعد مشورۂ ایشاں برائے پختگیٔ کامل غزلِ خود را بہ ایں عاصی ہم می نماید۔ عمرش تخمیناً سی سالہ خواہد بود۔ از وست :۔

قبضے پہ ہاتھ رکھ کے جو وہ بانکپن کرے دعوائے تیغ پھر نہ کوئی تیغ زن کرے
گھبرا کے یاد کرتا ہوں اس کو کا بیٹھنا جیسے سفر میں کوئی خیالِ وطن کرے

گر وصل بھی ہوا تو رہا دم بدم یہ ڈر — اب شعبدہ کوئی نہ یہ چرخِ کہن کرے
اس آرزو میں ہم تو موئے تھے کہ اپنی خاک — شاید کہ خاکِ تودہ وہ ناوک فگن کرے
کوچے سے جس نے پھینک دیا لاش کو مری — کیا لطف ہے جو پھر وہی فکرِ کفن کرے
اظہار! ہو یقیں مجھے کیا اُس کی بات کا — جب جھوٹے وعدے روز وہ پیماں شکن کرے

اک دم میں خاک کرکے جلا کر دہ چرخ کو — آہِ حزیں کا اپنے اگر امتحاں کروں
تجھ بن شبِ فراق صنم یہ نہ ہو سکا — ہر چند دل نے چاہا کہ ضبطِ فغاں کروں

قرآن پہ رکھ دی ہے یہ تسبیح کسی نے — عارض پہ ترے زلف گرہ گیر نہیں ہے

لحن داؤدی ہے شاید کہ یہ نالہ میرا! — رشک کھاتی ہے جو یوں بلبل نالاں مجھ پر
ہوں وہ بیکس میں اسیروں میں ترے ای ظالم — رحم کرتے ہیں سبھی قیدیٔ زنداں مجھ پر

فصلِ گل ہے تو اُسے پھولوں سے بھر دے گلچیں — جمع بلبل کے قفس میں خس و خاشاک نہ کر

تم آبرو مری رکھیو دیدۂ گریاں — مقابلہ مجھے کرنا ہے ابرِ تر سے آج

عہدِ طفلی میں جو مکتب میں بٹھایا ہم کو — آ، جنوں نے سبقِ عشق پڑھایا ہم کو

کہتا ہوں کیا یہ بات میں اے قصہ خواں غلط — جز داستانِ عشق ہے سب داستاں غلط

چاہت کا مزا آکے کوئی مجھ سے تو پوچھے　　یہ خلق عبث آن کے سمجھاتی ہے مجھ کو

ایسے موسم میں کہ ہر شاخ ہی پھولوں سے لدی　　آستیں میں ہے مرا دستِ قدح گیر عبث

بن بولے اُس سے چین نہیں مجکو دوستو　　وہ چپ رہے کہ جس کے دہن میں زباں نہ ہو
اپنی تو یہ خوشی ہے کہ اظہارِ خلق میں　　وہ کام کیجئے جو کسی پر گراں نہ ہو

بڑھتی ہی چلی جائے ہے گھٹتی نہیں اک پل　　میری شبِ ہجراں کو خدا جانے ہوا کیا
کہتے ہیں مجھے دیکھ کے سب بزمِ بتاں میں　　اس مردِ مسلماں کو خدا جانے ہوا کیا

کس طرح دل کو خیالِ رُخِ جاناں بھول جائے　　یہ تو وہ حافظ نہیں جو پڑھ کے قرآں بھول جائے
پوچھتا ہوں یوں میں رہرو کوچۂ جاناں کی راہ　　راستہ گھر کا کوئی جو طفلِ ناداں بھول جائے
آبِ خنجر کے مزے سے تو اگر آگاہ ہو　　ہے یقیں اے خضر تجکو آبِ حیواں بھول جائے

مجھ تک کبھی اُس گل کی نہ لے کر خبر آئی　　گلشن سے تو سو بار نسیمِ سحر آئی
زنار پہن بت کو کیا دیر میں سجدہ　　کعبے میں مری جب کہ نہ امید بر آئی

رویا میں پہروں زانو پہ سر رکھ کے دوستو　　غربت میں آیا جب کہ خیالِ وطن مجھے

دریائے اشک اپنا اگر ہوئے موج زن　　مثلِ حباب چرخ بھی اس میں بہا پھرے

نہ آبِ تیغ سے محروم رکھ مجھے قاتل
پلانا پیاسے کو پانی ثواب ہوتا ہے

شکوہ بے فائدہ تو اُس کا دِلا کرتا ہے
کہیں معشوق بھی عاشق سے وفا کرتا ہے

شامِ ہجراں تیرہ بختی نے جو دکھلائی مجھے
یاالٰہی وصل کی شب کیوں نہ موت آئی مجھے

اُن لوگوں کی تقدیر پہ رشک آئے ہے مجکو
جن کو کبھی اندیشۂ ہجراں نہیں ہوتا

بیٹھا ہے چپ تو کیا لبِ خاموش کھولدے
تا غش سے آنکھ عاشقِ بے ہوش کھولدے

دیکھے جو آئینے میں کبھی اپنے عکس کو
خود بے قرار ہو کے وہ آغوش کھولدے

احسان

میرزا مدد[۱] عرف علی نواز احسانؔ تخلص یکے از رفقائے با وقارِ نواب امیر خاں انجامؔ بودہ بانور بائی ہمسری داشت ایں شہرت دارد بمقتضائے موزونیٔ طبع چیزے موزوں ہم میکرد و احسانؔ تخلص می نمود غزلے از بیاضِ خلفِ او کہ مرزا سیفو نام دارد بہم رسیدہ اینست :-

شبِ مہتاب خوش باشد لبِ جانانہ بوسیدن
دو بالا لذتے دارد شکر با شیر نوشیدن

زخوانِ خرچ گر نانے بدست آرد تنگ ظرفی
بیک دم جاں دہد چوں از شادی بخندیدن

علاجِ سوزِ دل جز اشکباری ہا نمی باشد
مگر با در زمینِ خشک باشد آب پاشیدن

نگیں ساں سینہ اش از دستِ این نامِ رواں دارم
کہ چوں ناخن نہ باشد کارِ شاں غیر از خراشیدن

---

[۱] علی نواز عرف مرزا مدد

سحر با غنچۂ میگفت سنبل از پریشانی
ستم باشد بہ جمعیت زباں را چشم پوشیدن

مدور خط رُخ سیمینِ جاناں در نظر دارم
کہ واجب در محرم مردماں را ہست زیدن

و لے خوش مغتنم در کاروانِ زندگی باشد
چہ لازم چوں جرس احساں ز غم پیوستہ نالیدن

آذر

میرزا لطف علی بیگ آذر موئفِ تذکرۂ ضخیم الجلد آتش کدہ کہ غالب احوال ایشاں در تذکرۂ فارسی نوشتہ باشم دریں روز غزلے از مرزائے مذبور ہم رسید چوں عاشق کلام اہل ولایتم دو شعرِ آذر انتخاب کردہ ہم نوشتم، ایں است :-

مرا بجرمِ وفا آخر از جفا کشتی
جفا نگر کہ چہ دیدی زمن چرا کشتی

بآں گناہ کہ بیگانہ در کسے نہ کشد
تو بیوفا ہمہ یارانِ آشنا کشتی

ارشد

حکیم شفائی خاں ارشد تخلص کہ بزرگانش اہل خطہ بودہ اند و عمل طبابت پیشاز خاندانِ ایشاں فروغے بکمال دارد خود ہم دریں فن از معاصرین خود گوئی سبقت می بُرد و در نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر نسبت دیگر ممتاز۔ گاہ گاہے بقتضائے موزونیٔ طبع اشہبِ خیال را در میدانِ شعرِ فارسی جولاں میدہد، دیوانے مختصر دارد و در سال یک ہزار دو صد و سی رحلتِ اوست + بہ ایمائے نواب کلب علی خاں بہادر تاریخِ رحلتش ایں چنیں از خامۂ فکرِ عاصی بر صفحۂ کاغذ ریختہ :-

اجل آئی جو یک بار شفائی خاں کو
علم میں تھا جو حکیمانِ جہاں پر فائق

میں نے دیکھا نہ زمانے میں کبھی کوئی حکیم
شعر کا شیفتہ اور نظمِ غزل کا شائق

یہ شفائی کہ رکھا جس نے تخلص ارشد
اُس شفائی سے نہ تھا کم بھی جو گذرا سابق

حکم سے کلب علی خان بہادر کے لکھی | اُس کے مرنے کی میں تاریخ بوضعِ لائق
سو وہ اے مصحفی یہ مصرعہ ہی بے کم وبیش | حیف صد حیف موا آہ حکیمِ حاذق

از دست :-

چو خواندم نالہ اش بے اختیار از دیدہ آب آمد | جوابِ نامۂ من آمد و لیکن جواب آمد

مردم امشب در انتظارِ کسے | آہ نامد کسے بکارِ کسے
مرد ارشد ز حسرت و نشنید | سخن از لعلِ آبدارِ کسے

در سینۂ من جز غمِ دلخواہ نماندہ است | او می طلبد دل بجگر آہ نماندہ است
ارشد چہ فتادی تو بدنبالِ نکویاں | آں قوت و آں طاقتِ آں راہ نماندہ است
چیں بر جبیں رسیدہ و دامن کشیدہ رفت | صبحِ امید از درِ د باہم دمیدہ است

ز دور دید مرا و برخ نقاب گرفت | حذر کنید کہ امروز آفتاب گرفت

در قتلِ منِ بیدل، تدبیر نمی باید | خود کشتۂ الفت را شمشیر نمی باید

از کوے او بسوئے چمن گر صبا رود | دیگر بسوئے گل دلِ بلبل کجا رود
بر دیگراں ترحم و لطف و نوازش است | بر من اگر رود ہمہ جور و جفا رود
گفتی بروز کوے من انصاف خود بدہ | کیں پا شکستہ از درِ دولت کجا رود

بکامِ دیگراں ہر شام گردوں تا سحر گردد | مرا بالیں زیرِ آب دیدہ تر گردد

گرفته آئینہ در دستِ بقرارِ خود است | بہ کس نمی گردد والہ بہارِ خود است
نگاہ بر رخِ او کردم و ز خود رفتم | ز خویش رفتہ دلِ من و در انتظارِ خود است
مکن ز جرمِ ملامت محبت ارشدرا | تو دیدہ کہ دلِ کس در اختیارِ خود است

بآں زلفِ سیہ تشبیہ دارد دودِ آہِ من | بصد خورشید پہلو می زند روزِ سیاہِ من

چوں من خدا کند کہ گرفتارِ خود شوی | آئینہ دیدہ واقفِ اسرارِ خود شوی

بامن اگر یار سرے داشتی | از دلِ من خبرے داشتی
نالۂ جاں سوزِ مرا می شنید | چشمِ ترم گر اثرے داشتی

بہ نازِ طبیب احتیاجے نماندہ | کنوں دردِ ما را علاجے نماندہ
بہ کشتِ امید او فتادہ است برقے | دگر فکرِ باج و خراجے نماندہ

اختر

شیخ رمضان علی اختر تخلص، ساکنۂ رام پور، جوانِ موزون الطبع و خوش فکر است سرے بتدوینِ دیوان ندارد و ہم شعرِ خود را بہ کسے نہ نمودہ۔ عمرش تخمیناً سی سالہ خواہد بود

از وست :-

کیا کہیں کہ جوابِ خط اس نے نہیں لکھا نہیں | اپنا لکھا ہے نامہ بر اس میں تری خطا نہیں
کھنچے ہے اپنے بر میں تنگ اُس تنِ نازنیں کو ہائے | دشمنِ جان ہے مری دوستو یہ قبا نہیں
اخترِ بخت ان دنوں ہم سے نہیں ہے سازگار | دیکھئے شب وہ ماہ رو آوے ادھر کو یا نہیں

جس کی رہتی تھی جستجو مجکو — اب نہیں اُس کی آرزو مجکو
جو کہ بولا قسم وجہ اللہ — نظر آتا ہے چار سو مجکو
تپ دوری سے پھک رہا ہوں ہائے — اے طبیب! اس گھڑی نہ چھو مجکو

افسر

نواب احمد یار خاں خلف الرشید نواب محمد یار خاں مرحوم کہ احوالِ ایشاں در تذکرۂ اول مسطور است افسر تخلص می فرمایند. بالفعل یک شعر از ایشاں بہم رسیدہ

قدم حضرت کا ہے اب سر پہ افسر — نہیں کچھ غم مجھے رہتا ہوں مسرور

الطاف

کلب حسین خاں الطاف تخلص ولد حسین علی خاں ابن نواب ناصر خاں برادر خوردِ نوازش حسین خاں نوازش گاہ گاہے بتقضائے موزونی طبع فکر شعر ہندی میکند و از نظرِ برادرِ بزرگِ خود می گذارند. عمرش قریب[1] بست سال است۔ ازوست:

مٹی کو مری چکر کیا چاک دکھاتا ہے — سو پیچ بیک گردش افلاک دکھاتا ہے
ہیں غیرتِ آئینہ جو صورتیں دنیا میں — اُن کو بھی تو یہ گردوں کر خاک دکھاتا ہے
کل یہ الطاف سے بولا بصد الطاف وہ شوخ — بعد مدت نظر آیا تو کدھر رہتا ہے

کہا چوڑی قلم رکھو گے پٹی کھنڈانے کو — بگڑ بیٹھے کہا اُن سے جو میں نے خط بنانے کو
کسی کو جام جمشیدی کسی کو حشمتِ دنیا — عدم سے زیست لائی تھی ہمیں ایذا دکھانے کو

---

(۱) تخمیناً (ن)

کہا چشموں کو تر کر میری تربت پر تو یہ بولا — جلا دو شمع اس کی گور پر آنسو بہانے کو

اخگر

میرزا محمد مہدی اخگر تخلص ۔ بزرگانش از قزلباغ بوده اند ، قوم . . . . . او در لکھنؤ تولد و تربیت یافتہ ۔ جوانِ مہذب الاخلاق تحصیلِ فارسی و دیگر کتبِ متداولہ بقدرِ حال دارد ۔ بحکم موزونیٔ طبع سرے شعر پیدا کردہ رجوع و مشورہ بفقیر آوردہ جوانِ قابل است ۔ البتہ بجائے(۱) خواہد رسید عمرش تا امروز تخمیناً بست و سہ سال خواہد بود ۔ ازوست :

جذبۂ شوق جو خضرِ رہِ صحرا ہووے — کیوں نہ سرگشتہ ترا بادیہ پیما ہووے
نہیں اُس شوخ کو ہم کہتے قیامت قامت — جس کی رفتار سے اک فتنہ نہ برپا ہووے
شعلۂ رخ پہ ترے دستِ تصور جو رکھوں — کیا عجب اُس سے نمایاں یدِ بیضا ہووے
آستیں کو جو نچوڑوں شبِ فرقت میں کبھی — کوچۂ شہر ہر اک دامنِ دریا ہووے
اُس شکر لب کا میں ہوں کشتۂ دیدار اخگر — تلخیٔ مرگ بھی مجھے کیونکہ گوارا ہووے

جذبۂ شوق نے وحشت کا جو بن دکھلایا — خارِ مژگاں نے مرے رنگِ چمن دکھلایا
ایسے ہم شامِ غریبی میں گرفتار ہوئے — جس نے ہرگز نہ رخِ صبحِ وطن دکھلایا
ایسے محبوب کو کیونکر کوئی عریاں دیکھے — جس نے محرم کو بھی اپنا نہ بدن دکھلایا
اخگر از بسکہ مرے جسم پہ تھی کثرتِ داغ — گور میں میں نے فرشتوں کو چمن دکھلایا

ڈر کے اُٹھ آتے نہ کیوں اُس سروِ قد کے پاس سے — نت گلِ حرماں چنا کرتے تھے نخلِ یاس سے

---

(۱) بجائے خود (ن)

جانِ و دل ہوش و خرد و تاب و تواں صبر و قرار
ہوتے ہیں رخصت طلب کون جو اُس کے پاس ہے

تیغِ جورِ آسماں ہے لازمِ گردن کشاں
کونسا خوشہ بچا ہے یہاں جھلائے راس ہے

عافیت نیکوں کی صحبت نے مجھے رکھا بچا
ورنہ اٹھ جاتا میں جوں حرفِ غلط قرطاس سے

مصحفیؔ کے طرز پر اخگرؔ غزل کہتا ہوں میں
کام کچھ ہرگز نہیں مجکو عوام الناس سے

گلبرگِ تر کو رنگ سے ہو جس کے انفعال
ہے ان دنوں میں وہ گلِ داغِ کہن کا رنگ

جوشِ شگوفہ تھا کہ ہوئی تن سے جاں رواں
اے وائے ہم نہ دیکھنے پائے چمن کا رنگ

پہنچی تھی جب خبر اُسے شیریں کے مرگ کی
اُس وقت دیکھنا تھا رُخِ کوہکن کا رنگ

ہم اُس دیار کے ہیں مسافر کہ ہے جہاں
غربت کی شام میں رخِ صبحِ وطن کا رنگ

نہ پوچھو وصفِ حسن اُس میرزا کا
وہاں ہے مرتبہ صلِ علیٰ کا

کروں کیونکر نہ اُس بت کی پرستش
کہ ہے وہ پرتو انوارِ خدا کا

نہ رہتا دست بردل اس طرح میں
جو پاتا ایک بوسہ اُس کے پا کا

مرے سر پر رہے وہ سایۂ زلف
کہ اُس کو حکم ہے ظلِ ہما کا

تمہارے ہاتھ سے دامن درازو
اٹھانا ہاتھ مشکل ہے دعا کا

جو نالہ اُس کی یادِ قد میں کھینچا
وہ ہمسر ہو گیا عرشِ علیٰ کا

میں کہتا تھا مسیحا کیا کرے گا
عبث ہے قصد اُسے میری دوا کا

کوئی ہوتے ہیں چنگے ایسے بیمار
گذارا ہی نہیں یہاں تک شفا کا

زبس نازک ہے اخگرؔ شیشۂ دل
مجھے خطرہ ہی رہتا ہے صبا کا

غمِ دل نے یہ ستایا ہے کہ جی جانے ہے
اتنا دم ناک میں لایا ہے کہ جی جانے ہے

کوسوں ملے داغِ غمِ عشق تجھے کس منہ سے || تو نے سینہ یہ جلایا ہے کہ جی جانے ہے
تیغ ابرو کی تری جنبشِ بے ساختہ نے || زخم وہ دل پہ لگایا ہے کہ جی جانے ہے
اُس کی خلخال کی رفتار نے وقتِ رفتار || فتنہ ایسا ہی جگایا ہے کہ جی جانے ہے
غیر کو جنبشِ مژگاں نے تری میرے حضور || اُس تلطف سے بلایا ہے کہ جی جانے ہے

آفتابِ حشر نے خوب انتقام اُس کا لیا || ایک دن بیٹھے تھے تیرے سایۂ دیوار میں

لطف کیا لطف بن اُٹھے۔ ہم کو || خوگرِ لذتِ جفا ہیں ہم

ایک پل اُس دیدۂ پر آب میں آئی نہ نیند || خواب رہتا تھا ہمیشہ چشمِ ساغر سے جدا

گر نہیں تارِ نفس کا ٹوٹ جانا عنقریب || قامتِ خم گشتہ میں نقشہ ہے کیوں مضراب کا

دیکھ لوں اکبار پھر اُس شوخ بے پروا کو میں || مجکو اے پیکِ اجل دے اتنی فرصت اور بھی

دم غنیمت صحبتِ یاراں ہے اخگر عاقبت || واں چلے جائیں گے ہم اپنا جہاں کوئی نہیں

ہم بھی اک بیدست و پا سے ہیں ہوادارِ چمن || باغباں ہم کو سمجھ تو نقشِ دیوارِ چمن
گل کے چہرے پر نہیں رنگِ طرب جو ابکی سال || مر گئے شاید کہ اخگر نازبردارِ چمن

کیونکر نہ رکھے لاگ یہ ہر دم سے زیادہ || پیکانکی ترے نیش ہیں کژدم سے زیادہ

مستیِ چشم تری دیکھ کے مدہوش ہوں میں
لبِ خاموش کی تعریف میں خاموش ہوں میں

توسنِ فکر سے اخگر مری نت چرخ نژند
دیکھے کہتا ہے ترا غاشیہ بردوش ہوں میں

آرزو

سراج الدین علی خاں آرزو تخلص با وصفِ فضل و کمالے کہ داشت در زمانۂ ابتدائے شعراے ایہام گو با وصفِ فارسی دانی و فارسی گوئی و استادی رغبت بہ نظمِ ریختہ کردہ و کلامِ ریختہ گویاں را نیز عزیز داشتہ اما چوں دورِ ایہام بود معنیٔ شورش نیز بطور ایہام است۔ دو شعر ازو بہم رسیدہ بطریق ندرت نوشتہ شد اینست:۔

رکھے سیپارۂ گل آج آگے عندلیبوں کے
چمن کے بیچ گویا پھول ہیں تیری شہیدوں کے

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج دل کے اپنے پھپولے پھوڑے

امید

قزلباش خاں امید تخلص شخصے ولایتی، شاعرِ فارسی گوست دیوانے ضخیم دارد اما چوں دراں ایام زبانِ ریختہ ہم فارسی گویاں را شیریں می نمود ایشاں ہم میل بگفتنِ آں با وصفِ کمالِ فارسی میکردند، ازوست:۔

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
در و دیوار سے اب صحبت ہے

تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں
الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں

آشنا

میرزین العابدین آشنا تخلص از ہماں دورہ است، از وست :-

گر مجھ سے دِوانے کو تم آزاد کروگے   دیرانے میاں! کتنے ہی آباد کروگے

امین

خواجہ امین الدین خاں امین تخلص شعرے از اشعار او پسندیدۂ فقیر آمدہ، اینست:-

صاف اور دُرد کی تکرار سے کیا کام امین   جو مجھے دیتا ہے ساقی سو ہی[۱] پی جاتا ہوں

اظہر

میر غلام علی اظہر تخلص شعرے از وبہم رسیدہ این ست :-

جب گھر سے وہ مستِ خواب نکلے   سو فتنے ہوں ہم رکاب نکلے

آگاہ

نور خاں آگاہ تخلص ملازمِ سرکارِ فلک مدار مرزا جہاندار شاہ بود در قصہ خوانی نظیرِ خود نہ داشت دگاہ گاہے بمقتضائے موزونی چیزے موزوں ہم میکرد وشعرے از وبہم رسیدہ، از وست :-

منہ دیکھو اپنا سیکھو ابھی رسم چاہ کی   باتیں بنا بنا کے نہ کیجے نباہ کی

اعلا

میر اعلا علی اعلا تخلص۔ سیدِ صحیح النسب است اکثرے خود را بمناقب گوئی مصروف

---

(۱) جو مجھے دیتا ہے ساقی سو وہیں پی جاتا ہوں (ن)

داشتہ چنانچہ مناقب ایشاں مناقب[1] خواناں میرن سبزواری بسیار یاد میدارند و میخوانند شعرے از وبہم رسیدہ این ست :-

توڑ بت زاہد نے کیوں مسجد یہ بت خانہ کیا　　تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

انتظار

نقی خاں انتظار تخلص ولدِ اکبر علی خاں کہ از ایشاں آگاہی ندارم مگر شعرے از بیاض نوشتہ شد۔ این ست :-

جوں ہیں بہارِ گل کی قفس تک خبر گئی　　سنتے ہی بلبل ایسی ہی تڑپی کہ مر گئی

اظہر

شیخ صابر علی اظہر تخلص از قدماست، ازوست :-

یہ خوش آتی نہیں ناصح تری تقریر مجھے　　اُس کے ملنے کی بتا دے کوئی تدبیر مجھے

جی نکلتا ہے مرا دیکھے بن اُس شوخ کے ہائے　　اس کی لا دیوے بلا سے کوئی تصویر مجھے

خود بخود پڑتی ہے پا میں مرے زنجیر اظہر　　یاد آتی ہے جو وہ زلفِ گرہ گیر مجھے

احمدی

شیخ احمد وارث احمدی تخلص نیز از قدماست۔ ازوست :-

کیا مگر اپنی ہی صورت کا ہوا ہے والہ　　خیر ہے آئینہ خانہ سے تو حیراں نکلا

کہتا ہوں اُسے جان تو کہتا ہے وہ قاتل　　چل جان تری کون ہے میں دشمنِ جاں ہوں

---

(۱) مناقب خواناں مناقبِ ادمی خوانند و مناقبِ میرن مشہور اند (ن)

مردم ترے جمال پہ جب چشم وا کریں　　آنکھیں اٹھا کے پنجۂ مژگاں دعا کریں

آرام و صبر و طاقت و ہوش و تواں چلے　　اے وائے بیکسی کہ مرے ہمرہاں چلے

آزاد

حافظ غلام محمد خاں آزادؔ تخلص ولد حافظ عبد الرسول متوطنِ وزیر آباد من مضافاتِ صوبۂ لاہور مولدش مذبور ست لیکن نشو و نما در شاہجہاں آباد یافتہ در عمر چہاردہ پانزدہ سالگی نواب فیروز جنگ غازی الدین خاں بہادر عزّ امتیاز پیدا کردہ بمقتضائے موزونیٔ طبع با وصفِ پرہیزگاری و اتقا کہ در کمال بودش گاہ گاہے فکرِ شعر ہم می کرد۔ وفاتش در سنہ یکہزار و دو صد و ہشت ہجری۔ مزارش در فرخ آباد است، از وست:۔

عشق با زاں طرفی گبر و مسلماں طرفی　　کفر و ایماں طرفی مذہبِ رنداں طرفی
داغ پروردۂ عشقیم بہ گلشن نہ رویم　　سینۂ ما طرفی روضۂ رضواں طرفی
حیرت آورد تماشائے جگر داریٔ دل　　او بہ تنہا طرفی واں صفِ مژگاں طرفی
کہ سبق می بردا مروز حریفاں بینم　　دیدۂ من طرفی ابرِ بہاراں طرفی
یار با ماست اگر آزادؔ چہ بیم از اغیار　　یادِ جاناں طرفی جملہ رقیباں طرفی

دوش دل وصفِ لبِ لعلِ تو انشا می کرد　　بے تکلف بہ سخن معجزِ عیسیٰ می کرد

دمے چو جاں بدلِ پاکِ ما بہ نشیں　　برائے ما منشیں از پئے خدا بہ نشیں
بصدقِ دعویٔ الفت زمن دلیل مخواہ　　تو ئی دلیلِ من اے عینِ مدعا بہ نشیں

بما اگر بہ نشینی مقامِ حیرت نیست — ولے ز صحبتِ بیگانگاں جدا بہ نشیں
تو در خرامی و ہر نیک و بد ہمی بیند — برائے دفعِ نظر خوانمت دُعا بہ نشیں
خوش آمدی تو کہ ما جاں برگ میدادیم — کنوں نثارِ تو سازیم مرحبا بہ نشیں
تو پاک سیرت داو پاکباز باکی نیست — بیا بہ پہلوئے آزاد بر ملا بہ نشیں

بیندار میلِ تو با صحبتِ اغیار چنیں — چوں نہ گرید ز الم دیدۂ خونبار چنیں
دل ز دستِ تو چناں جاں بسلامت نہ برد — چشم خونخوار چناں طرۂ طرار چنیں
اندک از دردِ دروں چوں بزباں آوردم — گفت دیدیم جگر سوختہ بسیار چنیں
اشک از یادِ رُخ او بہ صفائی باشد — کہ نہ باشد بصدف گوہرِ شہوار چنیں
گنج باقی طلبی گنج قناعت بگزیں — چہ فتادت کہ شدی از پئے زر زار چنیں

داند کہ جز تو طرزِ سخن گفتن ایں چنیں — گردِ ملال از دلِ ما رفتن ایں چنیں
لعلِ لبت بخندہ بجنبے کہ وا شود — گاہے ز غنچہ نا مدہ بہ شگفتن ایں چنیں
از غم تمام خوں شد و جاں داد و دم نزد — کارِ دلست رازِ تو بہ نہفتن ایں چنیں
ہر مصرعست ز عقدِ گہر می برد گرہ — آزاد کارِ تست سخن گفتن ایں چنیں

نیست ممکن کہ ز کویت دلِ ما بر خیزد — نہ نشست است بداں عزم کہ ناچار خیزد
بہرِ تعظیمِ خیالِ تو چو آید در دل — نالہ از دل بہ جہد تا بسما بر خیزد

از ہجوِ مے آں شہ خوباں گلہ دارد — ایں طرفہ کہ از مور سلیماں گلہ دارد
از شورشِ اشکم مکن اے دیدہ شکایت — دانا نبود آں کہ ز طفلاں گلہ دارد

اے شورِ جنوں برکشم از گوشۂ عزلت
عمریست زمن کوہ و بیاباں گلہ دارد
بیجا نہ بود شکوہ ام از جورِ رقیباں
ہر آدمی از شیوۂ شیطاں گلہ دارد
دلبستۂ گیسوئے نکویاں چو شد آزاد
بیجاست کہ از حالِ پریشاں گلہ دارد

باہر رخت ہر کہ سرے داشتہ باشد
البتہ چو من چشم ترے داشتہ باشد

عشق خواہی اگر اے دل جگرے پیدا کن
میہماں می طلبی ماحضرے پیدا کن
سنگ بگداختی اے نالہ ولیکن ایں جا
دلِ یار است ازیں بہ اثرے پیدا کن
می بری کل کند از سرکشیت ہمچوں سرو
سر فرود آر پئے خود ثمرے پیدا کن
گر اماں می طلبی از سخنِ بدگویاں
گوش کن گفتۂ من گوش کرے پیدا کن

امداد

نواب امداد علی خاں بہادر امداد تخلص خلفِ نواب قاسم علی خاں مرحوم ابنِ نواب فیض اللہ خاں مغفور رامپوری، جوانیست مجموعۂ قابلیت و اہلیت معدنِ سخاوت و شجاعت از ابتدائے شباب بمقتضائے موزونیٔ طبع سر بگفتن شعر فکرش رساست ازوست :-

ہے یہ مضمون مرے خطِ جبیں کی تہ میں
وصل سے جاؤگے محروم زمیں کی تہ میں
مت ہو مایوس جو کرتا ہو وہ ملنے سے نہیں
بوئے اقرار ہے امداد نہیں کی تہ میں

شاہد ہے وہی جس میں ذرا عشوہ گری ہو
عاشق کی نشانی ہے کہ آنکھوں میں تری ہو

اس قدر ہے جو بے قرار اے دل　　تجکو کس کا ہے انتظار اے دل

رونے پر جب آگئیں آنکھیں مری　　مینھ سا برسا گئیں آنکھیں مری

انیس

لالہ موہن لال انیسؔ تخلص کہ ذکرِ ایشاں در تذکرۂ فارسی در حرفِ الف گزشت قومِ کاتیھ متوطنِ لکھنو است، استفادۂ شعر از میرزا فاخر مکیں کردہ چوں دریں روزہا حسبِ اتفاق ملاقاتش بیشتر می شد اشعارِ چند کہ دیگر از زبانِ او ہم رسیدند دگر بار ہم دریں جریدہ رونقِ سواد یافتند، قدما را دوست میدارد و پیروی آنہا میکند می گوید کہ بخدمتِ شیخ ہم رسیدہ ام و نور العین واقف و میر شمس الدین فقیر را اکبر در لکھنو دیدہ ام و با ایشاں ہم طرح بودہ ام پیش ازیں بیتاب تخلص میکرد بقولش ایں تخلص عطا کردۂ شیخ است بعدِ ترتیبِ دیوان تذکرہ مسمی بہ انیس الاحباشعرِ تلامذۂ مرزا صاحب موصوف نگاشتۂ کلکِ تالیفِ اوست، عمرش بہ ہفتاد رسیدہ و مزۂ شعرش نہ گردیدہ من کلامہ :-

گر بادِ سحر بوے تر ایک سحر آرد　　در جانِ من و شدہ جان دگر آرد
پہلوے انیست نہ انیسی نہ جلیسی　　بیچارہ چساں ایں شبِ ہجراں بسر آرد

غنچہ دہنا سرو قدِ تازہ بہار را　　کن خندہ بخنداں دلِ چوں غنچہ مارا
گویند بدیں دیدہ خدا را نہ تواں دید　　دید آنکہ ترا دید بدیں دیدہ خدا را

عکسِ رویت شبِ مہتاب چو در آب افتاد　　تب و تابے عجبے در دلِ بیتاب افتاد
صبح برخاستہ اے ماہ نشستی لبِ بام　　لرزہ از بیم بخورشیدِ جہانتاب افتاد

دیدہ افگند چو بر نافِ تو اے بحرِ جمال | کشتیٔ صبرِ دلِ خستہ بہ گرداب افتاد
کردہ بیتابِ بتابِ دگرے جانِ مرا | تا بہائے کہ دراں طرہ بر تاب افتاد
شکریں لعلِ ترا دوش بخوابی دیدہ است | دیدہ ام زاں ہوس امشب بہ شکر خواب افتاد
دید تا جلوۂ سیمائی ساقینِ ترا | اضطرابی بدلِ سیم چو سیماب افتاد

توئی کہ ہر دو جہاں را بہ نیم ناز کشی | بعشوہ زندہ نمائی بغمزہ باز کشی
چو تیغ ناز کشی صد ہزار مومن را | چہ کافری توکہ درخواندنِ نماز کشی
مترس انیسؔ زکشتن چو عشقبازی تو | کہ ہست شیوۂ معشوق عشقباز کشی

تار گیسو چو ادیت سحر از باد افتاد | دلِ دیوانۂ من باز بفریاد افتاد
بارک اللہ چو بود عظمت و شانِ قدرِ است | بہر تعظیمِ تو شمشاد چو استاد افتاد
تا دمِ مرگ رہائی نہ بود از دامت | وائے صیدیکہ بدامِ چو تو صیاد افتاد

دوش دل در انتظارت گوش بر آواز ماند | چشم بر در تا سحر چوں حلقۂ در باز ماند
دید تا انداز و نازت را آں انداز و ناز | ناز از ناز خود و انداز از انداز ماند
پیشِ اعجازِ دمِ جاں بخشِ تو دم زد مسیح | دم فرو بست آں دم و اعجازش از اعجاز ماند
صبحِ خورشیدِ رخت چوں جلوہ کرد از روزنے | در ہوایش ذرہ ساں خورشید در پرواز ماند
رفت چوں جولاں کناں صید افگناں ناوک زناں | حسرتِ تیرے مرا زاں ترک تیر انداز ماند

انس

پسرِ میر اعلا علی کہ ذکرِ ایشاں بر صدر گذشت۔ آنس تخلص می کند جوانِ شائستہ

ومہذب الاخلاق است و در روز ہائیکہ فقیر بر روشِ مجلس مشاعرہ را انعقاد دادہ بود اکثر شریکِ غزلِ طرحی می شد، عمرش تخمیناً از سی سال متجاوز خواہد بود، از وست:-

ہو وے سبھی طرح سے جو ناچار کیا کرے
گر موت بھی نہ آئے تو بیمار کیا کرے

تاب و توان بھی نہ رہی جسم وجاں میں کچھ
آخر کو دیکھئے کہ یہ آزار کیا کرے

دم توڑے گر نہ کنجِ قفس میں تڑپ تڑپ
صیاد کہہ تو مرغ گرفتار کیا کرے

کیا جانیے کہ دیدۂ خونبار کیا کرے

جاتی نہیں کسی ہی طرح کجروئی چرخ
دیکھیں ہمارے حق میں یہ رفتار کیا کرے

جور وجفا و ظلم و ستم اٰتش ہر طرح
ہم پر نہ گر کرے وہ ستمگار کیا کرے

اثر

میرزا حسین علی خاں متخلص بہ اثر خلف الصدقِ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں بہادر مرحوم نایب وزیر الممالک ہندوستان یعنی نواب آصف الدولہ بہادر جنت آرام گاہ۔ جوانیست خوش تقریر و مہذب الاخلاق از ابتدائے عمر سر بصاحب کمالان این فن داشت و دو سہ بار بر مکانِ ایشاں مجلسِ مشاعرہ ہم زیور انعقاد یافتہ تا آخر جذب کاملِ شوقش بریں آورد کہ خود ہم چیزے موزوں کردن شروع نمود و آنرا از نظرِ شیخ امام بخش ناسخ کہ در معنی بندی تازہ علمِ استادی برافراشتہ اند و بہ فقیر ہم از تہِ دل دوستی دارند گذرانید و چوں دراں ایام اعتقادش بجنابِ ائمہ معصومین بیشتر بود و در شیعہ گری غلوے تمام داشت کلامِ شعرا از قسمِ منقبت پسندیدۂ خاطر بود لہذا بعد مشقِ شعرِ نعتیہ و بر گفتنِ مرثیہ و سلام سعادتِ ابدی پنداشتہ خود را مصروفِ ایں کار ساخت عمرش از چہل متجاوز خواہد بود۔ از وست:-

کشتۂ دیدار ہوں اک ماہِ عالم تاب کا
ہے کفن درکار مجکو چادرِ مہتاب کا

دل مرا اس کے ذقن میں آپ سے ڈوبا نہیں
کھینچنا اپنی طرف معمول ہی گرداب کا

گرد معشوقوں کے ہیں مر کر بھی ہم عاشق مزاج
جیب غبار اپنا اُڑا ہالہ بنا مہتاب کا

راہ تکتے ہیں جوابِ خط کی ہم آٹھوں پہر
خط ہمارا تھا پرِ پرواز گویا خواب کا

نزع کے دن سے کہیں ہجر کی شب بھاری ہی
نورِ مہتاب میں بھی گور کی اندھیاری ہی

نہ ہوئے مر کے بھی آزاد ترے قیدیٔ زلف
خاک کو موجِ ہوا دامِ گرفتاری ہی

جب لگی آنکھ ہوئی دولتِ دیدار نصیب
عالمِ خواب میں یہاں بخت کی بیداری ہی

ہوں میں وہ کشتۂ ہجر کہ میرے غم میں
دیدۂ جوہرِ شمشیر سے خوں جاری ہی

کاش ہوتے نہ جدا آدم و حوا باہم
یہ وہی رسم ہے جو آج تلک جاری ہی

ایک جا جلتے ہیں دونوں جو تری محفل میں
شمع و پروانہ میں اتنی ہی تو بس یاری ہی

اے آثر گور میں ہوتا ہی علی رضؓ کا دیدار
زیست بی موت مجھے اس لئے ہی پیاری ہی

نہ ہوگا کارگر میرے بدن پر وارِ دشمن کا
پڑا ہے گوشت دُئیں تن میں حلقہ میری جوشن کا

گلستانِ رخِ جاناں سی ایسی کی ہے گلچینی
کہ اپنا دامنِ نظارہ اک تختہ ہے گلشن کا

چھٹا زنجیر سے تو تیغِ قاتل کی طرف دوڑا
ہوں عاشق میں ہی مقناطیس کے مانند آہن کا

یہ دل سے جوش ہی خونِ تمنا کا پس از مردن
حبابِ بحرِ خوں گویا ہی گنبد اپنے مدفن کا

لگائے کس طرح جراح میرے زخم کو ٹانکے
تنِ لاغر مرا تارِ نگہ ہے چشمِ سوزن کا

بلند اپنی لحد سے ہی صدائے وائے محرومی
زمیں سی جو قدم لگتا نہیں قاتل کی توسن کا

کیا تیرے تغافل نے یہ نقشہ اے شکار افگن
ہر اک نخچیر کا ناٹا بن گیا صحرا کے دامن کا

---

(۱) (نوٹ صفحہ ۳۲) ہوں میں کشتہ دو ستو اس ماہ عالمتاب کا۔ (ن)

تیرے ہاتھوں سے زمانہ خاک و خوں میں مل گیا | عہد میں تیرے، عدم کو جو گیا بسمل گیا
جتنی کھینچی آہ، اُس نے کھلکھلا کر ہنس دیا | باد کے چلتے ہی گویا غنچۂ گل کھل گیا
کیا مبارک ہے مکاں خالی نہیں رہتا کبھی | داغ آ بیٹھا اگر پہلو سے میرے دل گیا
اس قدر میں گرد تھا اُس کی کہ بعد از قتل بھی | خون میرا اس طرف دوڑا جدھر قاتل گیا
سیرِ دریا میں جو تجھ بن آگیا رونا مجھے | کوسوں سیلِ اشک میں بہتا ہوا ساحل گیا
نارسائی کیا کہوں اپنی کہ راہِ عشق میں | وہ جرس ہوں جس کا نالہ بھی نہ تا منزل گیا

اعجاز

تخلصِ نواب اصغر علی خاں خلف الرشید نواب نجابت علی خاں بہادر دام اقبالہٗ ولد نواب جنت مکاں وزیرِ اعظمِ ہندوستان شجاع الدولہ مرحوم بہادر، مشورۂ سخن بہ شیخ امام بخش ناسخ دارد۔ از دست:-

دھڑکوں میں، شبِ وصل کا کچھ چین نہ پایا | پھرتی رہی آنکھوں میں سحر شام سے تا صبح
یاد آتی رہی رات جو مجھکو کمرِ یار | مرنے پہ رہا باندھے کمر شام سے تا صبح
پہنچی کبھی اپنی بھی نہ کانوں تلک آواز | نالے کروں اعجاز اگر شام سے تا صبح

جو شام تک بھی نہ آیا پیام دلبر کا | تو مر ہی جائیں گے ہم لے کے نام دلبر کا

نہ تھا ربطِ چمن مجھکو خزاں آئی جو گلشن پر | صبا نے خاک اڑائی خوب سی میرے ہی مدفن پر
چراغِ دل ہمارا بجھ گیا یوں داغِ حرماں سے | کسی نے رکھ دیا سرپوش جیسے شمعِ روشن پر
چمن میں گل جو بن کر خاک سے شعلے نکلتے ہیں | کبھی بجلی گری ہے یہاں کسی دہقاں کے خرمن پر
نہیں ڈستے جو مجھکو وصل کی شب کاکلِ پیچاں | فسونِ عشق تو نے پڑھ دیا اعجاز ناگن پر

اظہر

شیخ امین احمد ساکن رامپور از اولادِ مجددِ الفِ ثانیؒ، جوانیست موزوں طبع اظہر تخلص میکند و شعرِ خود را از نظرِ شیخ محمد بخش واجد تخلص کہ ذکرش در ردیفِ واؤ خواہد آمد می نماید۔ عمرش بست و سہ سالہ است۔ از وست:۔

بام پر وہ شکلِ مہ جس دم عیاں ہو جائیگا
جوں کتاں ہر ایک کا پھر امتحاں ہو جائیگا

تب نشاں پاویگا تو اُس بے نشاں کا جب ترا
صفحۂ ہستی سے گم نام و نشاں ہو جائیگا

شکل اُس آئینہ رو کی دیکھی ناصح نے اگر
محوِ حیرت پیکرِ آئینہ ساں ہو جائیگا

سوزشِ داغِ جگر یونہی رہی گر بعدِ مرگ
شمع ساں روشن میرا ہر استخواں ہو جائیگا

ٹک منہ تو دکھلاؤ صنم پھر ہم کہاں اور تم کہاں
اکدم کے ہیں مہماں ہم پھر ہم کہاں اور تم کہاں

اب پاس تو آدم مری ہوتے ہیں کوئی آن میں
ہم رہروِ ملکِ عدم پھر ہم کہاں اور تم کہاں

اکبار لگ جاؤ گلے اے جان آکر پیار سے
اتنا کرو ہم پر کرم پھر ہم کہاں اور تم کہاں

اس شب ہے اے جانِ جہاں اظہر تمہارا میہماں
ہے کوچ اپنا صبحدم پھر ہم کہاں اور تم کہاں

افصح

افصح تخلص شاگردِ طالب علی عیشی، جوانِ خوش وضع است، عمرش تخمیناً قریب سی خواہد بود۔ بندہ در مشاعرۂ صدر الدین صدر تخلص اورا اکثر دیدہ ام دیگر خبر نیست۔ از وست:۔

لبِ بام آکے دکھاتا ہے وہ جلوہ مجکو
اوجِ اقبال یہ ان روزوں مرا کوکب ہے

تجھ سے خالی ہے مرے یار نہ کعبہ نہ کنشت
جو کوئی جس کا طلبگار ہے تو مطلب ہے

اگلی سی مہر و وفا ہی نہیں تجھ میں اے شوخ   نہ وہ باتیں نہ وہ اشفاق و محبت اب ہی

اور جینے سے نہ ہوا وصل اگر جاناں سے   زیست مشکل نظر آتی ہے غمِ ہجراں سے
فصلِ گل ہم کو تہِ بال ہی گذری صیاد!   فائدہ کیا کہ رہائی ہوئی اب زنداں سے
فکرِ صحت مری کرتے ہو عزیزو! ناحق   مرضِ عشق بھی جاتا ہی کہیں درماں سے
رشتۂ شمع نمط ہر سرِ مو جلتا ہے   جسم میں میری یہ گرمی ہی تبِ ہجراں سے
پاسِ ناموسِ محبت نہ اگر مانع ہو   دوں جلا چرخِ کہن! آہِ شرر افشاں سے
ہر گھڑی کوچۂ قاتل میں لئے جاتا ہے   سخت تنگ آیا ہوں میں اپنے دلِ ناداں سے

افضل

افضل تخلص حسن یار خاں افضلؔ جوانِ مہذب الاخلاق و ذی ذکا است. بہ شاگردی خواجہ حیدر علی آتش امتیاز دارد، در مشاعرۂ میر صدر الدین صدر گاہ گاہ می آید با فقیر ہم آشنا است اما از حسب و نسبش اطلاع نہ دارم، عمرش تقریباً از سی متجاوز خواہد بود۔ از وست۔

نمودِ صفحۂ ہستی میں اپنا کام نہیں   نگیں کی شکل سے واقف ہمارا نام نہیں
وہ درد ہوں میں نہیں سود جسکو درماں سے   وہ زخم ہوں جسے مرہم سے التیام نہیں
کبھی ہی شہر میں بستر کبھی ہی صحرا میں   فقیر ہوں میں معین مرا مقام نہیں

ادیب

گوربخش، ادیب تخلص ولد لکنی داس قوم کہار ساکن مفتی گنج، جوانِ مہذب الاخلاق

است - در ابتدائے حداثتِ سِن بلوغ طبعش بہ طرفِ نوشت وخواند میلے تمام داشت، آخر
بمقتضائے شوق در مکتبِ لالہ بینی پرشاد ظریف چندے زانوے ادب پیشِ ادیب تہ کردہ
کورسوادی بہم رسانید، چوں موزوں طبع بود، خود بخود چیزے در زبان ہندی و فارسی
موزوں می کرد- مشارٌالیہ[1] طبعش را دیدہ او را پیشِ فقیر آوردہ، تا آنکہ دو چار ریختۂ ہندیش
بہ نوکِ قلم اصلاح آمد، در مشاعرہ بر روش خواند، ہمہ سامع پسندیدند و آفریں ہا گفتند- بعد یک
دو روز محمد علیٰ تنہا تخلص کہ یکے از تلامذۂ فقیر بود، تقریر در منعِ اصلاحِ نظم او برزبان آورد
گفت کہ اے قبلہ! اگر ہم چنیں ہر کس و ناکس را احباب در محفل قریبِ خویش جا خواہند داد
مرتبۂ ما مردم کہ عمرے دریں فن بخدمتِ شریف استخواں شکستہ ایم کجا خواہد ماند، از استماعِ
ایں سخن من ہم متامل شدہ نصیحتِ ناصح را کہ حقِ شاگردی او کثیر بود پذیرا شدم و از و در
گذشتم- آں بیچارہ چوں دید کہ ناحق نیش زنی نمودہ دلِ میاں صاحب را از من گرداند
مایوس شدہ بہ پیشۂ خود اشتغال ورزیدہ قطعِ آمد و شد نمود، چوں عرصہ بریں بہ گزشت
دیدمش کہ بحالی کہارانِ تامجانِ نواب سعادت علی خاں مشرف گردیدہ، در قوم خود
عز و امتیاز پیدا کردہ، جواہرِ قابلیتش دراں سرکار جلوہ گر شد، نواب صاحب بسیار مہربانی
بروی فرمودند و حکمِ شعر خواندن او را می کردند و شاد می گشتند- بعد رحلتِ نواب وزیر
بعہدۂ خود بجنابِ فیض مآب نواب رفعت الدولہ رفیع الملک غازی الدین حیدر خاں بہادر
شہامت جنگ قائم گردیدہ و قصیدۂ آبدار گفتہ بہ نظرِ مبارک گزرانید و بعطائے دو شالہ
و پنج عدد اشرفی سرفرازی یافت، نواب صاحب ہماں روز رنجِ حمالی سبکدوش ساختہ
بخدمتِ محرری کوٹھہ خزانۂ عامرہ معمور کردند و بعد گزرانیدنِ عرضی بہ اضافۂ مشاہرہ سرفراز
گردید- عمرش قریب سی سال خواہد بود، از وست:-

---

(۱) بینی پرشاد مذکور (ن)

از بسکہ تو کسی کا صنم یار کم ہوا
روٹھا تو جس سے تجھ سے وہ بیزار کم ہوا

عقدے سی تیری زلفِ معنبر کی مشک کو
تولا تو وزنِ نافۂ تاتار کم ہوا

صیاد نے مجھی کو قفس میں کیا اسیر
نالہ ترا نہ بلبلِ گلزار کم ہوا

ہم خاک میں ملے تری خاطر ارے میاں
ملنا ترا نہ غیر سے زنہار کم ہوا

لاکھوں ہی قتل گہہ میں گئے جان سی ولے
غصہ ترا نہ اے بتِ خونخوار کم ہوا

شاید کسی نے کان بھرے اسکے ان دنوں
ملنا جو اس کا مجھ سے یہ اکبار کم ہوا

کوچے سی اس کے اب کہیں اٹھ جا تو ای ادیب
اس جا علاجِ عاشقِ بیمار کم ہوا

قاصد یہ جا کے کہیو تو میرے حبیب سے
جاتا رہا ہے صبر دلِ ناشکیب سے

آئی ہی اب کے دھوم سے گلشن میں نو بہار
کہہ دیجیو صبا تو یہی عندلیب سے

حیراں کھڑی رہی ہی یہ نرگس کے باغ میں
اٹکی ہے آنکھ کس صنمِ دلفریب سے

جانا کسی نے ہم کو نہ آتا یہ کون ہے
شہرِ بتاں میں ہم رہے لیکن غریب سے

دل تھا جو اس کے پاس سو وہ کر چکا نثار
اب کیوں خفا رہو ہو میاں تم ادیب سے

اشعار فارسی

حاصل شود مرا بجہاں آرزوئے دل
گر یک نگاہِ نازِ تو افتد بہ سوئے دل

کردم خموش گر لبِ ظاہر چہ فائدہ
بیروں فتاد راز من از ہائے ہوئے دل

ہرچند ریخت خونِ جہانے ولے ہنوز
آسودہ نیست غمزہ اش از جستجوئے دل

از گریۂ سحاب چمن سبز می شود
آرے بود ز گریۂ من آبروئے دل

از سرکشاں کسے کہ دریں دہر می رسد
پر میکند پیادۂ حسرت سبوئے دل

خنجر بہ پہلوئے دلِ شوریدہ می زند
دردِ فراقِ او شدہ گویا عدوئے دل

... تو دامن کشاں گزشت
ہرگز کسے نہ کرد گذارے بسوئے دل

یک ساعت از تصورِ رویش نہ بہ گذرد
شاید بسینہ سوخت دلش کامشب اے ادیب!

من چوں کنم فنا و چنیں ہائے ہوئے دل
بوئے کباب سوختہ آید ز بوئے دل

دردلِ غمزدہ از عشق شرارے دارم
باعثِ روشنیٔ چشم بصارت مشتاق
مئے عیشِ دو جہاں رفعِ ملالم نہ کند
سویم از ناز اگر ناوکِ مژگاں فگند
گر طوافے کند آں شوخ چہ دور است ادیب

ہمچو گلریز چہ زیبندہ بہارے دارم
سرمۂ خاکِ کفِ پائے نگارے دارم
من کہ از مستیٔ چشمِ تو خمارے دارم
آہوئے دل پئے بہرام شکارے دارم
بر سرِ راہِ کسے تازہ مزارے دارم

شورے فگندہ است بہ اہلِ جہاں بسنت
گلہائے اشرفی ہمہ آورد بہرِ نذر
مردم ہمہ لباسِ بسنتی نمودہ اند
نوابِ ما کہ غازیٔ دین است نامِ او
از طبعِ روزگار غبارِ ملالِ وقت
جوشِ بہار صورتِ نرگس نمودہ است
آراستہ شدہ است خسِ باغ سر بسر
از بس کہ کردہ است گلِ زرد او بہار
ایں طرفہ سیر بیں تو کہ مرغانِ باغ را
یک بجرہ سیام سندر و یک بجرہ فیل چہر
بر فیل ہائے جھول بسنتی و زرنگار
سیرے نگر بدوشِ کہارانِ زرد پوش

آمد برنگِ جعفری و زعفراں بسنت
مانندِ آفتاب بریں آستاں بسنت
یعنی نوید داد بہ پیر و جواں بسنت
آمد از و بہ کشورِ ہندوستاں بسنت
از بس بہ ناز آمدہ دامن کشاں بسنت
یک گل بزیرِ خاک نہ آرد چناں بسنت
مانندِ نرگس است در و جا و داں بسنت
خیلے شکست داو برنگِ خزاں بسنت
از رنگِ لالہ ریختہ آتش بجاں بسنت
در روے بنازِ عیش نمودہ مکاں بسنت
بر موجِ طلا تو کنی چوں شہاں بسنت
آوردہ است پالکی و تامجاں بسنت

شوخی نگر کہ از قلمِ نرگسِ چمن | خوش میزند بدیدۂ دشمن سناں بسنت
رنگے چناں نمود کہ رضواں زکار رفت | از لالہ ہائے زرد بہ باغِ جہاں بسنت

ب

بیتاب

بیتاب تخلص از احوالش خبر نہ دارم یعنی از قدما معلوم می شود، ازوست:۔

چشمِ بد دور عجب خوش قد و قامت ہوگا | اب تو فتنہ ہے کوئی دن کو قیامت ہوگا

اگر خاموش رہتے ہیں تو کب آرام ہوتا ہے | وگر فریاد کرتے ہیں تو وہ بدنام ہوتا ہے

بہار

ٹیک چند بہار تخلصِ شاعرِ فارسی گواست صاحب دیوان شاگردِ[1] آرزو است۔

ہندی ہم ازو بہم رسیدہ اینست:۔

تڑپتا ہے پڑا جوں نیم بسمل خاک وخوں میں دل
عقوبت ہے جو کچھ اس صید پر صیاد کیا جانے

بیرنگ

دلاور خاں بیرنگ تخلص از احوالش آگاہی نہ دارم ازوست:۔

---

(۱) و بسیار شاگرداں او ہستند۔ (ن)

خط مرا اُس نگار نے نہ پڑھا　　　کیا لکھا تھا کہ یار نے نہ پڑھا
میں[1] تو لکھا تھا اُس کو خط بیرنگ　　　اُس تغافل شعار نے نہ پڑھا

بنیاد

میرزائے بنیاد تخلص از قدماست، ازوست :۔

بنیاد! تو چھپاوے ہے لیکن یہ عشق ہے　　　مانند بوئے مشک چھپایا نہ جائے گا

بیتاب

سیلوک رائے بیتاب تخلص از ہماں دورہ است، ازوست :۔

نہ رہے باغِ جہاں میں کبھی آرام سے ہم　　　پھنس گئے قیدِ قفس میں جو چھٹے دام سے ہم

جی میں ہے اسکی بات میں اب پھر نہ بولئے　　　لیکن کسی طرح جو یہ کافر زباں رہے

بسمل

میر صابر علی بسمل تخلص از احوالش خبر نہ دارم، ازوست :۔

تو ہو مجھ پاس یہ نصیب کہاں　　　تو کہاں اور یہ غریب کہاں

اگر تو ہی نہ ہووے جان! مجھ پاس　　　مجھے پھر زندگی سے کام کیا ہے

بسمل

بسمل تخلص شخصے عمدہ عمرش از سی متجاوز خواہد بود، ازوست :۔

(۱) میں تو لکھتا تھا اس کو خط پر خط

داغ ہائے دل کو میرے مت سمجھ جس تس کے پھول
نخلِ غم بویا ہے دل میں ہیں کھلے یہ جس کے پھول

بن ترے رشکِ بہاراں کیا کریں ہم سیرِ باغ
کس کا سبزہ کس کا گلشن کس کے غنچے کس کے پھول

میں نے تو اُس گلبدن کی سی نہ پائی بو صبا
سارے گلشن میں پھرا ہوں سونگھتا جس تس کے پھول

اس لئے گریہ گلے کا ہار ہے میرے جو تم
دیتے ہو ہر ایک کو حلقے میں اس مجلس کے پھول

تو نے جو مجکو دیئے گلہائے رخصت نازنیں!
سونگھتے ہی مرگیا سچ مچ تھے کیا وہ بِس کے پھول

اُس(۱) شگوفہ زار کی میرے تو دیکھو ٹک بہار
کیا کھلے داغِ جگر سے بسملِ مفلس کے پھول

بریاں

میرزا مظفر علی خاں بریاں تخلصِ خلف الرشید نواب احمد علی خاں شوکت جنگ سوزآں تخلص کہ ذکرِ ایشاں در تذکرہ ہندی گذشت، ابن نواب مرزا علی خاں مرحوم۔ جوانِ وجیہہ و مہذب الاخلاق است ظاہر و باطنش بصلاح و سداد آراستہ دیدم و اخلاقِ کریمانہ و حالاتِ بزرگانہ در ایامِ شباب از ایشاں بلاحظہ در آمد از بسکہ در فہم و فراست طبع و قادِ ایشاں بے نظیر افتادہ گاہ گاہے کہ ارادہ بہ طرفِ نظم کردنِ شعر آوردند در

---

(۱) شگوفہ ہے نیا دیکھو ذرا اس کی بہار (ن)

بدایتِ کار نہایت نمودہ اند بااین ہمہ خود را شاعر نمی گیرند این ہم از بلند ہمتیٔ ایشاں است، مشورہ بہ نواب محمد تقی خاں بہادر عموئ خود نمودہ اند و کم کم بایں عاصی ہسم۔

من کلام فارسی :۔

بود پوشیدہ بدل خواہشِ دلدار مرا / کرد رسوائے جہاں دیدۂ خونبار مرا

برسرِ کوئے تو چوں نقشِ قدم بنشستم / رفت از بسکہ زپا طاقتِ رفتار مرا

جاں ز تن رفت و ہماں دیدۂ من حیراں ماند / چہ قدر بود بدل حسرتِ دیدار مرا

آہ حالِ دلِ خود باکہ بگویم بریاں / دامِ گیسوئے بتاں کرد گرفتار مرا

چوں بر رخِ آں کافرِ بیدیں نظرم رفت / خواب و خرد و ہوشش ہا ندم زسرم رفت

رُوے آئینہ میدید و بسویم چو نظر کرد / تیرِ نگہش صاف بروں از جگرم رفت

صد بادیہ طے گشت و بمنزل نہ رسیدم / چوں ریگِ رواں عمر بہ سیر و سفرم رفت

یاراں دلِ من سوخت ازیں غم کہ آتش / تا نامۂ خود خشک کنم نامہ برم رفت

بہ نہفت ز بریاں چو رُخِ آں ماہِ دل افروز / از پشتِ فلک ناوکِ آہِ سحرم رفت

چناں برد آں حنائی دستِ او صبر و قرارِ من / کہ خوں ہر لحظہ می آید ز چشمِ اشکبارِ من

صبا از بیقراری نقشِ پائے تو سنش بوسید / دراں وادی کہ گردد گرم جولاں شہسوارِ من

خدایا مہرباں کن آں پری رو را کہ از عمرے / براہِ شوقِ او باز است چشمِ انتظارِ من

ز بے پروائیش دیگر چہ گویم آہ اے بریاں / ندارد مہر در دل طرفہ بیدرد است یارِ من

اشعارِ ہندی

بریاں کی شبِ فرقت میں نوحہ گری دیکھی / ہر نوکِ مژہ اُس کی لوہو سے بھری دیکھی

جلتا ہی رہا قبر میں بھی نت دلِ عاشق — آساں نہ ہوئی مرگ سے بھی مشکلِ عاشق

وہ حسن پہ نازاں ہیں یہ ہو گیا ہی تماشا — گر جذبِ دل اس کو بھی کرے مائلِ عاشق

مت ہم سے چھڑا چرخِ کہن دامنِ صحرا — مدت سے ہمارا ہے وطن دامنِ صحرا

آتے ہیں طرف شہر کے اس زلف کی بو پر — نت چھوڑ کے آہوئے ختن دامنِ صحرا

کر وعدہ وفا اب کی تو اس موسمِ گل میں — سرسبز ہے اے عہد شکن دامنِ صحرا

پوشش نہیں پاتی ہیں سدا لاشیں انھوں کی — ہے عشق کے کشتوں کا کفن دامنِ صحرا

بریاں کے تئیں کام ہی کیا رختِ شہی سے — دیوانوں کا ہی پوششِ تن دامنِ صحرا

ہر گام لچکتی ہے گرانباریٔ مو سے — اللہ ری نزاکت نہیں دیکھی کمر ایسی

دیکھی ہے کسی مست کی بہکی ہوئی رفتار — جو مضطرب الحال ہے بادِ سحر ایسی

گلگشت کی طاقت نہیں بلبل کو صد افسوس — صیاد کے ہاتھوں سے ہیں ملے بال و پر ایسی

معلوم نہیں باغ میں کس گل کا ہی ماتم — بلبل تو کبھی آتی نہ تھی نوحہ گر ایسی

ساون کی جھڑی لگتی ہی برسات میں جس طرح — ہے قطرہ فشاں آٹھ پہر چشمِ تر ایسی

بریاں مجھے تا صبح ذرا نیند نہ آئی — دل پر مرے اک کوفت رہی رات بھر ایسی

تری زلف کا جو گرفتار ہووے — نہ روز اس کا کیونکر شبِ تار ہووے

اسے آوے کس طرح پھر خوابِ راحت — جو بیمار چشموں کا بیمار ہووے

جو تو ہی نہ چاہے ملے تجھ سے کیونکر — ترے وصل کا جو طلبگار ہووے

لکھا تھا نہ قسمت میں بریاں کی یعنی — تری تیغِ ابرو کا افگار ہووے

جھلک اپنے حسن کی پردے سے مجھے رات جو وہ دکھا گئے
مرے داغِ سینہ مٹا گئے مرے بختِ خفتہ جگا گئے
گئے رہروانِ عدم کہاں کہ نشانِ نقشِ قدم نہیں
خبر اپنی بھیجی نہ کچھ کبھی ہمیں دل سے کیا وہ بھلا گئے

برچھی نے نہ خنجر نے نہ تلوار نے مارا
عالم کو ترے ابروئے خمدار نے مارا
دم تو بھی نہ نکلا در و دیوارِ قفس سے
سر اپنا بہت مرغِ گرفتار نے مارا
اے مرغِ چمن قہر کیا تو نے یہ ظالم
نشتر رگِ گل پر تری منقار نے مارا

دیکھا نہیں مجھ سا کوئی ناشاد کسی نے
بھولے سے بھی مجکو نہ کیا یاد کسی نے
چلائے بہت لیک نہ دی داد کسی نے
افسوس! سنی اپنی نہ فریاد کسی نے
افسوس رہا یہ کہ ہوئی فصلِ گل آخر
ہم کو نہ کیا قید سے آزاد کسی نے
اک جنبشِ مژگاں میں کئے طائرِ دل صید
دیکھا نہیں ایسا کبھی صیاد کسی نے

حُسن کا حور و پری کے نہ یہ عالم دیکھا
ہم نے اس طرز کا انسان بہت کم دیکھا
چمنِ دہر میں جوں بادِ صبا لطفِ بہار
دیکھنے جاتے ہیں سب ہم نے بھی اک دم دیکھا
شعلۂ شمع ہوا مضطرب الحال بہت
رات محفل میں جو اُس شوخ کو برہم دیکھا
تیغ ابرو سے تری دل نے اٹھایا وہ زخم
جس نے ہرگز نہ رخِ بخیۂ و مرہم دیکھا
مجکو سنبل کے پریشان نظر آتے ہیں حواس
اُس نے شاید کہ ترا طرۂ پرخم دیکھا
فصلِ گل آتے ہی اے وائے ہوئے ہم تو اسیر
ہم نے کب باغ میں لطفِ گل و شبنم دیکھا
ہجر کی شب کا میں کیا حال کہوں اے ریاؔ
جز دمِ سرد نہ اپنا کوئی ہمدم دیکھا

بیہوش

شیخ نبی بخش بیہوش وطنِ[1] بزرگانش اکبرآباد است و اوائلِ جوانی استفادہ شعر از میاں جعفر علی حسرت کردہ برفاقتِ قمرالدین احمد خاں عرف مرزا حاجی امتیاز دارد شخصِ دلچسپ و مردم آمیز خوش گفتار است بافقیر از تہِ دل بہ اُنس پیش می آید جد ش شیخ فیضی و ابوالفضل است، عمرش تخمیناً قریب شصت سال خواہد بود، ازوست:

بلبل! ترے نالے کا یہ انداز ہے کچھ اور / پانی کرے پتھر کو وہ آواز ہے کچھ اور
آغاز اور انجامِ محبت نہیں یکساں / انجام تو کچھ اور ہے آغاز ہے کچھ اور
بیہوش! غزل سن کے مری بولے یہ منصف / پر شعر و سخن کا ترے انداز ہے کچھ اور

دھواں حقہ کا آتا ہے نظر یوں وے جاناں تک / کہ جوں ابرِ سیہ ہلکا سا ہو مہرِ درخشاں پر
پہنچنا گر یقیں ہو کعبۂ مقصود تک اپنا / برہنہ پا خوشی سے ہم چلیں خارِ مغیلاں پر
عجب کیا حشر میں ہووے جو دامنگیر یہ اُسکا / خرابی رہتی ہے دستِ جنوں سے نت گریباں پر
پرستش اُس بتِ بدکیش کی کرتے تھے سب بیہوش / خدا کا قہر ٹوٹا ہے دلِ گبر و مسلماں پر

صیاد کو قفس میں نہ اُس پاس لائے گل / بلبل کو داغ دل ہی ہے اپنا بجائے گل
نازاں نہ ہو بہار پہ اپنی تو اے چمن / ہم نے بھی رنگ رنگ کے سینہ پہ کھائے گل
ہے پاسِ دوستی تو پس از مرگِ عندلیب / مصرف میں اپنے کوئی نہ زنہار لائے گل

تیرِ مژگاں نے ترے مجکو سنبھلنے نہ دیا / آلگا یوں ہدفِ دل پہ کہ ہلنے نہ دیا

---

(۱) از اولاد شیخ ابوالفضل۔ (ن)

آہِ سوزاں نے تو پھونکا تھا مرا کشورِ دل — ہائے اشکوں نے مدد کی اُسے جلنے نہ دیا

وصل کی شب بھی رہا مجھ سے وہ پابندِ حجاب — ہائے فلک تو نے یہ ارمان نکلنے نہ دیا

گردشِ چرخ نے جوں سرو مجھے اے بیہوش — باغِ ہستی میں کبھی پھولنے پھلنے نہ دیا

دوستو! رازِ نہاں اپنا عیاں کیا کیجے — اس غم انگیز حکایت کا بیاں کیا کیجے

لاکھ سمجھاؤ ہمیں ناصحو! ناچار ہیں ہم — دل سے جاتی ہی نہیں مہرِ بتاں کیا کیجے

غیرتِ کارِ محبت سے ہوا ہے دم بند — گھُٹ کے مرجایئے اب آہ و فغاں کیا کیجے

تو تو اغوا سے رقیبوں کے خفا رہتا ہے — تیرے کوچے میں جو اب رہئے تو یہاں کیا کیجے

چھوڑ کر شہر نکل جایئے صحرا کی طرف — یہ نہ کیجے تو پھر اے آفتِ جاں کیا کیجے

حشر میں بھی جو طرفدار ہوں قاتل ہی کے سب — ہے ہمیں سوچ یہ بیہوش کہ واں کیا کیجے(۱)

بہتر

میر اشرف علی بہتر تخلص جوانِ غریب دلچسپ، شاگردِ میاں پیر بخش مسرور است عمرش بست سالہ خواہد بود، از وست:-

دل کہے ہے مجھے دکھلائے مرے قاتل کو — ہائے کس طرح سے سمجھاؤں میں اس جاہل کو

حسرتِ ذبح ملاتی ہے مجھے خاک میں ہائے — دیکھتا ہوں جو تڑپتے میں کسی بسمل کو

قول و قرار اگلے وہ کیا ہو گئے — ہم سے جو ایک بار خفا ہو گئے

---

(۱) نسخہ رامپور میں یہ دو شعر زیادہ ہیں:-

ترے بیمار کی کیا جاویں خبر ہم سے لینے — وہ تو سنتے ہیں کہ اب اُٹھے لگا دم لینے

عمر بھر بوسۂ رخسار و لبِ یار سے لئے — پھر جو سچ پوچھو تو ہم ہائے بہت کم لینے

دیکھ کر اُس جعدِ سیہ رنگ کو ہم تو گرفتارِ بلا ہو گئے
تیرگیٔ بخت سے بہتر ہم آہ محوِ سرِ زلفِ دوتا ہو گئے

اس کے کوچہ میں کوئی اس ڈر سے جا سکتا نہیں گر گیا جیتا وہاں سے پھر وہ آسکتا نہیں
گہہ محل جانا کبھی ہونا خفا ہر بات میں تیرے دیوانے کو کوئی بھی منا سکتا نہیں
ہوں مریضِ عشق جس کا جان کا خواہاں ہو وہ اس لئے میں نبض عیسیٰ کو دکھا سکتا نہیں

چرخِ نیلی کے نہیں خوش آتے ہیں اختر مجھے جب سے آتا ہے نظر اُس کان کا گوہر مجھے
جلد آ اے شعلہ رو مجھ تک کہ اب سیماب وار رات دن بےچین رکھتا ہے دلِ مضطر مجھے
خونِ دل کا گر مرے منظور ہے تجکو علاج اپنی ہیکل کا بلا تعویذ تو دھو کر مجھے
رات دن رہتا ہے اب بہتر یہی مجکو خیال کام وہ کیجے کہ جس سے سب کہیں بہتر مجھے

تشتی کب درِ جاناں سے دور ہوں کیونکر شہید گنجِ شہیداں سے دور ہوں
خوش ہو کے ایک بار جو لگ جائے تو گلے داغِ فراق سینۂ سوزاں سے دور ہوں
اس معرکے میں اپنا یہ سر جائے یا رہے ہم وہ نہیں جو عشق کے میداں سے دور ہوں
بہتر ہم اُس کے ہیں مسی دہاں کے مبتلا مر جائیں دور ہوں

بندہ

میر بندہ علی ولد میر حاتم علی بندہ تخلص، سید صحیح النسب است، پیش ازیں در سنِ دہ سالگی مع قبائل[1] و عشایر بہ زیارتِ عتباتِ عالیات مشرف شدہ، دیارِ لکھنو

(۱) ہمراہ بزرگان خود۔ (ن)

عود نموده جوانِ ظریف الطبع و خنده رواست در ضلع و جگت و پھبتی چناں حاضر جواب کہ نظیرِ او کم می برآید، امیر زاده[1] ہائے ایں دیار او را بسیار دوست میدارند، بمقتضائے موزونیٔ طبع گاہ گاہے بہ گفتنِ شعرِ ہندی میلے تمام دارد، بہ فقیر از روزِ ملاقات اعتقادِ کلی دارد۔ ہرچہ موزوں کرده آنرا بپیشِ ایں عاصی بتوقعِ اصلاح خوانده اکثر اشعارش بلا سقط بسمع رسیده، عمرش تخمیناً سی سالہ خواہد بود، از وست:۔

سر پٹکتا میں رہا صبح سے لے شام تلک | ہاتھ پہنچا نہ تری زلفِ سیہ فام تلک

بھلا بتاؤ تو دل پھر لگے کہاں اپنا | جہاں نہ ہوئے کوئی یارِ مہرباں اپنا
بہار آئی ہے گلشن میں دیکھ لے اُس کو | ابھی اُجاڑ نہ بلبل تو آشیاں اپنا

بدگو نے تو اُس شوخ کے واں کان بھرے ہیں
یہاں سیکڑوں جی میں مرے ارمان بھرے ہیں
سب تیرِ جفا اُس نے رقیبوں ہی پہ توڑے
دل میں مرے سو شکووں کے پیکان بھرے ہیں

جی سے ہم گذرے جان سے گذرے | پر نہ تم اپنی آن سے گذرے
یہ اثر ہے ہمارے نالے میں | جائے جب آسمان سے گذرے
گالیاں ہی ہمیں دیا کر تو | تیری شیریں زباں سے گذرے

قاتل تو مجھکو قتل کر تقصیر ہوئے یا نہیں | کافی ہے ایک تیغِ نگہ شمشیر ہوئے یا نہیں

(۱) امیران ۔ (ن)

گور کے مرثیے جسے دیکھ کے جی جاتے ہیں ایک اُس کے لئے یہاں سیکڑوں جی جاتے ہیں

کچھ نظر آتے ہیں اب مرگ کے آثار ہمیں جینے دینے کا نہیں عشق کا آزار ہمیں

شب ہجر میں جان جاتی نہیں ہے اجل مانگتا ہوں سو آتی نہیں ہے

مار ڈالا مجکو ناحق آن کے تم کہاں سے آئے دشمن جان کے
چھپ گئے تم بھیڑ میں تو کیا ہوا میں گلے لگ جاؤں گا پہچان کے

ہجر میں اُس لالہ رو کے ہم یہ دکھ پاتے رہے خونِ دل پیتے رہے اور لختِ دل کھاتے رہے
ایسی تنہائی ہمیں کیوں تونے دکھلائی فلک ہم اکیلے رہ گئے اور ہمرہاں جاتے رہے

گر اپنے جنوں کی ہم تصویر کو کھچوا دیں تو پاؤں کے مجنوں سے زنجیر کو کھچوا دیں
بہزاد سے گر اب کی تصویر کو کھچوا دیں گردن پہ دھرے اپنے شمشیر کو کھچوا دیں
بیزار ہیں جینے سے بہتر ہے کہ مر جائیں غصہ اُسے دلوا دیں شمشیر کو کھچوا دیں

بشارت

میاں بشارت خواجہ سرائے اہل حبش قوم انبارہ بشارت تخلص سلیقۂ زبانِ فارسی دانی را در سرکارِ نواب حسن رضا خاں مرحوم بلند شدہ و از آنجا بسرکارِ نواب سعادت علی خاں رسیدہ بہ محلِ نواب جلال الدولہ عزِ امتیاز حاصل کردہ و آخر آخر بخدمتِ داروغگی نشاط باغ علم امتیاز برافراختہ جوانِ ملیح رخسار است خواجہ سرائے از بشرۂ

او جلوهٔ ظهور نمی دهد موهائے ریشش از رخسارهایش سپید است چوں از چشمانش اندازِ خواهشِ حسن از ته دلش طورِ عشق آفرینیٔ جمالِ خوباں پیدا است لهذا بمقتضائے موزونی گاه گاہے بطرفِ نظمِ شعر هوس میکند عمرش تخمیناً چهل ساله خواهد بود در مرثیه خوانی گلوئے خوش دارد یک نوحه ازو بهم رسیده این ست :-

اے نورِ چشمِ مادر و اے قاسمؓ دلاور — گشتی تو روزِ شادی مهمانِ تیر و خنجر

ایں کاتبانِ ظالم خوش نامهٔ نوشتند — کز زخم هائے تیغت بر تن زدند مسطر

در خاک و خوں فتاده چوں بنیمت دریغا — ایں حسنِ تو بودی چشم و چراغِ مادر

در ماتمت پریشاں مو کرده همچو سنبل — مانندِ گل عروست از سر فگنده معجر

رختِ تنت خاک و خوں است جانت ز تن برون ست — تاجِ تو سرنگون ست فرزندِ ابنِ حیدرؓ

تنها نه جامهٔ گل شد چاک تا بدامن — در ماتمت صبا هم افگنده خاک بر سر

این ست گر عروسی و ز مجلس عزایت — از چشمِ چرخ افتد اشکے شده هر اختر

شد با برادرانت کشتن نصیب ہی ہے — یکسو طپیده اصغرؓ یکسو فتاده اکبرؓ

از خوں حنائے شادی زیبد بدست و پایت — چوں پرده برکشائی از رخ بروزِ محشر

چوں تو چراغِ روشن هرگه خموش گردد — فریاد بر نیاید از دودهٔ پیمبر

خوں می چکد ز دیده کلثومؓ و زینبؓ را — کز زخم هائے کاری شد پیکرت بخوں تر

کن قسمتِ بشارت یک ساغرِ لبالب — بر تشنگان چو بخشی شربت ز آبِ کوثر

پاکباز

میر صلاح الدین پاکباز تخلص، از قدماست دو شعر ازو بهم رسیده اینست

قفس کے در کو وا اے بلبل! اب صیاد کرتا ہے — خدا جانے کرے گا ذبح یا آزاد کرتا ہے

فراق کیا ہے بلا وصلِ یار میں مریئے　　　خدا خزاں نہ دکھائے بہار میں مریئے

پیام

شرف الدین علی خاں پیام تخلص، دیوانے در زبانِ فارسی دارد واِں از نظر فقیر گذشتہ در ہندی ہم خوب میگوید، از وست:-

ہائے اس دیوانے دل نے کام ہی ایسا کیا　　　آپ تو بدنام تھا اور مجکو بھی رسوا کیا

برق

میرزا محمد رضا برق تخلص خلف الصدق مرزا کاظم علی سرآمدِ صلحاے فرقۂ اثنا عشریہ جوانِ شجاع و مہذب اخلاق و موزون الطبع و شائقِ فن و مداحِ اہلِ سخن دیدمش بشاگردئی شیخ امام بخش ناسخ عز و امتیاز دارد، عمرش تخمیناً قریب بسی خواہد بود۔ از وست

ایک بستی میں گو کہ بستے ہیں　　　دیکھنے کو مگر ترستے ہیں
پاک طینت کی خاک قدر نہیں　　　کس قدر گل جہاں میں سستے ہیں

برشتہ

آغا... برشتہ تخلص ولد..... قوم مغل جوانِ وجیہ و مہذب الاخلاق است روزے در مشاعرۂ حکیم سید محمد صاحب بافقیر ملاقات کردہ خود را شاگردِ مرزا رفیع سودا میگوید، واللہ اعلم بالصواب، از وست:-

جو مدرسۂ عشق میں مجنوں کا سبق تھا　　　سو اپنے وہ دیوان کا برآوردہ ورق تھا

کھلا ہی پینچ جوڑے کا کہیں اُس مہ کے بالوں کا　　　الجھتا دل ہی کچھ بے طرح ہم آشفتہ حالوں کا

منہ پھیر لیا میری طرف سے دلِ بسمل	اس حسرتِ دیدار کو جلاد نہ سمجھا
بس دیکھ لی تاثیر تری عشق کہ ہم کو	دیوانہ بھی اپنا وہ پریزاد نہ سمجھا

کوئی دن میں اے برگشتہ ہوتا ہوں صحرا نورد	آدمی ہوں عشق کے صدمے سے دل گھبرا گیا

بے چین کیا تو نے ہمیں سخت برگشتہ	نالوں سے ترے ہم کو شب آرام نہ آیا

عشق ہیں تیرے ہیں ہوس اے بتِ خو کام خراب	ناشکیبی نے کیا آہ مرا کام خراب

اٹھتا قدم نہیں ہے کسو گلستاں کی سمت	جاتا ہے دل کھنچا اُسی سروِ رواں کی سمت
صبحِ شبِ فراق نہیں پڑتی ہے نظر	پہروں میں دیکھتا ہوں پڑا آسماں کی سمت

نہیں کچھ سوجھتا ہجراں میں ہم کو	کسے کہتے ہیں دن اور ہے کدھر رات

دل جو سنبھلے تو ٹک جگر کی کہوں	کیا میں اُس ناوکِ دوسر کی کہوں
قطرہ جو اُس کا ہے وہ طوفاں زا	شورشیں کیا میں چشمِ تر کی کہوں
کاٹی مر مر کے ہے شبِ ہجراں	ہوش کس کو جو ٹک سحر کی کہوں
دو گھڑی بھی نہ سن سکو گے تم	گر میں بیتابی رات بھر کی کہوں
مر گیا سر قفس میں ٹکرا کر	کیا خرابی میں اس نگر کی کہوں
دل کی بیتابی یا کہ دردِ جگر	سخت ہوں مضطرب کدھر کی کہوں
صید کے بوجھ سے ہے بل کھاتا	کیا لچک یار کی کمر کی کہوں

گرمیٔ شوق ہو برشتہ کی سرد   گر میں بے مہری اُس قمر کی کہوں

کاہش رہی یوں دل کو جو گلشن کی ہوس میں   مرجائیں گے اک روز تڑپ ہی کے قفس میں

کوفت پہنچی ہے یہ جدائی سے   پھٹ گیا دل ہے آشنائی سے

اُٹھ سکی جب نہ منتِ صیاد   ہاتھ اٹھا بیٹھے ہم رہائی سے

ہائے مل ڈالا ہے ہمارا دل   کسی نے پنجۂ حنائی سے

اے برشتہ کہیں بھی نکلا ہے   عشق میں کام میرزائی سے

زردی چہرے پہ برشتہ جو ہے چھائی تیرے

دل نے شاید کہ کہیں چوٹ ہی کھائی تیرے

ترقی

اسد الدولہ رستم الملک میرزا محمد تقی خاں بہادر ترقی تخلص عرف آغا صاحب خلفِ میرزا محمد امین نیشاپوری جوانیست باغِ وبہار سرد قامتش بلباسِ موزونی آراستہ و نیچۂ دستش بحنائے سخاوت پیراستہ عالی دودمانی ایشاں محتاج بشرح و بیان نیست از ابتدائے شوقِ موزونی طبع تا الی الان رجوع ازتہ دل بہ اہلِ کمال و صاحبانِ سخن از عطیۂ دست او زر بدست می آرند ہر کس و ناکس را محروم نمیگذارد مِن اشعارہٖ اشعار فارسیہ :-

نہ در شب ہائے تارم کہکشانست   پریشاں گشت روزم ایں نشانست

نگوکاں گیسوے عنبر فشانست
سوادِ اعظمِ ہندوستانست

ز تاثیرِ سمومِ آہِ جاں سوز
نسیمِ صبحدم آتش فشانست

رقم ورِ بے ستوں بر صفحۂ سنگ
کہ از فرہاد شیریں داستانست

ز ہمدردی شریکم گشت بلبل
بہارِ گریہ ہایم در خزانست

ہمیشہ باد روشن دیدہ غول
چراغِ محفلِ دیوانگانست

بہائے بوسہ جاں میخواہد آں شوخ
دلم در فکرِ ایں سود و زیانست

در آبم افگن و در آتشم سوز
گرت در سر ہوائے امتحانست

نفس غلطیدہ در خوں آید امروز
نمی دانم کہ حالِ دل چسانست

حدی خواں ناقہ را آہستہ تر راں
غبارے در پسِ ایں کاروانست

بہ ضبطِ نالہا کوشش اے ترقی
ز فریادِ تو خلقے در فغانست

اشعارِ ہندی

تمھاری چال میں اس کے سوا کلام نہیں
یہ دل کا پیسنا عاشق کا ہے خرام نہیں

کروں ہلال کو صدقے میں اس کے ناخن پر
کہ جس کے منہ کے قابل مہ تمام نہیں

چھلک گلابی کی کیا ہر گھڑی دکھاتا ہے
بھر اس سے جام بھی ساقی مہ صیام نہیں

لیا جو ترکِ ادب کر کے خواب میں بوسہ
خطا تو ہے یہ سزاوارِ انتقام نہیں

ہے روز مفسدۂ ترکِ چشم و ہندوئے زلف
ہمارے کشورِ دل کا کچھ انتظام نہیں

طالب تو کوئی ہے لبِ دریا شراب کا
ہر دم جو کھینچ لیتا ہے ساغر حباب کا

دریا میں کون مست ہے ایسا شراب کا
ہر دم جو توڑ ڈالے ہے ساغر حباب کا

اے موجِ لطمہ زا ترا اللہ رے غرور
کیا لطف توڑنا دلِ نازک حباب کا

کرنا نہ تو قصور اگر ہو سکے فلک
آباد تجھ سے گھر کسی خانہ خراب کا

مجموعۂ حقائقِ قدرت ہے آدمی — مطلب نہ سمجھے پیرِ خرد اس کتاب کا
صدمے اٹھائے عشق کے ایسے جہاں میں جو — سب خوف دل سے اٹھ گیا روزِ حساب کا
دلچسپ کیا ہے مصرعۂ موزونِ قدِ یار — قائل ترقی میں ہوں ترے انتخاب کا

کاتبِ تقدیر گر نالہ سنے تاثیر کا — محو ہو کر لوح پر رکھ دے قلم تحریر کا
خوب ڈھونڈا چیر سینہ اُس نے مجھ دلگیر کا — چاک جب دل کو کیا تب نکلا پیکاں تیر کا
صبح تک رہتا ہے اُس مہ کا شبِ مہ میں خیال — چاند بھی گویا ورق ہے یار کی تصویر کا(۱)

تدبیر

میرزا محمد باقر عرف مرزا مغل تدبیرؔ تخلص ولد میرزا علی اصغر بن مرزا علی رضا قوم قزلباش اہل افشار متوطن شیراز در لکھنؤ تولد یافتہ جوانے است بصلاح و تقویٰ آراستہ ہرچہ میگوید از نظرِ شیخ امام بخش ناسخ میگذارند۔ ازوست:۔

وزدِ ہو روشن دلوں کے کیا کوئی اسباب کا — غیر ممکن ہے چرانا چادرِ مہتاب کا
وائے محرومی کہ بعد از ذبح بھی مجھ تشنہ کے — حلق پر داسہ پھرا تو خنجرِ بے آب کا

تراب

شاہ تراب علی ترابؔ تخلص پسرِ شاہ کاظم سکنۂ کاکوری طبعے رسا و ذہنے ذکا دارد

---

(۱) نسخہ رامپور میں یہ شعر زیادہ ہیں۔

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے — چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے
آغازِ عشق ہی میں شکوہ بتوں کا اے دل — ٹک صبر کر ابھی تو کیا کیا ستم نہ ہوں گے
بلبل کے دردِ دل کا ممکن نہیں مداوا — گلچیں کے ہاتھ دونوں جب تک قلم نہ ہوں گے
یارانِ رفتگاں پر کیا روئیں ہم ترقی — کیا ہم روانہ سوئے ملکِ عدم نہ ہوں گے

از انتخابِ اشعار اوست :-

صورت میں حقیقت میں جو مشہود ہے یارو　　اپنا تو وہی ہادی و معبود ہے یارو
رہتا ہی تراب اُس کے ہی کوچہ میں ہمیشہ　　اس کی تو وہی منزلِ مقصود ہے یارو

جب وصل ہو ترا وہی ساعت سعید ہے　　جس دن[1] گلے لگا لو وہی روزِ عید ہے
رات اُس نے سن کے میری کہانی کہا تراب　　یہ داستان تازہ یہ قصہ جدید ہے

وہ کون ہے تو جس پہ نوازش نہیں کرتا　　اِک میں ہوں کہ جس سی کبھی سازش نہیں کرتا

دوست دار اس عالمِ اجسام کے　　دشمنِ جاں ہیں نہیں کچھ کام کے
لوگ اُن کو کہتے ہیں آرامِ جاں　　کھونے والے ہیں وہی آرام کے
نام لیوا ہے قلندر کا تراب　　جائیے قربان ایسے نام کے

اُس شوخ سے کوئی میری سفارش نہیں کرتا　　قاصد بھی کچھ احوال گذارش نہیں کرتا
وہ خط کو مرے دیکھے تو پانی میں ڈبوئے　　میں اس لئے کچھ اس کو نگارش نہیں کرتا
خاکِ قدمِ یار مجھے چاہئے کحال　　سرمہ ہی ان آنکھوں میں خارش نہیں کرتا
دعوی نہ کرا ے ابر تو ہم چشمی کا مجھ سے　　آنکھوں سے تری خون تو بارش نہیں کرتا

رسیلی آنکھ تیری گرچہ قتلِ عام کرتی ہے　　یہ تس پر[2] میلی چتون اور ہی کچھ کام کرتی ہو
محبت سی میں ہوں ناچار گو اس نے کہا سو بار　　تراب الفت تری اُنکو بہت بدنام کرتی ہو

(۱) جن۔ (ن)، (۲) مگر یہ شوخ چتون اور ہی کچھ کام کرتی ہے۔ (ن)

فارسی

کے ز دنیا نفرت آید مردِ دنیادار را | سگ ہمیشہ دوست دارد طعمۂ مردار را

تسکین

میر سعادت علی تسکین تخلص، سید صحیح النسب و عمدہ خاندانیست، دو شعر ایشاں حسب اتفاق در تذکرۂ ہندی اول بقلم آمدہ بودند و آں روزہا ایں قدر نشو و نما نمیداشت حالا کہ صاحب دیوان شدہ شعر را برتبۂ بلند رسانیدہ۔ شاگرد میر قمر الدین منت مرحوم است، از وست :-

شب اتنا اشکِ خوں اس چشمِ گریاں نے کیا پیدا | کہ رنگِ دامنِ گلچیں گریباں نے کیا پیدا
عیاں شعلے ہیں جوں سروِ چراغاں ہر بنِ مو سے | یہ رتبہ آخر اپنے سوزِ پنہاں نے کیا پیدا
عوض دلگیریوں کے سُرخروی اس نے کی ہم سر | اثر الٹا ہماری آہِ سوزاں نے کیا پیدا
یہ ہم سب رشتِ گردوں کا ہے فیضِ آبلہ پائی | کہ رنگِ گل ہر اک خارِ بیاباں نے کیا پیدا
بلائے جاں ہے خلطہ ان پری رویوں کا اے تسکیں | خوشی مت ہو جو تجھ سے ربط جاناں نے کیا پیدا

لوگوں میں دیکھ اُسے کفِ حسرت ملا کیا | میں اپنے ہاتھوں رازِ نہاں پر ملا کیا
جانے سے تیرے دل کو تو تھا ہی فشارِ غم | جی کو بھی دیر تک کوئی جیسے ملا کیا

دھیان میں اُس کا جو شب کو ناوکِ مژگاں رہا | کچھ کھٹکتا صبح تک پہلو میں جوں پیکاں رہا
وقتِ بیتابی گرا جو قطرۂ خوں چشم سے | دیر تک جوں مرغِ بسمل خاک پر غلطاں رہا

دل نے کر کر کے قلق کھو دیا آرام مرا | کیا وہ کام کہ آخر ہی کیا کام مرا

روتے روتے شب فرقت میں بنا ہے یہ حال — کہ کرے چشم کو نم جو کوئی لے نام مرا
ذ گرفتار رہوں اتنی تو نہ کرے رحمی — دم نکل جائے گا صیاد تہِ دام مرا
کہہ تو بھیجوں اُسے حال اپنا پہ ڈرتا ہوں کہیں — حیلہ قاصد کی اجل کا نہ ہو پیغام مرا
کھو[۱] یا سب کام سے کر عشق بتاں اے تسکیں — کام آیا مرے اچھا دلِ ناکام مرا

مکھڑا ترا نہ جس شب اے رشک ماہ دیکھا — سمجھے کہ آج ہم نے روزِ سیاہ دیکھا

جلوہ کس گلگوں قبا کا رونقِ گلشن ہوا — جو ہر ایک گل کا گریباں چاک تا دامن ہوا
وصل کی شب چھا گیا آنکھوں میں اک اندھیر سا — آسماں پر جب ستارا صبح کا روشن ہوا

صلح کرتے ہوئے وہ بر سرِ جنگ آئے کیا — عشق کا نام بھی بد ہے اُسے ننگ آئے کیا

ہو سنگِ سرمہ لوحِ مزار اس قتیل کا — تا[۲] جانے کشتہ ہے کسی چشمِ کحیل کا
واشد کلی کی کیوں نہ کرے منقبض ہمیں — گل کی چٹک نمونہ ہے کوسِ رحیل کا
چشم اُس کی مانگے دل تو نہ دوں کس طرح کہ تپ — ہوتا ہے پر ضرور مزاجِ علیل کا
جوں ماہ داغ اٹھا دے تو سنمکھ ہو پھر بھی — آسان مقابلہ نہیں تجھ سے شکیل کا
تسکیں پناہ مانگ غمِ عشق سے کہ یار — انساں کو مار رکھے ہے غم اس قبیل کا

شام اس کا ہر ساں جو گذر بام پر ہوا — اک خلق کو گمانِ سحر شام پر ہوا

---

(۱) نہ کسی کام کا رکھا کہوں کیا اے تسکیں۔ (ن) (۲) سب جانیں۔ (ن)

نکلا جو وے کے سرمۂ دنبالہ دار وہ　　　کوڑا سا ایک ابلق ایام پر ہوا

دل کی بیتابی جو میں اُس کو رقم کرنے لگا　　　لغزشیں ہر حرف پر سو سو قلم کرنے لگا

دل میرا شکیبا کسی عنواں نہیں ہوتا　　　سچ کہتے ہیں فن عشق کا آساں نہیں ہوتا
عالم کہوں کیا رونے کی شدت کا میں یارو　　　عالم میں تعجب ہے کہ طوفاں نہیں ہوتا
رہتا ہے پس از مرگ بھی عاشق کو غم عشق　　　سچ یوں ہے کہ اس غم کو بھی پایاں نہیں ہوتا
یارب یہ شب ہجر ہے یا حشر کا دن ہے　　　کیوں صبح کا چاک آج گریباں نہیں ہوتا
ہے کون وہ عالم میں کہ جوں آئینہ پیارے　　　عالم کو ترے دیکھ کے حیراں نہیں ہوتا
تو وہ ہے جہاں رونقِ محفل ہو ترا حسن　　　واں شمع پہ پروانہ بھی قرباں نہیں ہوتا
ہے بوجھ بہت عشق کا بھاری متحمل　　　اس بوجھ کا تسکیں ہر ایک انساں نہیں ہوتا

کیا جائے جز اجل ترے مائل کا اضطراب　　　مائل ہی اضطراب کا دل، دل کا اضطراب

رفیقِ اہل جنوں کون ہے سوا زنجیر　　　کہ پا ہے یہاں پئے زنجیر و بہر پا زنجیر
ہوا ہوں سلسلہ جنبان جنوں کا میں اے قیس　　　اب اپنے طوق کو ٹھنڈا کر اور بڑھا زنجیر
خط ان بتوں کا ہوا دام دل جو کاکل کی　　　نکالی پاؤں سے کر کے خدا خدا زنجیر

آیا گلشن میں کھلے بندوں جو وہ جانِ بہار　　　ہو گئی برباد ساری شوکت و شانِ بہار
اُس میں اور گل میں تری ہی فرق اے بلبل پڑا　　　جان ہی گل کی بہار اور ہی وہ گل جانِ بہار

اُس کا بھبوت سے تنِ عریاں ہو زیرِ خاک — یا ہو نہ وہ گنجِ حسن کہ پنہاں ہے زیرِ خاک

نہ پوچھ مجھ سے جنوں پیشگاں کی رسوائی — کہ بس انھیں کے لئے ہو جہاں کی رسوائی

میں وہ محروم ہوں قاتل جو مرا سر کاٹے — دستِ افسوس بھی پھر تا دمِ محشر کاٹے
لب گزاں مرگ کو بھی کر دیا کشتے نے ترے — کتنے لب ایسے بہ حسرت تہِ خنجر کاٹے

خیالِ وعدہ میں جو دن تمام ہوتا ہے — ظہورِ شب بس اجل کا پیام ہوتا ہے
پناہ تیغِ نگہ اُس کی ہے کہ برق کی طرح — جدھر بڑھے ہی اُدھر قتلِ عام ہوتا ہے
مبارک سلے دلِ ناکام تجکو حسرتِ عشق — کہ فرطِ یاس سے اپنا تو کام ہوتا ہے
رہے نہ ہاتھ مرا کیونکہ دل پہ بے دلبر — کہ درد و غم کا یہی تو مقام ہوتا ہے
کروں جبیں کو میں اُس وقفِ آستاں تسکیںؔ — جو جانوں سجدے سے بارِ سلام ہوتا ہے

مرگ ہاتھ سے اس کے عمرِ جاودانی ہے — آبِ خنجرِ قاتل آبِ زندگانی ہے
بسکہ باعثِ گریہ سوزشِ نہانی ہے — اشک کو نہ سمجھا میں آگ ہے کہ پانی ہے
بھر رہے ہیں آنکھوں میں یار کے نگاریں پا — رات سے کچھ اشکوں کا رنگ ارغوانی ہے
آئی ہے نفس لب تک سوختگی سے لے دم — زور کچھ پھر ان روزوں اپنی ناتوانی ہے
داغِ غم ترے کھا کھا مر گیا ہوں میں اے گل — قبر پر مری لازم تجکو گل فشانی ہے
کیوں نہ موم سے پگھلیں اہلِ بزم اسی سن سن — سوزِ غم پتنگوں کا شمع کی زبانی ہے
واں علم ہوئی ہے تیغ بہرِ امتحاں تسکیںؔ — خم کر اپنی گردن کو وقتِ جانفشانی ہے

قابو میں دل تو ہوئے جو دلبر نہ ہو سکے   کیا زندگی جو یہ بھی میسر نہ ہو سکے

مت ہوائے دل اُس کی چشم فتنہ زا کے سامنے   آپ سے جاتا ہے کوئی بھی بلا کے سامنے
دیکھ میرا حال ہر چتون میں اُس کے لاف زن   آ گئے شوخی کے حیا شوخی حیا کے سامنے

تائب

سید بندہ علی تائب تخلص ولد میر محمدی وطنِ بزرگانش کشمیر و خودش در لکھنؤ تولد یافتہ در عربی و فارسی چیزے بقدرِ حال میداند از مدتے شوقِ موزوں کردن در دل داشت و پیش ازیں چند سال است کہ برائے اصلاح رجوع بہ فقیر آوردہ بود فقیر اورا ازیں کار مانع آمدہ ،⁽¹⁾ ایما بہ تحصیل علم کردہ بود بحکم اخلاق ایشاں را نیز بمقتضائے خواہش تائب تخلص گذاشتہ بحلقہ تلاندہ در آوردہ شدہ ، ازوست :-

اے گل خیال جب سے ترے رنگ و بو میں ہے   دل جوں نسیمِ صبح تری جستجو میں ہے
اتنا تو کر کہ اشک رواں رخ پہ ہو کوئی   اے ضبطِ گریہ تجھ سے خلل آبرو میں ہے
رکھتے ہیں گرچہ مہرِ خموشی دہن پہ ہم   لیکن زبانِ حال تری گفتگو میں ہے
تائب نہ زخم سینہ سے میرے تو ہاتھ اٹھا   بھائی ابھی تو کام بہت سار فو میں ہے

تمنا

بھیروں داس تمنا تخلص قوم کایستھ ساکن پرگنہ بھوتھ طرفِ اٹیونجہ قانون گوئی⁽²⁾ مولدش لکھنؤ بعد از نوزدہ سالگی خیالِ موزوں کردنِ شعرِ ہندی در سرش افتاد اول

---

(۱) ایما بہ تحصیل علم نمودم بہ نصیحت اعل نمود و علم حاصل ساختہ باز پیشم آمدہ ، تائب تخلص گذاشتہ (ن)
(۲) قانون گوئے آں پرگنہ (ن)

مشورۂ سخن بیان محمد عیسیٰ تنہا کہ خدائیش بیامرزد میکرد و بعد چندے مشارٌ الیہ ایشانرا در حینِ حیاتِ خود پیشِ فقیر حاضر ساختہ بحلقۂ تلامذہ دیگر درآوردہ باعثِ فرزنی اعتبار کردہ چوں سلیقۂ درست داشت شعرِ خود را در عرصۂ قلیل بہ پایۂ پختگی رسانید عمرش تا امروز بست و شش سالہ خواہد بود، از وست :-

سرگرم شبِ ہجر ہے بیدادگری پر | اور آہ نے باندھی ہے کمر بِاثری پر
پروانے کو کیا سوزِ دل اُس کے کی خبر ہے | گذرے ہے جو کچھ حال چراغِ سحری پر

یا تو گلگشتِ چمن سے مجھے کر شاد کہیں | یا چھری پھیر گلے پر مرے صیاد کہیں
رکھ قفس دور چمن سے مرا صیاد کہیں | کان میں گل کے نہ پہنچے مری فریاد کہیں
بے ستوں کی تو ہر اک سنگ کی تہ کو کھودا | میں نہ پایا اثرِ تربتِ فرہاد کہیں
سچ تو یہ ہے کہ تمنا کو جہاں میں ہرگز | مصحفی سا نہ ملے گا کوئی استاد کہیں

سمجھائیں کس کو آہ غمِ ہجرِ یار میں | اپنا تو دل ہی اپنے نہیں اختیار میں
میں ہوں وہ نخلِ سوختۂ باغِ روزگار | کاٹے ہی باغباں جسے فصلِ بہار میں
ہووے گا اور اس سے مرا داغِ دل زیادہ | مدفون نہ کیجیو تو مجھے لالہ زار میں
جز محنتِ سفر نہ تمنا ہوا حصول | ملکِ عدم سے آئے عبث اس دیار میں

پہلو میں سرنگوں وہ مرے بے نقاب تھا | شب اختلاط میں اُسے اتنا حجاب تھا
زلفیں سنوارتا تھا وہ شاید کہ رات کو | تارِ حیات پر جو مرے پیچ و تاب تھا
بحرِ جہاں کی سیر میں کس طرح دیکھتا | واں دورِ زندگی تہ دورِ حباب تھا

تصویر

جواد علی تصویرؔ تخلص۔

قد و قامت اس بتِ مغرور کا ایک جھمکا ہے خدا کے نور کا

تمنا

خواجہ محمد علی تمناؔ تخلص۔

کہاں جائیں کس سے کہیں حال اپنا کیا عشق نے تنگ احوال اپنا

تمکین

صلاح الدین تمکینؔ تخلص۔

حسن اور عشق کو جس روز کہ ایجاد کیا مجکو دیوانہ کیا تجکو پری زاد کیا

تمنا

محمد اسحاق خاں تمناؔ تخلص۔

جو کوئی تجھ سے ہم کلام ہوا بات کرتے ہی بس تمام ہوا

(ث)

ثابت

شجاعت خاں ثابت تخلص۔

یہ سچ کہو کہ کیا کن نے بدگماں تم کو
غبار میری طرف سے ہے اے بتاں تم کو[1]

ثابت

اصالت خاں ثابت تخلص۔

بگولے کا کہیں صدمہ کہیں صرصر کی حرمت ہے
ہماری خاک یوں اڑتی پھری اے ابر رحمت ہے

ثابت

میرزا ثابت علی بیگ ثابت تخلص۔ از وست :۔

عاشقِ زار ترا شب کو جہاں رہتا ہے
روز ہنگامہ قیامت کا وہاں رہتا ہے

کیا صنم خانے ہیں کیا یار حرم میں سب کو
نام تیرا ہی سدا وردِ زباں رہتا ہے

ہے ترے حسن سے بازار جہاں یوسفستاں
دل سے خواہاں ترا ہر پیر و جواں رہتا ہے

جو شہیدانِ محبت ہیں کفن سے اُن کے
خوں کا سیلاب تہِ خاک رواں رہتا ہے

وادیِ نجد میں اب تک بھی غبارِ مجنوں
شوقِ لیلیٰ میں بگولا سا دواں رہتا ہے

---

(۱) ن یہ سچ کہو کہ کیا کس نے بدگماں تم کو
غبار میری طرف سے ہے مہرباں تم کو

نسخہ رامپور میں ایک شعر زیادہ ہے :۔

کیوں نہ ہو مجھ کو عجب دیکھ کے نیرنگیِ عشق
جس کو دل دیتے ہیں وہ دشمنِ جاں ہوتا ہے

ہے تعجب کا مکاں واہ ری نیرنگیٔ عشق — جس کو دل دیتے ہیں وہ درپئے جاں رہتا ہے
طرفہ صحبت ہے مری اُس کی میں ہوں اس سے رُکا — اور خفا مجھ سے بھی وہ جانِ جہاں رہتا ہے
دل مرا روزنیِ چشم ہے لیکن ہردم — اُس کے مکھڑے کو بحسرت نگراں رہتا ہے
ثابتؔ اُس شوخ کے جانے سے بہ شکلِ نگیں — مجکو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے

ثمرؔ

میرزا علی ثمرؔ تخلص بزرگانش از شاہجہاں آباد واند و خودش بہ لکھنؤ تولد یافتہ و جوان شدہ چوں در عربی و فارسی تحصیلِ درسی(۱) داشت بمقتضائے موزونیٔ طبع از چند سال شوقِ نظمِ شعر دامنِ دلش بہ سوئے خود کشیدہ مشورۂ آں بہ فقیر آوردہ ، عمرش بست ہفت سالہ خواہد بود ، از وست :-

جستجو دل کی عبث گیسوئے دلدار میں ہے — چیزِ گم گشتہ کہیں ملتی شبِ تار میں ہے
ہو دمِ نالہ کشی دیکھئے کیا شعلہ بلند — برگِ گل کوئے بلبل ابھی منقار میں ہے

موجِ نسیم لطمۂ صرصر ہوئی انھیں — جو بارِ گل سے ساعدِ سیمیں لچک گئے
کس کی شمیمِ زلف صبا لائی تھی ثمرؔ — سکانِ شہر و دشت جو سارے مہک گئے

شکلِ وصل آئی نظر آئینۂ فولاد میں — زندگیٔ خضر پائی خنجرِ جلاد نے

آہِ موزوں پر ہماری کیوں نہ قمری جان دے — ہیچ ہے(۲) رعنائی کہاں یہ قامتِ شمشاد میں

---

(۱) ن۔ بایہ درست دارد۔ (۲) ن۔ پائے رعنائی

مست ہوتا ہے ہر اک فصلِ بہاراں میں ثمرؔ　　کیوں نہ مرغانِ چمن سرگرم ہوں فریاد میں

خاک جو ہم بعدِ فنا ہو گئے　　بارِ گراں تجھ پہ صبا ہو گئے
بخیہ گری کا جو ہوا شوق اُسے　　لاکھوں گریبان قبا ہو گئے
گردنِ عاشق جو ہوئی خم تری　　تیغ تلے سجدے ادا ہو گئے
اُس کے جو رخسار سے پردہ اُٹھا　　شمس و قمر دیکھ فدا ہو گئے
باغ میں تاراج خزاں سے ثمرؔ　　سروِ سہی پشت دوتا ہو گئے

(ج)

جوہر

میرزا احمد علی جوہرؔ تخلص، ازوست :-

شاید کہ پہنچے واں تک واماندہ کوئی ہم سا　　آوارۂ بیاباں اے گردِ کارواں ہو

جنون

شاہ غلام مرتضیٰ جنونؔ تخلص، ازوست :-

آفتِ جاں ہوگئی آخر یہ بینائی مجھے　　جو بلا کہئے سوان آنکھوں نے دکھلائی مجھے

جنوں کا یہاں تلک تھا گرم بازار　　کہ پتھر بھی ہوا اس کا خریدار

جرأت

میر شیر علی جرأت تخلص از قدماست، از وست :-

نہ اپنے چھوٹنے کی کس طرح تدبیریں رہئے   بہار آئی ہے کیونکر خانۂ زنجیر میں رہئے

جوشش

میاں محمد روشن جوشش تخلص از قدماست، از وست :-

تعلقاتِ جہاں سے خبر نہیں رکھتا   ہزار شکر کہ میں دردِ سر نہیں رکھتا

دل میں ہے اب قرب میں آئینہ ساں پیدا کروں   وہ مجھے دیکھا کرے اور میں اُسے دیکھا کروں

ہم چشم کیوں کہوں میں اُسے لالہ زار کا   عالم ہی کچھ جدا ہے دلِ داغدار کا

جریح

جریح تخلص، شاگرد مذنب است، از وست :-

ہوا ہوں دیکھ کر کشتہ میں پان خوردہ دہن اُسکا   مے مرقد پہ رکھیو جائے گُل لعلِ بدخشاں کو
سمجھتا ہی نہیں عاشق کو اپنے جاں فشاں ہرگز   بھلا کس طرح سمجھاوے کوئی اُس طفلِ ناداں کو
کہا مجنوں نے آوے گا ادھر گر ناقۂ لیلےٰ   مژہ سے صاف کردونگا میں کوسوں تک بیاباں کو
شریکِ حال کیوں میرے نہ ہوویں رنج میں اکثر   قرابت نالۂ دل سے ہے میری آہِ سوزاں کو

جنون

میرزا علی نقی جنوںؔ خلفِ میرزا محمد تقی ہوسؔ بمقتضائے موزونئ طبع چیزے موزوں میکند، طبیعش دریں کار رساست، عمرش از بست تجاوز خواہد بود، از وست:-

ہو گئے نشہ میں گستاخ رخِ جاناں سے — ہائے کیا کفر کیا بے ادبی قرآں سے

ذکر انساں کا تو کیا یار ترے کوچے میں — بھیجئے پیکِ صبا کو تو نہ آوے واں سے

حالِ صحرائے عدم کس سے میں پوچھوں اے دل — جو کہ جاتا ہے وہ پھر کر نہیں آتا واں سے

اپنے یاروں کو وصیت میں کروں گا دمِ مرگ — تم سمجھنا کہ جنوں چھوٹ گیا زنداں سے

جعفر

فخرالدین احمد خاں عرف مرزا جعفر جعفرؔ تخلص امارت و ثروتِ خاندانِ ایشاں چہ در شاہجہاں آباد و چہ در لکھنؤ ضرب المثلِ ساکنانِ ہر شہر و دیار است و تہور و جلادت در معارکِ سلاطینِ اولی العزم جوہرِ ذاتئ بزرگانِ ایں دودمان بر صفحۂ زمانہ یادگار شخصے بود بزیورِ فضل و کمال آراستہ چہ در طبعی و چہ در الٰہی خصوصاً در ریاضی نظیرِ خود نداشت، ہمیشہ ہم نشیں بہ سیرِ کتبِ دینیۂ فریقین مصروف بود و آدمِ ہر کیش و مذہب کہ با دو چار می شد با او بہ تواضع پیش می آید از نظم و نثر کتاب ہائے بسیار جمع نمودہ و بمطالعۂ اصل ہر دفترے رسیدہ در شعر فہمی چہ ترکی و چہ عربی و چہ فارسی و چہ ہندی چہ در کبت و دوہرہ از شعر گوئی بیشتر تامل می فرمود، در ایامیکہ قمرالدین احمد خاں عرف میرزا حاجی پسرِ کلان ایں بزرگ مجلسِ مشاعرہ ترتیب دادہ نظمِ ریختہ خود را بسمعِ مبارک ایشاں میرساند فواضلِ چند بہ تبعیتِ ایں بزرگ در محفل می نشستند و از اول تا آخر کلام ہمہ را می شنیدند بمقتضائے موزونئ جبلی گاہ گاہے خود ہم بگفتنِ شعرِ فارسی ہمت گماشتہ یک

رباعی در صفتِ پسرِ خود میرزا حاجی و یک غزل در عشقِ معشوق از ایشاں بہم رسیدہ بر حالِ ایں عاصی از قدیم الایام توجہ و مہربانی از تہِ دل داشتہ دگاہ گاہے بمؤنتِ احوال ہم پرداختہ اند عمرش تخمینًا بہ شصت متجاوز نہ خواہد بود در سال یک ہزار و دو صد وسی رحلت کردند در حویلیٔ نوساختۂ خود مدفون گشتند فقیر مولف تاریخ وفات دو یافتہ بقلم میدہد

مرزا جعفر از جہاں چو گذشت — علّے سینہ را بحسرت کوفت

مصحفی جست سالِ تاریخش — ہاتفے گفت کوسِ رحلت کوفت

۱۲۳۰ھ

دوم

جعفر آں فاضلِ ریاضی داں — کز علومش بدہر بود خلو

چوں بحکمِ خدائے عز و جل — در کفن در نہفت ناگہ رو

گفت سبحاں بشانِ آں مغفور — انتخابِ زمانہ دا ہل کو

۱۲۳۰

ازوست :-

اے نورِ بصر قبلۂ اربابِ کمال — باشی بکمالِ جاہ و عز و اقبال

خواہم کہ شود بفضلِ دادارِ جہاں — عمرِ تو ز ایامِ کبیسہ صد سال

جانِ من سخت بیقراری تو — ہست پیدا کہ عشق داری تو

دادۂ دل بدستِ ہیچو خودی — کہ چو من والہ و نزاری تو

متمتع شوی گہے بہ وصال — یا چو من بخت زشت داری تو

خم گساریت ہست یا چوں من — بیکس و یار غمگساری تو

جانِ من بر دلت چہ می گذرد — کہ چنیں زار و دلفگاری تو

کشتۂ خود قتیلِ تیغ کشی — کہ سرِ قتلِ من نداری تو

غالباً خوردۂ مے الفت — کہ شب و روز در خماری تو
چہ بلا بر سرت رسیدہ ولے — کہ چو جعفر نحیف و زاری تو

جوان

میرزا کاظم علی جوانؔ تخلص سکنۂ شاہجہاں آباد جوانِ بسیار خلیق است در مشاعرہ کمتر قدم گذاشتہ چندے رفیق میرزا اسیف علی نیز بود چندے بہ فیض آباد بسر بردہ حالا در کلکتہ رفتہ است، ازوست[۱]:-

وصل کی گر بزم میں خوش طالعی دے رو مجھے — شکل آئینے کی دیکھوں میں تجھے او رتو مجھے
مدعا طوفِ حرم سے ہے نہ گشتِ دیر سے — جستجو اس کی لئے پھرتی ہے ہر اک سو مجھے
کیونکہ کانٹا سا نہ کھٹکوں نظروں میں ہر ایک کی میں — خار جب پہلو میں اپنے سمجھے وہ گلرو مجھے
دامنِ وصل اُس کا کیونکر ہاتھ آویگا جوانؔ — ناز سے کہتا ہے وہ چل چل پرے مت چھو مجھے
دوست دشمن اپنے بیگانے نظر آتے ہیں سب — کر گئی چشمِ فسوں ساز اُس کا یہ جادو مجھے

ردیف (ح)

حریف

لالہ چنی لال ولد روشن لال حریفؔ تخلص قوم کایتھ موطنش از قدیم لکھنؤ است اما جد و مادر اش متوطنِ شاہجہاں آباد بودہ است از عرصۂ شش سالگی بعضے کتب درسی را از فقیر یاد گرفتہ بمقتضائے موزونیٔ طبع شوقِ نظمِ فارسی و ہندی در سر دارد و مشہور

[۱] شوق شعر مفرط داشت۔ (ان)

بہ نقیر میکند ہمیشہ غائب وحاضر بر جادۂ راسخ الاعتقادی تا الی الآن ثابت قدمش یافتہ ام عمرش قریب بست وہفت سالہ ، از وست :-

چاک کر دست جنوں جیب وگریبانِ مرا | سرِ بام آ و بہیں حالِ پریشانِ مرا
اندریں وادیٔ پر شور کہ وحشت خیز است | جز مغیلاں کہ کشد گوشۂ دامانِ مرا

جان من از طپشِ دل خبرے نیست ترا | در پرافشانی بسمل خبرے نیست ترا
قیسِ بیچارہ پسِ قافلہ دم می شمرد | حیف اے صاحبِ محمل خبرے نیست ترا

آمد بہار و یار بہ سویم نظر نہ کرد | اے وائے نالہ در دلِ سختش اثر نہ کرد
شد زخمہائے تیغ جفایش نصیبِ غیر | روحِ حریف سینۂ خود را سپر نہ کرد

اشعار ہندی

شب کہ سر گرمِ طپش میرا دلِ بیتاب تھا | اشک جو آنکھوں سے نکلا قطرۂ سیماب تھا

یہ کون غیرتِ حور آج بے نقاب ہوا | کہ جس کے جلوے سے ہر ذرہ آفتاب ہوا
نہیں ہے مجکو دمِ نزع آپ کی حاجت | غمِ فراق سے میرا جگر ہی آب ہوا
حریفِ زار نے جو آج خون تھوکا ہے | وہ شوخ غیر سے شاید کہ ہم شراب ہوا

تجکو منظور اگر زلف کا سلجھانا تھا | کام یہ مجھ سے پریشان کو فرمانا تھا
اپنی آنکھوں سے شبِ وصل کو جاتے دیکھا | روزِ بد ہم کو یہ اے چرخ نہ دکھلانا تھا

کیا کرے شکوہ کوئی اُس بتِ ہرجائی کا | دیکھ اُسے بند دہن ہووے ہے گویائی کا

غم دوری سے ہی ہمدم نہایت جی یہ تنگ اپنا
نہ کھاویں خونِ دل کیونکر نہ ہو کیوں زرد رنگ اپنا
کریں تھے جس حجر سے سینہ کوبی اُس کے کوچے میں
وہی پھر بعد مرنے کے ہوا چھاتی کا سنگ اپنا

منہ سے نقاب دی جو مرا مہ جبیں اُلٹ
حور و پری کا جاوے دم اے ہمنشیں الٹ
پل مارتے جہاں کا رنگ اور ہو گیا
کیا کیا صفیں فلک نے یہاں پل ہیں یں اُلٹ
لکھا ہے جو نصیب کا مٹتا نہیں کبھی
جاوے اگر حریف زمان و زمیں اُلٹ

نہ ہو گی غنچۂ دل کی مرے وا شد گلستاں میں
حریفا ادھر ہی اب چل جی لگے شاید بیاباں میں
نہ پایا گلشنِ دنیا سے گل جز داغِ محرومی
بجائے لالہ میں لختِ جگر لایا ہوں داماں میں
رفو گر کیا سئے گا اس کو ناصح تو ہی بتلادے
رہا ہے تار بھی باقی کوئی میرے گریباں میں

آہ سرگرم ہے میری شرر افشانی میں
کہیں آوے نہ خلل برق کی جولانی میں
آہ یہ حرف بھی گر صانعِ عالم لکھتا
کیا نہ تھی وصل کی جا گر خطِ پیشانی میں
ہم نے وحشت میں بھی ملبوس کیا خاک کو بھی
یعنی ممنوں نہ ہوے اُس کے بھی عریانی میں
کفر و دین کی نہیں یکرنگی کا جو یہاں قایل
دیکھے زنار کو تسبیحِ سلیمانی میں
سرِ بالیں سے اٹھاوے کبھی اپنے سر کو
طاقت اتنی بھی نہیں ہے ترے زندانی میں
میری وحشت کا تو عالم ہی نرالا ہے حریف
اتنی شورش تھی کہاں قیس بیابانی میں

کب تک حیا و شرم کا رکھے گا پاس لے ناز نیں
اک روز تو بہر خدا آ میرے پاس لے ناز نیں

کسی کو دوست اپنا میں جہاں میں کم سمجھتا ہوں
فقط اس آہِ آتشبار کو ہمدم سمجھتا ہوں

بھروسا کب نہیں میرا ہے اس گلزارِ گیتی میں
میں اپنی ہستیِ موہوم کو شبنم سمجھتا ہوں

وہ چھڑکے ہے نمک زخموں پہ جس دم دستِ نازک سے
حریفِ خستہ میں اس کو بہ از مرہم سمجھتا ہوں

موسمِ گل میں بھی بلبل اگر آزاد نہ ہو
پھر وہ کس طرح بھلا شاکیِ صیاد نہ ہو

مجھ سے دیوانے کی زنجیرِ گراں ٹک گھڑنا
رائگاں تا تری محنت کہیں حداد نہ ہو

ضعف سے ہو نہ سکے چاک گریباں مجھ سے
تو گرا اے دستِ جنوں بر سرِ امداد نہ ہو

نے کی مانند ہے شورش لبِ نائی سے مرے
وہ جو خاموش ہو تو پھر مجھ سے بھی فریاد نہ ہو

صبح تک شب کو رہا میرا غمِ شادیِ مرگ
وصل کی شب میں کوئی اتنا بھی دلشاد نہ ہو

مزہ ہے ہر شبِ مہ بر میں وہ طفلِ شرابی ہو
کھلے ہوں غنچۂ گل کے اور بھری مے سے گلابی ہو

نہ روئیں کیوں رقیب اس غم سے جب ماہِ محرم میں
پڑھوں ہیں سوزِ دل کا مرثیہ اور وہ جوابی ہو

طالب جہاں میں کس لئے ہوں جاہ و مال کے
آخر ہیں ہر کمال کو یہاں دن زوال کے

ناخن سے سینہ کاوی یہ کی ہے کہ بن گئے
چھاتی پہ میرے لاکھوں ہی نقشے ہلال کے

واقف نہیں ہے غیب سے یہاں کوئی اسلئے
ہم معتقد نہ قرعہ کے ہیں اور نہ فال کے

اتنا ہے ننگ اس کو کہ اب تک وہ خوش خرام
گذرے ہے میری خاک سے دامن سنبھال کے

خونِ جگر پئیں گے پہ اک جام کے لئے
ممنون ہم نہ ہوئیں گے ہرگز کلال کے

کب دیکھتے ہیں حورِ بہشتی کو ہم حریف
شیدائی ہیں جو اس بتِ صاحب جمال کے

ہجومِ دردِ ہجراں سے یہ ضعفِ قلب طاری ہے
کہ برگِ کاہ بھی تن پہ مرے جوں کوہ بھاری ہے

کرے گا پند تو جو کچھ وہ سب مانونگا اے ناصح　　پھر اُس کوچہ کے جانے میں مجھی کو اختیاری ہو

ملا خاک میں بھی میں اے صنم ترے دل میں وہ ہی غبار رہی
وہی ننگ ہے مرے نام سے وہی ملنے سے مرے عار ہے
یہ نسیم قیس سے جاکے کہہ کہ سفر کا رنج ابھی اور سہہ
نہ قدم قدم ہی پہ بیٹھ رہ ابھی دور ناقہ سوار رہے

صحرا سے گرچہ باغ کو لے گئی صبا مجھے　　آئی نہ راس واں کی بھی آب و ہوا مجھے
ہر چند سبز بخت ہوں پر چرخ سنگدل　　پیسا کرے ہے صورت برگ حنا مجھے
چھڑکا ہے روغن آتش دل پر سرشک نے　　یعنی کہ اس نے اور دیا ہے جلا مجھے
مشتاق ہوں کہ لاوے کبوتر کسی کا خط　　ہرگز نہیں ہے خواہش بال ہما مجھے
دریا میں جس طرح سے رواں ہووے برگ کاہ　　یوں موج اشک لے گئی یار و بہا مجھے
احساں اٹھاتا کس لئے میں خضر کا بھلا　　وحشت ہی لے حریف ہوئی رہنما مجھے

نہ سمجھو چرخ پہ جلوے ہیں یہ ستاروں کے　　نشان ہیں یہ مری آہ کے شراروں کے
ہر ایک کو رہ ملک عدم ہے یہاں درپیش　　اُدھر ہی کو سفری قافلے ہیں یاروں کے

غیر کے گھر میں جلوہ گر جب سے وہ رشک ماہ ہی　　تب سے مثال تیرہ شب روز مرا سیاہ ہے
ذرہ ہر ایک رنگ کا کرتا ہی مہ سے ردکشی　　کون ہے بے نقاب یہاں کس کا یہ جلوہ گاہ ہے

شب وصل بھی تجھے اے صنم رہی مجھ سے شرم و حجاب ہی

وہی ننگ ہو وہی عار ہے وہی منہ پہ طرفِ نقاب ہو

میں ہوں گو کہ یار سے ہمزباں یہ یقیں مجھے نہیں دوستاں

ہیں نصیب ایسے مرے کہاں یہ ہنوز عالمِ خواب ہو

مجھے روزِ حشر سے مت ڈرا مجھے خوف اُسکا نہیں ذرا

کہ شبِ فراق ہے زاہدا مرے آگے روزِ حساب ہو

دلِ خستہ بہہ گیا خون ہو مرا حالِ زار ہے گو مگو

جو یقین جی کو ترے نہ ہو تو گواہ چشمِ پر آب ہو

وہ ہوا ہو یار سے بے ادب کہیں مئے کے نشہ میں وقتِ شب

یہ حریف رند پہ بے سبب نہیں اتنا قہر و عتاب ہو

مری نظروں سے گو ہمدم نہاں وہ لاابالی ہو
دلے پیشِ نظر نت اُس کی تصویرِ خیالی ہو

دریغ اُس بت نے رکھا جو رکھی ہم سی کہ ان رُوں
نگاہِ قہر نے غصہ ہی نے جھڑکی نہ گالی ہو

واسطے رہنے کے یہاں کس کو مکاں درکار ہے
جا فقط دل میں ترے اے جانِ جاں درکار ہو

دورِ جامِ مُل ہو گردش سے کوئی دم باز رہ
رحم مے خواروں پہ ٹک اے آسماں درکار ہو

چھوڑ کر صحرا میں تنہا مجکو جاتے ہو کہاں
کچھ تو پاسِ ہمرہی اے ہمرہاں درکار ہو

پھر گلِ اشک آ کے میرے زیبِ داماں ہو گئے
وقفِ وحشت پھر مرے تارِ گریباں ہو گئے

پا برہنہ بس کہ کی ہو میں نے نت صحرا دوی
صرفِ پائے خستہ سب خارِ مغیلاں ہو گئے

دل لگاتے نہ اگر اُس بتِ ہرجائی سے
خواریوں پھرتے نہ ہم گلیوں میں سودائی سے

آئینہ چھوڑ کے دیکھو کسی حیراں کی طرف — تم کو فرصت ہی کہاں اتنی خود آرائی سے
کیونکہ منزل پہ میں پہنچوں گا کہ پاؤں ہیں حریف — آبلے پڑ گئے ہیں بادیہ پیمائی سے

قیس کب صحرا نوردی میں مرا ہم سنگ ہے — اُس سے ویرانہ مرا آگے کئی فرسنگ ہے
کشورِ دل پر نہ کی گر عشق نے لشکر کشی — کس لئے چہرے پہ میری ہر شکستِ رنگ ہے
غالباً پہنچی چمن میں وہ قفس سے چھوٹ کر — نالۂ بلبل نہایت آج سیر آہنگ ہے
کیوں نہ گھبراوے دلِ شوریدہ جوں مرغِ قفس — عرصۂ کونین ہی وحشت پہ اس کی تنگ ہے
کس طرح سے پھر نہ ہووے شیشۂ دل چور چور — کوہِ غم کا اس کی چھاتی پر بھاری سنگ ہے
یار کا شکوہ کروں کب اتنی طاقت ہے مری — اپنے ہی بختِ نزبوں سے مجکو ہر دم جنگ ہے
تو جو نت سرگشتہ پھرتا ہے بسانِ گردباد — اے دلِ وحشی کوئی یہ زندگی کا ڈھنگ ہے
پھر کروں کیونکر نہ اے ہمدم وداعِ نام و ننگ — عاشقی میں پاسِ نام و ننگ کا بھی ننگ ہے
اُسکی رعنائی کا جس دم سے تصور ہے حریف — میرے ہر اک شعر میں اک اور ہی نیرنگ ہے

حسین

غلام حسین خاں حسین تخلص، مردِ جہاں دیدہ و پیرِ فرسودہ دیدمش، شعرِ فارسی بسیار برشستگی میگوید، گاہے فکرِ ریختہ ہم میکند آنچہ از کلامِ ہندی و فارسیش بہم رسیدہ این ست :-

بے تو متاعِ صبر را دادہ بآبِ چشمِ تر — خانۂ دل خراب کرد خانہ خرابِ چشمِ تر
گریۂ زارِ ما دمے فرصتِ دیدنش نداد — بر رخِ من ہمی کند کارِ نقابِ چشمِ تر
مستیِ آں نگاہ را تا کہ حسین دیدہ ام — خرقۂ زہد ساختہ غرقِ شرابِ چشمِ تر

آزمودیم درو مہر و وفا بود نہ بود　　لطفِ او غیرِ فریبِ دلِ ما بود نہ بود
نیست بی وجہ بگو صاف چہ صورت دارد　　میل ازیں گونہ بہ آئینہ ترا بود نہ بود
مدعا غیرِ دلا زاریم او وا شت نہ داشت　　ورنہ ہیچ از منِ بے جرم خطا بود نہ بود
دیدم آخر بہ دو داغم نہ رسیدی ہیہات　　ایں قدر سنگدلی از تو روا بود نہ بود
اے حسین اینہمہ فریاد چہ حاصل گاہی　　آں جفا کیش غمت را شنوا بود نہ بود

تیغ کین با منت کشیدن نیست　　از تو جانم سپر بریدن نیست
بیقراری بدل قرار گرفت　　قسمتِ جانم آرمیدن نیست
بہ تمنائے بوسۂ لعلش　　حاصلم غیرِ لب گزیدن نیست
سینہ خواہیم چاک کرد وگر　　جیب ما قابلِ دریدن نیست
مکن آزاد از قفس صیاد　　کہ مرا طاقتِ پریدن نیست

یک دم از و شوم جدا می شود ایں نمی شود　　صبر کجا و من کجا می شود ایں نمی شود
بری ز حرف راست تجربہ کردہ ام دروغ　　وعدہ ات اے صنم وفا میشود ایں نمی شود
وصلِ تو آرزو کنم ایں چہ خیالِ باطل است　　شاہ کجا و کو گدا می شود ایں نمی شود
بخیہ بجیب دل چاکم رفو　　ہیچ کہ از تو ناصحا می شود ایں نمی شود
غیرِ سرشک اے حسین یک شبم از خیالِ او　　خواب بدیدہ آشنا ایں شود ایں نمی شود

اشعار ہندی

کیا کریں گے آہ ہم کو حشر روزِ داد ہے　　ناتوانِ عشق کو کب طاقتِ فریاد ہے
نام تو سنتے رہے ہم پر نہ پایا کچھ نشاں　　صبر و طاقت کیا ہے اور کیا خبرِ طبع شاد ہے
کھود کر دل ناخنِ غم سے نکالی جوئے خوں　　ہم سے ہی یہ دستکاری کو کہن ایجاد ہے

کیا زبانِ تیشہ نے آخر کو افسانہ کہا　　خوابِ شیریں میں جو سن کر اب تلک فرہاد ہی

غمِ دل سے آگاہ کیا کیجئے　　وہ سنتا نہیں آہ کیا کیجئے
دلِ سخت میں اُسکے ہوتی نہیں　　کسی حال سے راہ کیا کیجئے
وفادار خوباں نہیں ای حسینؔ　　عبث ان کو پھر چاہ کیا کیجئے

آنکھیں تمھاری دیکھتے عمر اپنی کٹ گئی　　اس بندگی پہ ہم سے نظر کیوں پلٹ گئی
پیرا جو لٹ پٹا وہ صنم باندھنے لگا　　جان اپنی ڈھیلے پیچوں میں اُسکے لپٹ گئی
جینا ہے موت سچ ہی جدائی کے درد میں　　اپنی بھی زندگی تو اسی غم میں کٹ گئی

بیتابیٔ فراق ہمیں ایک آن چھوڑ　　دل تو نہیں رہا ہی کسی طرح جان چھوڑ
چاہا تو کچھ ستم نہ ہوا تم نے کس لئے　　ہم کو حقیر جان کے دی ہے زبان چھوڑ
کچھ چاہنا تو عیب نہ تھا بگڑے ہم سی کیوں　　لو چاہتے نہیں تمھیں وہ یہ گمان چھوڑ
ہو جائیں خاک ہی تو رہیں در ہی پر ترے　　ممکن نہیں کہ جائیں ہم آستان چھوڑ
آشفتگی سے پہنچا ہے سودے کا مرتبہ　　اب تو حسینؔ زلفِ پریشاں کا دھیان چھوڑ

جو ایسا ظلم ہر دم اے ستم ایجاد ہوتا ہی　　تو صاحب یہ غلام اب آپ کا آزاد ہوتا ہی
دل و دیں صبر و طاقت لیچکے اک جان باقی ہی　　تکلف برطرف اس کو بھی کیا ارشاد ہوتا ہی
عبث ہی ہمنشیں دردِ الم کی میری غمخواری　　کسی کا دل فراقِ یار میں بھی شاد ہوتا ہی
نہ اُس کی کھینچ سکی تصویر مانی آن مانی ہی　　کہ اُس ساعد کے دیکھے دست کش بہزاد ہوتا ہی

پہلے ہی دین و دل تو بپیارے تمھیں دیا ہے
اک نیم جاں ہی باقی تم پر سو یہ فدا ہے

گرم نصیحت آنا ناصح بکا کہ تب کی
ہزیان تھا وہ جو کچھ بے فائدہ بکا ہے

شب کو بگڑ کے جانا پھر معذرت کو آنا
جب دل ہو مہربانی کرنے میں لطف کیا ہے

رونے سوائے تجکو کچھ اور بھی ہے دھندا
سچ کہہ حسینؔ تیرا کیسا یار ماجرا ہے

حسام

شیخ ولایت علی حسام تخلص ولد شیخ زین العابدین نبیرہ حضرت شاہ حسام الدین جوانِ مہذب الاخلاق است عمرش بست و دو سالہ دیدم بحکم موزونیٔ طبع انچہ از ابتدا موزوں می کند بہ نظرِ فقیر میگذارند، از وست :-

تجھ بن جو کبھو مجکو گلستاں نظر آیا
ہر صحنِ چمن گوشۂ زنداں نظر آیا

جاتا ہے دلِ زار وہاں خیر ہو یارب
جس کوچے میں رستم بھی ہراساں نظر آیا

کھولے جو کبھو بندِ قبا باغ میں اُس نے
ہر غنچۂ گل، سر بہ گریباں نظر آیا

مت پوچھ حسامؔ جگر افگار کی حالت
تجھ بن وہ نہایت ہی پریشان نظر آیا

ہجر میں از بس کہ تن اکبار سر پر ہی مجھے
آبِ حیواں کے برابر آبِ خنجر ہے مجھے

دیکھئے طے کس طرح سے ہو رہِ ملکِ عدم
راہ دور اور طاقتِ رفتار کمتر ہے مجھے[1]

---

(۱) نسخہ رامپور میں یہ شعر زیادہ ہیں۔ (ن)

پھر گئی ان کے لئے ساری خدائی ہم سے
لیک ہم اس پہ بھی سودائے بتاں رکھتے ہیں

عجب رسم خریداری یہ دیکھی ہم نے خوباں میں
کہ جب جنس آچکی قابو میں تب تکرار نکلی ہے

مال و زر جاہ و حشم سب رائگاں ہو جائیگا
کاروانِ زندگی جب دم رواں ہو جائیگا

ہم کو یہ روشن ہی بزمِ ہستیٔ موہوم سے
ایک دن اپنا سفر بھی شمع ساں ہو جائیگا

حشمت

میر محتشم علیخاں حشمت تخلص کہ ذکر ایشاں در تذکرۂ اول گزشت رباعی خوبی از ایشاں بہم رسیدہ اینست :-

ہر جا حسنے بہ جلوہ موزوں گردید ‌ ‌ ‌ ‌ شد عشق و بلاے جانِ مفتوں گردید
شورِ خلخالِ پائے لیلیٰ آخر ‌ ‌ ‌ ‌ وجہِ خللِ دماغِ مجنوں گردید

حشمت

محمد علی خاں حشمت تخلص از حالِ ایشاں خبر نہ دارم۔

خط نے ترا حسن سب اڑایا ‌ ‌ ‌ ‌ یہ سبز قدم کہاں سے آیا

حدت

نواب علی ابراہیم خاں حدت تخلص شخصِ عمدہ بود و با شعرا از تہ دل دوستی داشت و حتی المقدور انچہ از دستش می برآید خدمت میکرد و تفویضِ عدالتِ بنارس چندے با و ماندہ چند سال است کہ جہانِ[1] فانی را بدرود کردہ فقیر او را ندیدہ اما وصفش از زبانِ دوستاں بسیار شنیدہ شعرے کہ از وبہم رسیدہ برائے یادگار بقلم می دہد :-

اُڑ گئے کچھ حواس سے میرے ‌ ‌ ‌ ‌ اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

حاضر

محمد شاہ حاضر تخلص

---

(۱) از جہانِ فانی گذشت (ن)

صبح اٹھ ظالم قیامت کر گیا — دور سے صاحب سلامت کر گیا

حباب

لطف علی حباب تخلص ولد میرزا کلو بیگ کہ بسر کارِ میاں آفریں علی خاں بتحویلِ کوٹھہ عزِ امتیاز داشت، از ابتدائے طفولیت سر موزونی دارد حالاکہ عمرش بست و دو سالہ خواہد بود شعر را بطور معنی بندان میگوید دریں طرزِ حریص کلامِ خود را از نظرِ فقیر میگذارند طبعِ رسا و ذہنِ ذکا دار داز دست :-

تصویرِ خیالی ہی سہی سوویں گے چمٹ کر — ارمان نکالیں گے شبِ وصل لپٹ کر
دعویٰ نہ کرے بادِ صبا تیز روی کا — چھولوں گا میں دیوارِ سکندر کو جھپٹ کر
پیری تو بری ہوتی ہے پر مجکو یقیں ہے — آرام دکھاویں گے یہ دن عمر کے گھٹ کر
ہے چشم مری خانۂ تحویلِ جواہر — آیا ہے سمندر مرے کوزے میں سمٹ کر
خطرہ ہے یہی مجکو کہ ہوں سنگ سے بھی سخت — ٹوٹے کہیں تلوار نہ قاتل کی اچٹ کر
پیغام زبانی ملک الموت کا آیا — بیٹھے مری بالیں سے مسیحا کہیں ہٹ کر
آتا ہے یہی دل میں حباب اپنے کہ اک دن — دیکھ آؤں میں قاصد کی طرح اُس کو جھپٹ کر

حباب وار جو مٹنے کی آرزو کرتے — چمن میں ہم بھی سرِ سیرِ آبجو کرتے
ہمارے خانۂ دل میں ہے روشنی اس کی — کہ جس کی دیر و حرم میں ہیں جستجو کرتے
دبا لیا ہمیں قاتل نے اپنے غصے میں — بہت جو سب سے تھے ہم سخت گفتگو کرتے
جو اپنی تیزیٔ پرواز تیغ بن جاتی — حلال طائرِ سدرہ کا ہم گلو کرتے
خزاں کے ہاتھ سے تنگ آ گئے ہیں نغمہ سرا — بہار آوے کہ جس کی ہیں آرزو کرتے
برنگِ خضر جو عمر اپنی طول ہو جاوے — درازیٔ شبِ ہجراں کی جستجو کرتے

سرنگوں میں ورقِ دل کی جو تحریر میں تھا
رنگ بھرنا قلمِ فکر کی تصویر میں تھا

گردشِ چرخِ ستم گر نے مٹایا آخر
نقشِ بہزاد میں اس چرخ کی تعمیر میں تھا

روشنیِ چشمِ نکیرین کی دیکھی پسِ مرگ
جلوہ ایسا شررِ نالۂ شبگیر میں تھا

سر اٹھایا جو کسی نے بھی بہ پیشِ قاتل
ملک اللہ کا سب قبضۂ شمشیر میں تھا

آنکھ مانی کی جھپکتی ہے نظارے سے ترے
عالمِ برق یہ آئینۂ تصویر میں تھا

چشمِ مردم سے جو عنقا کی طرح چھپ جاتا
کوئی ایسا نہ مکاں چرخ کی تعمیر میں تھا

عمر گذری کہ میں واقف نہیں مے خواری سے
ہاتھ ساقی نے بھی کھینچا مری ناداری سے

پاؤں پھیلا کے لحدِ تیرہ میں سونا بہتر
دم الٹتا ہے شبِ ہجر کی بیداری سے

جب رہی کچھ نہ سکت ضعفِ بدن کے باعث
سانس آئی تھی اگر لب پہ تو دشواری سے

عاشقِ پردہ نشیں ہے دلِ دیوانہ مرا
انس رکھتا یہ نہیں شاہدِ بازاری سے

نیشِ عقرب ہے ہر اک خار یہاں اے مجنوں
پاؤں رکھنا مرے جنگل میں تو ہشیاری سے

قفسِ تنگ میں کہتے ہیں یہ مرغانِ قفس
کب چھٹیں دیکھئے اس رنجِ گرفتاری سے

تختے مضموں کے سدا چیرتا ہوں اس سے حبابؔ
کم نہیں تیغِ زباں اپنی بھی کچھ آری سے

بم پھوٹتے ہیں طوفاں کے مرے دیدۂ تر میں
بہتا ہوں شب و روز سمندر کی لہر میں

صنعت قلمِ صانعِ عالم کی میں دیکھی
ہر نقشۂ نیرنگ سے طاؤس کے پر میں

طے راہِ عدم ہو نہ سکی چلتے ہی چلتے
جوں ریگِ رواں کٹ گئی عمر اپنی سفر میں

یہ خوبیِ قسمت ہے کہ نسیاں کے سبب سے
قاصد نے بھی رکھا نہ مرے خط کو کمر میں

گر عشقِ بتاں دل میں در آوے تو بجا ہے
بے اذن قدم رکھتے ہیں اللہ کے گھر میں

برسوں سے نہیں منزلِ مقصود کو پہنچا
ہر دم فلکِ پیر جو رہتا ہے سفر میں

اللہ ری نزاکت کہ مرا کلکِ تصور ۔ کاغذ پہ لچک جاتا ہی تحریر کر میں
نیرنگیٔ قدرت کے میں قربان کہ جس نے ۔ جاری عملِ حسن کیا جن و بشر میں
گلشن میں اگر تخمِ محبت کو میں بوؤں ۔ اُگ نئے ہی لگے شعلہ ہر اک شاخِ شجر میں
ہے تیغِ زباں عالمِ ایجاد سے اپنی ۔ فرہاد سبق لے گیا تیشے کے ہنر میں
چل جان بہانا سحر و شام کا مت کر ۔ قاصد کو تو دن رات برابر ہی سفر میں

حاذق

حکیم شاہ عالم خاں حاذق تخلص ولد مولوی محمد عالم ابن مولوی محمد عزیز قوم افغان یوسف زئی ساکن شاہجہاں پور، جوانِ دانشمند است در فنِ[1] طبابت بقدر حال استعداد دارد و از چند سال بحکم موزونیٔ طبع خیال بہ گفتنِ شعر ہندی کردہ برائے اصلاح رجوع بہ فقیر آوردہ و اعتقادِ تمام بایں عاصی دارد عمرش بست وہفت سالہ خواہد بود، از وست:

اُٹھ کے میرے پاس سی جسوقت وہ جانی لگا ۔ بیخودی طاری ہوئی ایسی کہ غش آنے لگا
دھیان میں از بس رہا دستِ حنائی یار کا ۔ خونِ دل آخر مری آنکھوں سی برسانے لگا
گور میں بھی اُسکے دھوکے سی فرشتوں کی طرف ۔ کیا خوشی سے اُٹھ کے میں آغوش پھیلانے لگا
آگہی آگے نہ تھی ہرگز اُسے اس چاٹ سے ۔ اب تو مغزِ استخواں میرا ہما کھانے لگا
میں نے گر چشمِ خریداری سے دیکھا اُس طرف ۔ پھول نرگس کا بھی مجکو آنکھ دکھلانے لگا

اے صبا باغ سے خنداں تجھے آنا کیا تھا ۔ موسمِ گل میں اسیروں کو ستانا کیا تھا
ہے شبِ وصل، کرو وصل کی باتیں پیارے ۔ شبِ ہجراں کا بھلا یاد دلانا کیا تھا

---

(۱) در فن طبابت وصرف ونحو استعداد کلی دارد (ن)

روز[1] واں باڑھ دھری جاتی ہے تلواروں پر — کوئی ہوتا ہے خفا اتنا گنہگاروں پر
ذبح کر یا انھیں آزاد کر اس دم صیاد — حالتِ نزع ہے اب تیرے گرفتاروں پر
گرم بازاریٔ خوباں کا خدا خیر کرے — کہیں بجلی نہ گرے اُن کے خریداروں پر

عشق میں جب سے پڑا ہے دلِ ناشاد سے کام — ہے مجھے نے کی طرح نالہ و فریاد سے کام
مثلِ ماہی جو ہوئے حلق بریدہ پیدا — اُن کی گردن کو ہے کیا خنجرِ جلاد سے کام
میں کسی کے قدِ موزوں کا ہوں عاشق تری — نہ مجھے سرو سے مطلب ہے نہ شمشاد سے کام
باغباں سے نہیں وابستہ غرض کچھ ان کی — جو گرفتارِ قفس رکھتے ہیں صیاد سے کام
سفرِ راہِ عدم کیونکہ نہ ہووے آساں — اس میں کچھ راحلہ درکار ہے نہ زاد سے کام
ناخنِ فکر نے کی اپنی وہاں کوہ کنی — نہ نکلتا تھا جہاں تیشہ و فرہاد سے کام
سخت مشکل ہے فنِ شعر کا آنا حاذق — چاہیئے نت رہے شاگرد کو اُستاد سے کام

دیویں گے تجکو کشتۂ الفت دعا نسیم — کوئی تو گل تو ان کی بھی تربت پہ لا نسیم
مجکو یہ پھنسا کے زلف میں جاتی رہی الگ — تو بھی کہیں ہو بستۂ دامِ بلا نسیم[2]

حاجب

حاجب تخلص جوانِ ولایت زاد وجیہہ و خوش گفتار است باوصفِ کم علمی

---

(۱) روز یعنی دن ۔

(۲) نسخہ رامپور میں یہ دو شعر زیادہ ہیں :-

یہ ان دنوں میں عشق نے دیوانہ کر دیا — ہر ایک یگانہ سے مجھے بیگانہ کر دیا
دیکھا جو اپنے عکس کو خوش ہو کے یوں کہا — آئینہ کو بھی ہم نے پری خانہ کر دیا

درگفتن قصائد و مقطعات یدِ طولیٰ داشت چندے بصیغۂ شاعری و سپہ گری ملازمِ نواب وزیر بہادر سعادت علیخاں مرحوم بود، ازوست:-

قطعہ در مدح نواب وزیر

اے خداوندے کہ پیش آب و تاب گوہرت
شب چراغ چرخ می لرزد چو آب اندر زجاج

پایۂ قدرت ازاں زانوئے گردوں پانہاد
کافرینش را نہد بر سر ز اوست فخر تاج

درخمِ چوگانِ حکمت متصل دارد سپہر
مہرہ ساں گرداں دو گو یک ز آبنوس و یک ز عاج

خواستم خواہم کفت راکاں کہ خورشیدم بچشم
گفت کاے کج فہم بیروں کن ز طبع ایں اعوجاج

باکفش کان را چہ حاصل زانکہ در بازارِ فیض
پیشِ وجہِ اوست نقدِ سکۂ من نارواج

اے کشادہ ہمتت بر ساکنانِ دہر در
وے گرفتہ حشمتت از خسروانِ ملک باج

بندہ پرور کامگارا بندہ را فیضِ حضور
تا میسر شد میسر شد بساطِ ابتہاج

تا صفا اندوخت چشمش از جمالت باز رفت
روزگار از چہرۂ صبحش غبارِ شام داج

شکرِ یزداں کش کنوں بنشاندہ فیضانِ حضور
در چنیں روزے کہ خورشیدش بہ شب باشد سراج

تا بہ پرباریش شد قصۂ ابرِ مطیر
تا بہ بے برگی مثل شد گفتگوے سرو و کاج

طالعِ بے حاصلِ خصمِ ترا زحمت قریں
شاہدِ فرخندہ بخت ترا بہجت مزاج

ایضاً قطعہ دیگر

اے وزیرے کز قیاسِ عرض و طولِ حشمتت
عقل را گم گشتہ از سرگشتگی ہوش و حواس

در سطرلابِ خیال اختر شناسِ وہم دید
پایۂ جاہِ ترا بیروں ز امکانِ قیاس

کردہ از قدرت فرازِ لامکاں قدرت مکاں
چیدہ از دستِ بروں از حد کن جاہت اساس

. . . حشمتت گر گم کند نبود عجب
چرخِ اعظم دست و پا در آں میانِ انبوہِ ناس

اشہبے کس ساخت بندد تو بہ وارِ جاہِ تو
قبۂ ترصیعِ چرخش می سزد گوے خطاس

تاجہاں دل درامیدِ لطفِ تو پیوست بست   قابلِ اسرارِ تقدیرے زباں از حرفِ ناس
آں چناں دوراں بدورت کردہ خو با آشتی   کز رم اکنوں طبعِ وحشی آہواں وارد ہراس
بستہ عدلت در جہاں نظمے کہ اکنوں کردہ اند   خاندانِ فتنہ در باہم بگردن ہا پلاس
از کلکت کہ بے چشم است میدارد ہمی   عالمے را از گزندِ چشمِ زخمِ فتنہ پاس
خسروا شاید ترا تشریفِ دولت زانکہ ہست   بر قدِ موزونِ تو شائستہ ایں زیبا لباس
دادخواہا داورا دیرست کیں دورِ فلک   زاضطرابم کرد خود سرگشتہ دارد ہم چو آس
گرچہ قانع تر ز مورم لیک چرخِ واژگوں   مور سانم از عنا دا فگندہ درنغزندہ طاس
ہر طرف کارم ز رنجِ امید اندر راہِ عزم   آیدم از بختِ سرکش پائے بد خرسنگ یاس
قدردانی کو کہ قدرم جوید و اندر سخن   با یانِ فکرت پس بیزانِ قیاس
اوج از لطفِ خداوندم بدی شامل شدی   نو زمانِ انوری و تازہ عہدِ بو فراس
تو خداوندی والحق شایدت گر پروری   بندۂ آنکہ چو بندہ ہم چو بندہ حق شناس
تا زمیں از کاین و فاسد نیرد خالی کند   پشت در روئے خویش را ز انواعِ نقد و جنسِ پاس
دشمنِ جاہِ ترا خالی ز نقدِ عمرِ کیش   ساقیٔ بختِ ترا مشحون ز راہِ عیش کاس

حشمت

حشمت علی خاں حشمت تخلص ساکنِ رامپور خلف الرشید عباس علی خاں، جوانِ خوش فکر است شعرِ خود بہ نظرِ قبلہ گاہیٔ خود میگذارند عمرش تخمیناً بست وہفت سالہ خواہد بود، از دست:

ہوئے ہیں تم سے لگا دل رقیب غیروں کے   غضب ہی جس یہ نہیں تم حبیب غیروں کے
ستم شعار جفا جو یہ کیا غضب ہے کہ تو   بعید مجھ سے ہو بیٹھے قریب غیروں کے

آوارہ کو بکو جو پھرے ہے تو حشمتؔ اب   ایسی تجھے ہے کونسے انسان کی تلاش

حرماں

میر حسن حرماں سید صحیح النسب بمقتضائے موزونیٔ طبع چیزے موزوں می کند اصلش از شاہجہاں آباد است بزرگانش نوکریٔ خانۂ بادشاہ کردہ اند بہ سبب ظریف الطبعی گاہ گاہے شعر خندہ آور ہم می گوید عمرش از چہل تجاوز خواہد بود، از وست :-

تم جو مرکب کو صنم نجد میں جولاں کرتے | سیکڑوں قیس سے اٹھ چاک گریباں کرتے
اشک بدذات وہ ہیں رونے کا گر ہوتا حکم | اک جھڑی باندھتے ایسی ہی کہ طوفاں کرتے
وصل گر ہوتا نصیبوں میں تو کیا ناداں تھے | ہم جو اپنے تئیں مشہور بہ حرماں کرتے

ردیف (خ)

خرّم

امام الدین احمد خرم تخلص خلف الرشید شیخ رضی الدین عرف غلام مرتضیٰ سری جوانِ صالح و مہذب الاخلاق است ، از بست سال طبع سلیمش استفادۂ نظم فارسی از پدرِ خود کردہ عمرش تا امروز سی و پنج سالہ است درایامیکہ قصدِ گفتنِ شعر ہندی نمودہ برائے مشورۂ آں بہ فقیر ہم رجوع آوردہ و ماسوائے ایں از مدتِ مدید از تہ دل خیر خواہِ راسخ الاعتقادِ این عاصی است ، از کلامِ فارسی و ہندیش ہر دو نوشتہ می شود از وست :-

بیزار گشت کعبہ و دیر از گناہِ من | اکنوں بجز درِ تو نباشد پناہِ من
زاں نیلی است چادرِ گردوں کہ در ازل | عکسے فتادہ بود ز بختِ سیاہِ من

تا کجا از دل کشم این نالہ ہائے سرد را — یا بجاناں جاں رسان و یا بدرماں درد را
تا ودہر جا کہ خواہد در جہاں چوں گردباد — ما بدستِ باد بسپردیم مشتِ گرد را

مرا بہ آں دہنِ تنگ یک سخن باقیست — جہاں بکام رسید است و کامِ من باقیست
زبے سبب پر پروانہ در لگن ماند است — نشانِ سوختنِ شمع انجمن باقیست[1]

خورشید

لالہ لچھمی رام پنڈت مدرس اہلِ خطہ، جوانِ قابل و دانا بود، و خورشید تخلص میکرد ہفت و ہشت سال است کہ بہ کلکتہ رفتہ بود، ہمانجا وفات یافتہ عمرش تخمیناً چہل سالہ خواہد بود، از وست:-

خون شد از غم جگرِ من خبرے نیست ترا — نالہا کردم و در دل اثرے نیست ترا
بروئے اشک بروبر اثر خویش ملاف — آزمودیم کہ طفلی جگرے نیست ترا
دعوئے عاشقی اے لالہ بہ گلزار مزن — خشک داغیست بدل چشم ترے نیست ترا

خطا

ملا محمد کتاب خواں خطا تخلص شخصِ اہلِ ایران است، خطبہ و کتابِ جناب سید الشہدا علیہ السلام بسیار بہ لہجۂ درست میخواند و دریں کار در معاصرینِ خویش نظیر نہ دارد جمہور بریں متفق اند و ماورائے آں در نثر و نظم خود ہم رخشِ طبیعت را بمیدانِ فصاحت بہ آہنگ

---

(۱) نسخہ رامپور میں خرم کا یہ ایک ہندی شعر درج ہے جو اس نسخہ میں نہیں۔
قیس کی طرح نہ کیوں چاک گریباں کرتے — ہم بھی عاشق تھے نہ کیوں خاطرِ یاراں کرتے

جولاں میدہد۔ امابیشتر در روایاتِ شہادتِ حضرت امام حسینؑ، از وست :۔

ہمدمِ موئے اوشدی مشکِ خطا تو کیستی | محرمِ بوے اوشدی بادِ صبا تو کیستی
بودہمیشہ خونِ من رونقِ پنجہ ہائے او | جانِ مرا کہ سوختی رنگِ حنا تو کیستی
اینکہ ہمیشہ چوں خطا در قدمش فتادہٗ | رشتۂ عمرِ من نۂ زلفِ رسا تو کیستی

خادم

خادم علی خادمؔ تخلص :۔

یار جا پہنچے اپنی منزل کو | ہم ابھی باندھتے ہیں محمل کو
دم کے لینے کی بھی نہ دی فرصت | آفریں ہے ہمارے قاتل کو

خان(۱)

اشرف علی خاں خانؔ تخلص ولد محمد علی خاں وزیرِ دہلی ابنِ محمد روشن خاں مخاطب بہ نواب روشن الدولہ قوم افغان خٹک بزرگانش سکنۂ شاہجہاں آباد خودش بہ لکھنؤ تولد و نشو ونما یافتہ فقیر با والدش از زمانۂ ملازمتِ صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ بہادر از مناسبت کہ مردِ شجاع وخوش تقریر ہمیشہ مقربِ سلاطین بودہ است الحال در سرکارِ جناب عالی در سوارانِ بنارس عزو امتیاز تامے وارد۔ در فنِ سپاہ گری بہ سواری و در نیزہ بازی یکۂ روزگار، چوں گفتنِ شعر دلش بہ سوئے خود کشیدہ باشارۂ پدرِ خود در حلقۂ تلامذۂ فقیر در آمدہ، در مشقِ چہار پنج سال از ہمسرانِ خود گوئے سبقت بردہ حق تعالیٰ زندہ دارد یقین کہ بے مثل خواہد بود عمرش بست و پنج سالہ است، از وست :۔

---

(۱) یہ نسخہ رامپور میں اشرف علی خاں کا ذکر ہے جو اس نسخہ میں نہیں ہے۔

الفت میں جفا کار و پرفن نظر آیا　　سمجھے تھے جسے دوست وہ دشمن نظر آیا

نام تیرا ہے گو کہ اشرف خاں　　سب سے بدتر جہان میں تو ہے

میں نکل جاؤں کہاں دستِ دلِ ناشاد سے　　مردمِ ہمسایہ نالاں ہیں مری فریاد سے

دیوانگی میں بھی مجھے اتنا تو ہوش ہے　　تصویر کی پسند تو تیری پسند کی

ہر بات پہ کہتے ہو کہ دیوانہ ہے یہ بھی　　ہر بات پہ گالی کوئی یارانہ ہے یہ بھی

کبھی کاٹا گلا خنجر سے گہہ تیغ دو آبی سے　　مجھے قاتل نے مارا دیکھنا کس کس خرابی کر

ردیف (د)

دردمند

محمد فقیہہ دردمند تخلص شاگردِ مرزا مظہر جان جاناں در زبانِ فارسی و ہندی فکر میکرد، از وست :-

کیا ہم کو ڈراتا ہے شمشیر و سپر بستہ　　جی دینے کو بیٹھے ہیں اب ہم بھی کمر بستہ

دوست

شیخ غلام احمد دوست تخلص مقطعے خوش دارد :-

خدا حافظ ترا اے دوست تو اس طرح رہتا ہے کہ ہوتا ہے جگر فولاد کا بھی دیکھ کر بانی

دانا

فضل علی داناؔ تخلص :-

بہر صورت خدا کو دیکھنا عنوان ہے میرا یہی توحید میں مصرع سر دیوان ہے میرا

دل

محمد عابد دلؔ تخلص :-

مرتا ہے ابر اس مژۂ اشکبار پر کھاتی ہے شمع گل جگر داغدار پر

بیزار اس قدر جو ہوئے میرے نام سے فرمائیے حضور ہوا کیا غلام سے

ردیف (ذ)

ذکا

میرزا محمد بخش ذکاؔ تخلص جوانِ خوش تقریر و مہذب الاخلاق است و بمقتضائے موزونیٔ طبع چیزے کہ موزوں میکند آنرا بروئیہ میر سوز بہ نظرِ اصلاحِ مرزا خانی نوازش تخلص گزرانیدہ، دور ایامِ مہاجرتِ استادِ خود چندے بہ پیشِ شیخ امام بخش ناسخ ہم کلام خود بردہ بزیورِ اصلاح عروسِ غزل را گلے ساختہ عمرش تخمیناً قریب چہل خواہد بود۔ از انتخابِ بیاضِ اوست من روئیہ سوز :-

جو ہوا شیفتہ اُس کا سو بہت خوار ہوا — دل بھی میرا اُسی گیسو میں گرفتار ہوا
تندرستی میں تو مجھ سے تجھے پرہیز رہا — اب توانائی کہاں جب کہ میں بیمار ہوا
زندگانی سے ذکا انپی میں آیا ہوں تنگ — آہ کیوں مجکو خیالِ دہنِ یار ہوا

مری جانب الٰہی کون خوش رفتار آتا ہی — کہ جس کے پانوٴں کے کھٹکے میں دل قربان جاتا ہی
میں صدقے اس تری شرم وحیا کے او مرے مرزا — تو کیوں غیروں میں مجکو دیکھ کر ایسا لجاتا ہی
ذرا ہٹ کر مرے پہلو سے بھائی غم اُدھر بیٹھیو — تمھاری ہم نشینی سے تو میرا جان جاتا ہی
ڈھٹائی دیکھیو دیدے کی جب میں مانگتا ہوں دل — مکر جاتا ہے اور اُلٹی مجھے گھُڑکی بتاتا ہی
لڑکپن پر نہ جانا اُس کے ہرگز اے دلِ شیدا — وہ لڑکا ہی جو داناوٴں کو باتوں میں اُڑاتا ہی
ہجوم مردماں ہی اس لئے آج اُسکے کوچہ میں — ذکا سا بے گنہ ہاتھوں سے اُسکے سر کٹاتا ہی

من روتیہ عام

وائے مایوسیٔ قسمت کہ چمن میں ایک دم — سیر ہم کرنے نہ پائے کہ گرفتار ہوئے
اب نہ تو چھوڑیو اے دستِ ہوس دامنِ یار — ایسے جھوٹے تو کئی وصل کے اقرار ہوئے
اُس سے کس منہ سے کروں آہ سوالِ بوسہ — بات کرتا ہوں تو کہتا ہی بہت یار ہوئے
کیوں نہ ہو خدمتِ ناسخ سے شرف مجکو ذکاؔ — شعر میرے بھی زمانے میں نمودار ہوئے

ذوق

منشی آسارام ذوقؔ تخلص :-

دل تو کہے ہی آنکھوں نے مجکو کیا خراب — آنکھیں کہیں ہیں دل ہی نے مجکو ڈبا دیا
بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے ذوقؔ مفت میں — دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

ذوق

شیوہ پرشاد ذوق تخلص پسر چودھری وزن کشاں معرفتِ مولوی مظہر علی بہ حلقۂ شاگردی فقیر درآمدہ و فنِ شعر رانی الجملہ آموختہ و دیوان جمع نمودہ ازبسکہ در مزاجِ او شورشے ہست، بعض(۱) مردم ہجو کردہ غرض تخمیناً بست و پنج سالہ خواہد بود، از وست:

کھنچنے پایا نہ وہ میان سے صمصام تمام — ہوگیا جنبشِ ابرو میں مرا کام تمام
سیر ہو سیرِ چمن کرنے نہ پایا میں، جلد — موسم گل کے صبا ہو گئے ایام تمام
دیکھنے پایا نہ میں رنجِ اسیری صیاد — ہوگیا مرغِ دل آتے ہی تہِ دام تمام
کیا قیامت کا ہے دن یہ نہیں معلوم مجھے — روزِ ہجراں کی جو ہوتی ہی نہیں شام تمام
دشمنی دیکھیو ٹک اس بتِ سفاک کی ذوق — قتل اس نے تو ہمارے کئے ہم نام تمام

ہمارے ہم صفیروں کے پڑے ہیں — پسِ دیوارِ گلشن پر ہزاروں
یہ لاشہ کس کا ہے قاتل کھڑے ہیں — کمر بستہ جو شیون پر ہزاروں
کیا تھا ذبح کس کو قطرۂ خوں — پڑے ہیں تیرے دامن پر ہزاروں
ہے کس گنتی میں تو اے ذوق تجھ سے — فدا اس شوخِ پُرفن پر ہزاروں

ہم سے محفل میں کیا اس نے نہاں کیا کیا کچھ — رات بھر ہم نے کئے دل میں گماں کیا کیا کچھ
ایک ہووے تو اسے دیویں ہم اے یار جواب — ہم کو کہتا ہے ہر اک پیر و جواں کیا کیا کچھ
تھا تنک ظرف میں ایسا نہ مجھے ہستی میں — پی کے مے تم نے کہا رات میاں کیا کیا کچھ
رحم آیا نہ اسے تو بھی مرے حال پہ ٹک — قصۂ ہجر کیا میں نے بیاں کیا کیا کچھ

---

(۱) بعض مردم را ہجو ہم کردہ (ن)

کیفیت اُس کی بیاں کس سے کریں اب اے ذوق ‏ دیکھتے ہم ہیں تماشائے جہاں کیا کیا کچھ

گور پر جس کے وہ ذرا ہو گئے ‏ سیکڑوں واں فتنے بپا ہو گئے
عشق میں ہم تیرے صنم جوں ہلال ‏ خلق میں انگشت نما ہو گئے
بر سرِ رحم آ تو گیا رات یار ‏ عقدۂ دل سب مرے وا ہو گئے
پہر تماشا جو گئے ذوق مفت ‏ ہم ہدفِ تیرِ بلا ہو گئے

چلنے سے پاؤں جب رہِ الفت میں تھک گئے ‏ ہمراہی سارے چھوڑ کے مجکو سرک گئے
بیداری کا کریں شبِ ہجراں کی کیا بیاں ‏ آگے ہمارے دیدۂ انجم جھپک گئے
غیروں سے ہو رہے تھے کھڑے ہم کلام وہ ‏ دیکھا جو مجکو دور سے آتے سرک گئے
پیچھا چھڑانا ہوگا تجھے اے فلک محال ‏ دامن میں تیرے خار سے جب ہم اٹک گئے
اُس رشکِ گل کی آن و ادا دیکھ باغ میں ‏ مرغ اسیرِ کنج قفس میں پھڑک گئے
آگے سے اُسکے پاؤں اٹھاؤں میں کس طرح ‏ خورشید و مہ بھی دیکھ کے جس کو ٹھٹک گئے
ہوں اُسکے یہاں کا طفلِ دبستاں میں ایک ذوق ‏ اس فن میں جس سے شیرِ نیستاں دبک گئے

ذہین

ذہین تخلص قوم کایتھ طفلِ نو رسیدہ شاگردِ لالہ چھنو لال طرب کہ حالا دلگیر تخلص می گذارد مرثیہ وسلام می گوید نامی درمرثیہ گوئی پیدا کردہ عمرش تخمیناً شانزدہ سالہ خواہد بود، ازوست:-

کوئی ناز و ادا پر غش ہو کوئی اسکی چتون پر ‏ ذہین اک ہم فقط مرتے ہیں اُسکے ڈومنی پن پر
ذرا پاسِ ادب دیکھو میں وقتِ ذبح گو تڑپا ‏ نہ میرے خون کی چھینٹیں پڑیں اُسکے دامن پر

خیالِ خام پہ مرنا عبث ہے اے ذہین اب تو — عیادت کو نہ آیا جو وہ کب آتا ہے مدفن پر

ذاکر

میاں بشارت اللہ عرف محمد زکریا ذاکر تخلص ولد شیخ ہدایت(۱) قوم قدوائی ساکن بسوہ جوانے طالب علم است اکثر کتب عربیہ و فارسی را دیدہ بہ تعلیم و تعلم اوقات بسر بردہ پیش ازیں چند سال پیش فقیر ہم برائے خواندنِ قصائد عرفی می آید دراں روزہا چیزے کہ از ہندی و فارسی موزوں کردہ بہ نظرِ فقیر گذرانیدہ اعتقادش بہ فقیر زیادہ از شاگردانِ دیگر است و از انجاست کہ گفتہ اند دورانِ بابصر درحضور و حضورانِ بے بصر دور، ازوست :-

دیکھی جو اس کے ابروئے خمدار کی شبیہہ — آنکھوں میں اپنی پھر گئی تلوار کی شبیہہ

تری چشمِ شوخ سے کب بشر کوئی چشم اپنی ملا سکے — جو نگاہ بھر تو نظر کرے تو پری بھی پر نہ ہلا سکے

ردیف (ر)

رعنا

شیخ عبدالرحیم ولد شیخ عبدالکریم متوطنِ شاہجہاں آباد(۲) از سی سال بہ لکھنؤ رسیدہ جوان صلاحیت شعار و موزوں طبع است، رعنا تخلص می گذارد و انچہ گفتہ بہ نظرِ فقیر میگذارد، ازوست:-

زلفیں بکھرا کے کسی نے پھر کیا جادو مجھے — جو پریشانی لئے پھرتی ہے ہر اک سو مجھے

ایک تو یاد آرہا ہے وصل کا اس دم سماں — دوسرے تڑپا رہی ہے برق تو یک سو مجھے

---

(۱) شیخ ہدایت اللہ (ن) (۲) بزرگانش اہل خطہ - (ن)

نورِ مہ اُس کے روبرو کم ہے　　چشم بد دور کیا ہی عالم ہے

لاتا ہوں نقدِ جاں کو سو یہ واں نہیں قبول　　نذرِ گدا بحضرتِ سلطاں نہیں قبول
ناصح جو ہم سے اُلجھے تو اُلجھے وے ہیں　　ہونا کسی سے دست و گریباں نہیں قبول
اللہ رے تیرے دستِ حنا بستہ کا خیال　　جس کو سلامِ پنجۂ مرجاں نہیں قبول

زبس بحرِ غم رات تھا شور و شر پر　　رہی آستیں صبح تک چشم تر پر
نہ آیا وہ بت اور موئے ہجر میں ہم　　پڑیں پتھر اے آہ تیرے اثر پر
صبا گل تو آپ ہی قریبِ فنا ہے　　نہ مار آستیں اُس چراغِ سحر پر
یہ اکسیرِ حسن اُس کی ہے پرتو افگن　　کہ ہے رنگِ شنجرف عقدِ گہر پر
اسی بحر میں کہہ غزل اور رعنا　　کہ ہو آفریں جس کے ہر شعرِ تر پر

موا آہ بھر بھر کوئی تیرے در پر　　نہ آیا تجھے رحم اُس نوحہ گر پر
اسے یونہیں رہنے دے جراح چندے　　نہ خشکی کا مرہم لگا داغِ تر پر
یہ حسرت رہی مجکو نخلِ تمنا　　نہ آیا کبھی برگِ حسن ثمر پر
گئے بانکپن بھول دلّی کے بانکے　　نظر کی جو کافر کی ترچھی نظر پر

اگر اُس شعلہ رو کی دیکھ پائیں برق چھل بلیاں　　تو جائے بھول اپنی چرخ پر کرتی وہ چلبلیاں
پریشانی تری زلفِ سیہ کی اے مہِ تاباں　　نہ چھانا کون سا کوچہ نہ دیکھیں کونسی گلیاں
شب اُسکے فندقِ پا کا چمن میں ذکر جو آیا　　چھپا کر منہ کو پتوں میں ہیں جیسے رہ گئیں کلیاں
تصور میں ہمیں اُس گل کے خواب آتا نہیں مطلق　　خدا جانے کہ رعنا کیا کریں گی دل کی بے کلیاں

کیوں خالِ سیہ جاناں! عارض پہ بناتے ہو — اس چاند سے مکھڑے کو کیوں داغ لگاتے ہو
نے وصل کی خواہش ہے نے بوسہ کے طالب ہیں — اس دور کے ملنے پر کیوں آنکھ چراتے ہو
جب آؤ نظر مجکو بگڑی ہی کہ بنے صاحب — دل کو مرے بھاتے ہو دلکو مرے بھاتے ہو
تم وقت میں اپنے بھی کیا کم ہو مسیحا سے — اندازِ تبسم میں مردوں کو جلاتے ہو
کس واسطے پہنے ہو یہ بدھی اور ہار اتنے — کیا پھول سے پنڈے کو پھولوں میں بساتے ہو
یہ چاند نہیں ہے وہ بدلی میں جو چھپ جاوے — کیوں چاند سے مکھڑے کو بالوں میں چھپاتے ہو
انصاف کرو اس میں ہے کام رفو گر کا — چاکِ جگرِ عاشق غیروں سے سلاتے ہو
مرغانِ چمن ناحق فریاد و فغاں کر کے — وہ نیند کا ماتا ہے کیوں اسکو جگاتے ہو
سنتے ہو میاں رعنا کچھ ہوش گیا ہے کیا — وہ فتنۂ عالم ہے دل کس سے لگاتے ہو

رشید

نواب نصیر الدولہ رشید تخلص خلف الرشید نواب عماد الدولہ عرف غازی الدین خان مرحوم، جواں مہذب الاخلاق از مدتِ مدید در کاملی استقامت دارد بمقتضائے موزونی طبع کہ موزونست نظمِ اشعارِ فارسی را بسر انجام می رساند انچہ ازو بہم رسیدہ این ست:-

در جہاں شاد آنکہ نبود جانِ ناشادِ من است — ہر چہ دایم از اثر خالی است فریادِ من است
اے کہ دارد در کمر تیغ و بکف خنجر رشید — دشمنِ دین و بلائے جان و جلادِ من است

رحم کن بر حالِ زارم آہ و زاری را ببیں — زلف را بر رخ بیفگن بیقراری را ببیں
گشت پا جور رشید بے سرو پا را و لے — شکوہ از جورش نہ دارد رازداری را ببیں

خوش گردنے کہ کرد پسندش کمندِ تو — اے واے ہر کسے کہ رہا شد ز بندِ تو

آشوبِ رستخیز زند بوسہ بر رکاب | جولاں کند دمے کہ بمیداں سمندِ تو

بر نقشِ منِ خستہ چو آں شوخ گذر کرد | از یک سرِ پا زندہ مرا بارِ دگر کرد

زخونم رنگِ داماں تازہ کردی | دگر داغِ رقیباں تازہ کردی
رہا کردی اسیرانِ بلا را | غم و اندوہِ زنداں تازہ کردی
پس از قرہا دو مجنوں ای دلِ زار | تو طرزِ شور و افغاں تازہ کردی
بخوں خود را کشم اے مایۂ جاں | بدشمن عہد و پیماں تازہ کردی
مرا کشتی تو باشی در جہاں شاد | کہ راہ و رسمِ خوباں تازہ کردی
رسانیدی صبا پیغامِ وصلش | منِ دلدار را جاں تازہ کردی
غزل گفتی کہ در سفتی رشیدا | تو نامِ ہند و ایراں تازہ کردی

راغب

میرزا کریم بیگ راغب تخلص ولد میرزا بربیگ ساکن بلدۂ لکھنو جوانِ ظریف طبع و شوخ مزاج بود سہ سال کلامِ موزونِ خود را از نظرِ مرزا خانی نوازش گذرانیدہ، پنج سال است کہ بطرفِ حیدر آباد آوردہ شدہ رفتہ، ہیچ احوال او معلوم نیست۔ عمرش تخمیناً بست و ہفت سالہ خواہد بود، از وست :۔

وہ لڑکر ہم سے شادی کے بہانے | لگے غیروں کے گھر چھپ چھپ کے جانے
گلے آکر لگا یا دل ربا نے | مجھے یہ دن دکھایا پھر خدا نے
سوئے عشاق آ، او ناوک انداز | یہی ہیں تیر آفت کے نشانے
مرے قصے کے ہوتے اُسکے آگے | عزیزو مست کہو پچھلے فسانے

ہے بندہ آج کل ہی قیس و فرہاد | یہی اللہ کے ہیں کارخانے
پریشاں ہے پری رویوں کا کوچہ | نہ اس کو چھوڑ اے راغب دوانے

کہتی آپس میں تھیں ہو بلبلیں نالاں کئی | اے خزاں تو نے اجاڑے ہیں گلستاں کئی

راحم

میر علی محمد راحم تخلص شاگرد میاں عطا[1] بزرگانش سکنۂ شاہجہاں آباد و خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ و اکثر مشق سلام کردہ از سر رشتۂ شعر و شاعری چنداں واقف نیست روزے در غزل طرحی فقیر کہ پیش ازیں بروش تقرر داشت چیزے موزوں کردہ آوردہ بود عمرش بست و چہار سالہ خواہد بود، از وست:-

دیوار کے روزن میں سے جو اس کی پڑی آنکھ | دو چار گھڑی اس کی مری خوب لڑی آنکھ
پہلے تو لگاوٹ سے کیا پیار بہت سا | پھر بعد کئی دن کے دکھائی یہ کڑی آنکھ
ارمان مرے دل کے نکل جائیں یہ سارے | گر تیری رہے سامنے دو چار گھڑی آنکھ

رسا

میرزا محمد نقی رسا تخلص گویند از نوادہائے مرزا معز فطرت است، طبعے رسا و ذہن ذکا دارد و بندہ ہم ہنوز او را ندیدہ آنچہ از کلامش بہم رسیدہ این است، دیگر از احوالش مفصل معلوم نیست:-

ساقی کے لگا منہ سے جو پیمانہ چمن میں | شیشے نے کیا سجدۂ شکرانہ چمن میں

---

(۱) میاں عطا مرثیہ گو بزرگانش سکنۂ دہلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یافتہ و سلام و مرثیہ می گفت از غزل نابلد بود (ن)

کیا پائی ہے بولے شہِ گل تیری صبا نے — جو پھرتی ہے ہر صبح گدایانہ چمن میں

کر یاد، ترے قد کی، کل اک سرو کے نیچے — پہروں پڑا رویا دلِ دیوانہ چمن میں

جب سے وہ بتِ شوخ لگا باغ میں جانے — ہے نامِ خدا رونقِ بت خانہ چمن میں

بے پردہ صبا کھول نہ غنچے کا گریباں — کیا دیدۂ نرگس نہیں بیگانہ چمن میں

لکھ رکھا ہے گن کر ورقِ گل پہ قضا نے — بلبل تری قسمت کا جو ہے دانہ چمن میں

اُس تک نہیں ہو سکی رسا تیری رسائی — جانا نہ جہاں بیٹھا ہے جانانہ چمن میں

جو کام کہ ہم نے رخِ(۱) جاناں سے نکالا — سو خضر نے کب چشمۂ حیواں سے نکالا

اُس شاخ کو پھر صاف قلم کرتا ہے گلچیں — جس شاخ نے سر نخلِ گلستاں سے نکالا(۲)

رند

حمزہ علی رند تخلص۔

سینے سے داغِ عشق مٹایا نہ جائے گا — ہم سے تو یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

فائدہ کیا ہم کو گر گلشن میں آتی ہے بہار — بن مئے و معشوق کس کافر کو بھاتی ہے بہار

راغب

جعفر خاں راغب تخلص۔

---

(۱) لبِ جاناں (ن)

(۲) نسخہ رامپور میں یہ دو شعر زیادہ ہیں۔ (ن)

مر جائیگا جوں ماہیِ بے آب تڑپ کر — جس نے مجھے قیدِ غمِ ہجراں سے نکالا

رونا مری آنکھوں سے لیا خلقِ خدا نے — ہنسنا تو تمہارے لبِ خنداں سے نکالا

یہ شب تری فرقت کی نپٹ ہم پہ کڑی ہے
ہر اُس کی گھڑی روزِ قیامت سی بڑی ہے

قصہ نے ترے دل کے مرے جی کو جلایا
اس سنگ سے کیا آتش جاں سوز جھڑی ہے

دیوانہ کیا آپ سا میں اُس کو بھی راغب
بیٹھا مری صحبت میں کوئی ایک گھڑی ہے

رفعت

شیخ محمد رفیع رفعت تخلص۔

کیا جگر ہے جو ترے در پہ فغاں کرتے ہیں
ہم تو آہستہ قدم رکھتے یہاں ڈرتے ہیں

رستم

احتشام الدولہ رستم علی رستم تخلص۔

اُس کو مجھ سے جدا کیا تو نے
اے فلک ہائے کیا کیا تو نے

راسخ

غلام علی راسخ تخلص، از وست :-

شب جو اُس ماہ سے روشن مری آغوش ہوئی
شمع یہاں تک ہوئی شرمندہ کہ خاموش ہوئی

نہ رکھو مرے سر پہ تم ہاتھ جاؤ
سمجھتا ہوں میں سب[1] یہ جھوٹی قسم ہے

ہوں ہم آغوش تجھ سے سب کوئی
کس طرح دیکھے یہ غضب کوئی

---

(۱) بھی۔ دن،

اب تک تجھے رآسخ سی وہی بیخبری ہو — جا دیکھ شتابی وہ چراغ سحری ہے
گل برگ کے مانند کروں چاک میں کیونکر — یارب مرے سینے میں یہ کیا آگ بھری ہے

رفعت

مولوی غلام جیلانی رفعتؔ تخلص، ساکن رامپور مردِ جامع الکمالات شاگردِ مولوی قدرت اللہ شوقؔ است، عمرش شصت سالہ خواہد بود، از وست:-

اُٹھ گیا رات جو اُس ماہِ جبیں کا پردہ — ہو گئی چادرِ مہتاب زمیں کا پردہ
نظرِ عشق سے محجوب نہیں جلوۂ دوست — پردۂ چشم ہے اُس پردہ نشیں کا پردہ
شمع کافوریِ ساقینِ مصفا سے تری — پرِ پروانہ بنا دامنِ زیں کا پردہ
دیکھ کر اُس مہِ تاباں کا زمیں پر جلوہ — پھٹ گیا مثلِ کتاں چرخِ بریں کا پردہ

کچھ نہ ہم سے سادہ لوحوں سی ہوا جوں آئینہ — غیر کے رفعتؔ مگر عیب و ہنر دیکھا کئے

ٹالتا ہی وصل کے وعدے پہ وہ برسوں مجھے — روز بتلاتا ہے ظالم آج کل پرسوں مجھے

یار نے جب غزلِ تازہ سنائی مجکو — موتِ بلبل دہنِ غنچہ سے آئی مجکو
نکہتِ گل ہوں قفس میں ہی مری خاطر جمع — ہے پریشانیِ دل تجھ سے رہائی مجکو
دشت میں شوخیِ آہو نہ سمجھ کرتا ہے — ادب آموز جنوں چشم نمائی مجکو
منقلب کارِ دو عالم نظر آیا رفعتؔ — جب سے وہ نرگسِ جادو نظر آئی مجکو

رسم

مرزا امام بخش رسمؔ تخلص گویند کہ پیش ازیں کایتھ بود از چندے بہ حلقۂ اسلام

درآمد۔ دبمقتضائے موزونیٔ طبع درابتدا چیزے کہ موزوں می کرد بہ نظرِ میرزا قاسم رقت مرحوم می گذرانیدہ چوں استادش از چند سال ودیعتِ حیات سپردہ زندگانی را جواب دادہ حالا بطورِ خود راہ میرود عمرش تخمیناً از سی سال تجاوز خواہد بود، از وست :۔

جاتے ہیں حواس اپنے کچھ بھید نہیں کھلتا
اُس پاس سے کیوں قاصد با چشم پر آب آیا

دن کو دلِ ناداں آرام نہ دے ٹک کرنے
ہمسایوں کو شب تیرے نالوں سے نہ خواب آیا

آتا نہیں وہ کلبۂ احزاں میں ہمارے
اے نالۂ شبگیر ہوا تیرا اثر کیا

کر آئینۂ دل کی مرے دید ذرا تو
اس آئینے میں دیکھ تو آتا ہے نظر کیا

جب آٹھ پہر عشق کرے خانہ خرابی
آباد ہو اے رستم مرے دل کا نگر کیا

نہیں پڑھتا ہے میرا سیم بر خط
لکھا ہمدم میں اس کو بیشتر خط

قیامت پر ہے شاید وعدۂ وصل
جو لایا نزع میں پیغامبر خط

گیا ہے نامہ لے قاصد یہ ہے سوچ
نہ لاوے رستم کچھ رنگِ دگر خط

تہلکہ ہوئے نہ کیونکر مرے سب یاروں کو
کل وہ کہتے تھے کرو قتل گنہگاروں کو

کیا یہ انداز خوش آئے ہیں ستمگاروں کو
بے گنہ قتل کریں بخشیں گنہگاروں کو

جی میں ہے مصر کے بازار میں لیجا کے تجھے
خوب سا چھیڑئے یوسف کی خریداروں کو

رند مشرب ہیں ہمیں کام کسی سے کیا رستم
کافروں کو نہ برا سمجھیں نہ دیں داروں کو

رغبت

جلال الدین خاں خلفِ شجاع الدین خاں رغبت تخلص، ساکن مرادآباد، از

تلامذۂ ذوقی رام حسرت تخلص مسن و نابیناست. شوقِ شعر و نثر نویسی ہر دو بہ شدت دارد عمرش شصت سال رسیدہ، از وست:-

نقطۂ صفر ہے اس ماہ کا خالِ گردن | جس نے دوچند کیا حسن و جمالِ گردن

ہم نوایانِ چمن تم تو کرو سیرِ بہار | ہم پھر آئیں گے قفس سے جو رہائی ہوگی

روح

میر شجاع الدین روح تخلص شاگردِ مرزا قاسم علی رقت مرحوم جوانِ مہذب الاخلاق است بافقیر بسیار معتقدانہ پیش می آید از متوسلانِ خواجہ باسط معلوم می شود۔ عمرش از سی متجاوز خواہد بود، از وست:-

شیفتہ کس پہ ہے تو اٹکا ہے تیرا دل کہاں | سچ بتا ہم کو ہوا ہے روح تو مائل کہاں
دار پر کھینچا گیا منصور اپنے ہاتھ سے | حق کے آگے ہو فروغِ دعویِ باطل کہاں
سروِ گل کو قد و عارض سے نہ کر یا بالِ رنگ | بے گناہوں کا روا ہے خون اے قاتل کہاں
بن سنے جیا ہے کہ چھٹکارا اسے دشوار ہے | روح تو آکر ہوا ہے قیدِ آب و گِل کہاں

نکلے ہو آج گھر سے یہ کس آب و تاب سے | ڈھانکا ہے آفتاب نے منہ کو سحاب سے
بولے فرشتے دیکھ مرا نامۂ عمل | فارغ نہ ہوگا یہ کبھی اپنے حساب سے
اے دل میں غش ہوں صندلی رنگوں کی قید | کیوں دردِ سر نہ ہو مجھے بوئے گلاب سے

بادہ ہے، ساقی ہے، مینا ہے، صنم ہے شب ہے | کس قدر آج مساعد نظرِ کوکب ہے
خط ترا سبزہ ہے قطرے ہیں عرق کے شبنم | دہنِ مار ذقن مہرہ ترا غبغب ہے

مے پرستی پہ نہ کیوں جان فدا ہوئے روح　　خاکِ میخانہ سے میرا یہ بنا قالب ہے[1]

رافت

میاں رؤف احمد رافت تخلص، پیرزادہ سرہندی جوانِ غریب و مسکین است پیش ازیں چند سال در زمانِ عہدِ جناب نواب آصف الدولہ از رامپور بہ لکھنؤ گذار افگندہ به ملاقاتِ فقیر آمدہ بود، ارادۂ تلمذ در دل داشت و می خواست، دراں رہ نوردیِ سفر کہ وقفۂ ماندن در شہر چنداں نبودش، کلامِ شکستہ بستۂ خود را بپائے خامۂ اصلاحِ من درآورد، بعد چند روز شاگرد جرأت شدہ پیشِ عاصی برائے رخصت باز آمدہ یک دو جزو از دیوانِ خود بر دست داشت در مزاجش وحشتے و تلونے بود عمرش سی و چہار سال سمع رسیدہ، از وست :-

دمِ وداع یہ کہنا ہی کیا غضب اُس کا　　کہ ہم تو جاتے ہیں رافت ترا خدا حافظ

جراح مرے زخم کو سینے کے تو سی مت　　یہ جھانکنے کو دل کے جھروکا ہے غنیمت

ردیف (ز)

زیبا

میاں عبدالرحیم زیبا تخلص ولد خواجہ محمد سخی متوطنِ شاہجہاں آباد[2] اصلِ بزرگانش

---

(۱) نسخہ رامپور میں یہ دو شعر زیادہ ہیں۔

گل چاک گریباں ہے تیری گلبدنی سے　　دل تنگ ہے غنچہ کا تیری کم سخنی سے

گو جرم میرے حد سے زیادہ ہیں پہ لے روح　　امیدِ شفاعت ہے رسولِ مدنی سے

(۲) دہلی۔ (ن)

کشمیر است، از بست سال بہ لکھنؤ رسیدہ، جوانِ مہذب الاخلاق و غریب و باصلاح وسداد ویدمش و خود معاش بہ علاقہ بندی کردہ و می کند و اجدادش تاجرِ پشمینہ بود، بمقتضائے موزونیٔ طبع از دوازدہ سال چیزے موزوں می کند و آنرا بہ نظرِ فقیر می گذارند و باوصفِ کم علمی، طبعِ رسا و ذہنِ ذکا دارد، از وست :-

فراغت کر چکا مانی جب اُس کے طاقِ ابروئے
کفک کا اُسکے نقشہ کھینچ دیجو میرے لوہو سی

خدایا ساحلِ مقصود پر تو اُس کو پہنچا نا
ہماری کشتیٔ دل لطمہ خور ہی موجِ گیسو سی

مردمانِ چشم سے چشمِ تر خالی ہوئے
اب تو آ ظالم کہیں یہ دونوں گھر خالی ہوئے

پھر آپ نے غیروں سے ملاقات نکالی
اچھا، یہ نئی چھیڑ مرے ساتھ نکالی

جس رات نہ تو آیا مرے پاس مری جاں
کیا جانئے کس طرح میں وہ رات نکالی

دل نذر کیا اُس کے جو ہم نے تو کہا بس
دینے کو ہمارے یہی سوغات نکالی

کر قتل مجھے اُس نے ڈبویا تو کسی نے
دریا سے مری لاش نہ ہیہات نکالی

قایل ہوں میں زیبا تری خوش گوئی کا تو نے
ہر بات میں دیکھا تو نئی بات نکالی

دکھلا کے تری خواب میں تصویر کسی نے
مارا وہیں پھر دل پہ مرے تیر کسی نے

میں ہجر کی شب گرچہ کئے سیکڑوں نالے
پر دل میں نہ کی یار کے تاثیر کسی نے

جوں خالِ سیہ ہی خمِ ابرو میں کسی نے
سجدہ نہ کیا یوں تہِ شمشیر کسی نے

لاشہ مرا افتادہ رہا یار کے در پہ
کی اُس کے اُٹھانیکی نہ تدبیر کسی نے

تڑپا کبھی جو صید ترا تیر کے تلے
ابرو نے رکھ لیا اُسے شمشیر کے تلے

دل لے گیا ہی وہ بت خونخوار چھین کر
جان میری اُس کے ابروئے خمدار چھین کر

کی مجھ سے دشمنی جو مرے دوست لے گئی
قاتل کی میرے ہاتھ سے تلوار چھین کر

آنکھیں مری بھر آئیں تو ساقی خجل ہوا
ہاتھوں سے میرے ساغر سرشار چھین کر

ہے جائے رشک اُن پہ جو کوچہ میں یار کے
بیٹھے ہیں ہم سے سایۂ دیوار چھین کر

مول لو آئینۂ دل کو کہ ارزاں چیز ہے
مفت سمجھو اس کو خوباں دست گرداں چیز ہی

وہ زلف گرہ گیر ہے زنجیر ہماری
وابستۂ افسوں نہیں تسخیر ہماری

تلوار تو قاتل نے لگائی تھی و لیکن
کیا کیجے الٹ جائے جو تقدیر ہماری

مشتاق ہی کس گل کی جو بیتابی کے مارے
کاغذ سے اڑی جاتی ہی تصویر ہماری

میں نے جو کہا میں بھی ذرا دیکھوں تو بولے
ہر ایک کے قابل نہیں شمشیر ہماری

ناحق کو جو یوں روٹھ رہا ہم سے کریں کیا
زیبا نہیں کچھ اس میں تو تقصیر ہماری

پہلے تو ہم کو مارا صورت دکھا دکھا کر
آخر کو لے گئے دل میرا لبھا لبھا کر

کرتا ہے قتل پیارے مجکو گھڑی گھڑی کا
یہ دیکھنا تمھارا چلمن اُٹھا اُٹھا کر

کچھ کھا کے مر رہیں گے ہم تو جو یوں ہی پیارے
راتوں کو تم پھروگے مسّی لگا لگا کر

چرخ و ستارہ با ہم کیا سیر کر رہے ہیں
تاریک شب میں لاکھوں فتنے جگا جگا کر

اُن کے بھی دیکھنے کو وہ بام پر نہ آیا
پہنچے جو اُس گلی میں جانیں کھپا کھپا کر

کہتے تھے ہم، نہ دے دل اُس شعلہ رو کو زینت
آخر نہ اُس نے مارا تجکو جلا جلا کر

صانع قدرت نے تن تیرا بنایا نور کا
لگ نہیں سکتا ترے تلووں کو چہرہ حور کا

واں سے آتی ہے "اناالحق" کی صدا ہر روز و شب
خون سولی سے گرا تھا جس جگہ منصور کا

بات بھی کوئی کسی کی پوچھتا زیبا نہیں
اس زمانے میں خدا حافظ ہے بے مقدور کا

دامن سے ہاتھ اُس کے گو دور رہے ہمارا
پر چاک جیب پر تو مقدور رہے ہمارا

دے بوسہ گر اُس طفلِ پریزاد کے منہ پر
تو رنگ کچھ آوے دلِ ناشاد کے منہ پر

اس مرنے کے صدقے کہ ترا کشتہ پڑا تھا
منہ اپنا رکھے خنجرِ فولاد کے منہ پر

رنگین نشانے تمھیں بتلاؤں میں یارو
چھینٹیں ہیں لہو کی مرے جلاد کے منہ پر

تیشہ جو لگا تھا سرِ فرہاد پہ اُس سے
بہتا تھا لہو زور سے فرہاد کے منہ پر

کس طرح میں دیکھوں کہ دمِ نزع مرا خوں
گل پھینک کے مارے مرے صیاد کے منہ پر

ہے مصحفی استاد ترا شوق سے زیبا
پڑھ اپنی غزل جا کے ہر استاد کے منہ پر

زور

میر احمد علی زور تخلص ولد فیض علی جوانِ مہذب الاخلاق است، بہ سببِ اتحاد و دوستی کہ بمیاں نور الاسلام منتظر داشت فیضِ صحبتِ ایشاں را دریافتہ بحکم موزونیٔ طبع یک ناگاہ چیزے موزوں کردن گرفت و آں در ترازوئے نقادانِ معیارِ معانی درست برآمدہ، باوصفِ بے علمی انچہ موزوں می کند در بافت نظمش خلل بسیار کم یافتہ می شود، عمرش سی و سہ سالہ است، از وست:-

مرتا ہوں میں اُس غیرتِ گلزار سے کہنا
پیغام صبا! تو یہ مرے یار سے کہنا

مر جاؤں گا تو بھی نہیں بھولوں گا پیارے
چل دور دِوانے وہ ترا پیار سے کہنا

جلاد کو گردن کہیں مت ماریو قاتل
کہنا ہو جو کچھ اپنے گنہ گار سے کہنا

کیا اپنی بری خو ہے کہ اُس شوخ سے ہمدم / اک بات کبھی سنئے تو دو چار سے کہنا
آنے نہیں دیتی ہے ہمیں آبلہ پائی / صحرا میں صبا یہ سرِ ہر خار سے کہنا
آئے تو گلستاں میں و لے حالِ دلِ زار / ہم بھول گئے مرغِ گرفتار سے کہنا
اب زورؔ غزل کہنے کی طاقت مجھے کب ہے / سیکھا ہوں یہ میں منتظرِ زار سے کہنا

تیشے کو اٹھا سر سے جو فرہاد نے مارا / کیا یاد تھی شیریں کی اُسے یاد نے مارا
میں حشر کو پوچھوں گا یہی بات خدا سے / کس بات پہ گردن مجھے جلاد نے مارا
ایجاد ہے اُس کا یہی ہر بات میں گالی / دل لے کے مرا، اُس ستم ایجاد نے مارا
جب سرد ہوا مرغِ دلِ خستہ قفس میں / اک ہاتھ اٹھا زانوئے صیاد نے مارا
مجنوں کا لہو بند نہیں ہوتا ہے لیلیٰ / کس طرح کا نشتر ترے فصاد نے مارا
ہمسائے یہ کہتے ہیں کہ رویا نہ کرا اتنا / اے زورؔ مری روز کی فریاد نے مارا

بوسہ نہ دیا دینے کہا تھا مجھے کب سے / جی چاہے ہے ہر لب اپنے ملا دوں ترے لب سے
تو پیار کرے جان تو بس جان سی کھو دے / اس پیار سے ڈر ہی ترے اور ڈر ہے غضب سے
کہتا ہوں اسے دیکھنا برباد نہ کرنا / آئینۂ دل میں نے منگایا ہے حلب سے
میں پاس لگا بیٹھنے محفل میں تو بولے / بس لگ نہ چلو مجھ سے ذرا بیٹھو ادب سے
تا آخرِ شب شور مرا کم نہیں ہوتا / جلتا ہوں جو مانندِ چراغ اوّلِ شب سے
درباں سے وہ کہتا ہے کہ یہاں زور نہ آوے / باتیں مری جا جا کے وہی کہتا ہے سب سے

گیا شب جو میں اُس کے پٹ کے برابر / غضب یہ ہوا کنڈی کھٹکی برابر
نہ ہو کیونکہ دیوانہ تعویذ اُس کے / بندھا لٹ میں لٹ کے ہر لٹ کی برابر

کہیں کم تھی بازی مری اس سے ہمدم
دو ہی باتوں میں ہیں نے جھٹ کی برابر
جو نہیں اُٹھ گیا میرے برسے وہ ظالم
وہیں روح قالب میں بھٹکی برابر
مقابل ہوا جب میں مژگاں کی صف کے
تو پتلی کے بس کو جھٹکی برابر
کوئی زور دیکھے تماشا گر اُس کا
تو ہے اشک مژگاں پہ نٹ کی برابر

اشکوں سے بجھاتا ہوں سدا سوزِ جگر میں
کرتا ہوں شبِ ہجر کو رو رو کے سحر میں
گھڑیوں مجھے ہچکی سی لگی رہتی ہے اُس بن
نالے ہی کیا کرتا ہوں بس دو دو پہر میں
اے زور مزا شعر کے کہنے کا تبھی تھا
تھوڑا سا بھی کچھ علم پڑھا ہوتا اگر میں

زلال

میر دوست علی ولد میر محمد ماہ ساکن اٹاوہ پیش ازیں دوست تخلص می کرد بہ نظرِ محمد علیؔ تنہا سر آمدِ تلامذۂ فقیر کلامِ خود را می گذرانید بعد رحلتِ شیخ موصوف رجوع بہ فقیر آوردہ و آرے کجا می رفت کہ سلسلہ ہمیں جا داشت شعر در زبانِ ہندی و فارسی ہر دو میگوید عمرش سی و پنج سالہ خواہد بود، فنِ خوشنویسی ارثِ خاندانِ اوست بہ فنِ تعلیم کودکاں، چہ ہندو چہ مسلمان اکثرے اشتغال داشتہ بسکہ کلامش شیریں بود ازیں عاصی زلالؔ تخلص یافتہ، از وست:-

شوخی کہ دی بپائے نگاریں حنا بہ بست
امشب بہ چشم آمد و چشم از حیا بہ بست
نازم بزلفِ یار کہ در یک نظارۂ
زنارِ کفر در کمرِ پارسا بہ بست
چوں قاصدے نبود سزاوارِ کوئے او
عاشق فراق نامہ بہ بالِ ہما بہ بست
فریاد ازیں ستم کہ بہ عہدِ جمالِ خویش
دستِ جفا کشادہ دستِ دعا بہ بست
آبِ زلالؔ زندگیٔ ماست وصلِ تو
مجبوریم رہِ طلبِ مدعا بہ بست

جانا بہ پیش زلفِ تو مشکِ تتار چیست　　　جائے کہ بشگفی تو چو گلِ نو بہار چیست

اشعار ہندی

اک چشم کی گردش سے دو عالم کو کیا مست　　　کس بادہ سے تھی وہ نگہِ ہوش ربا مست
غم کا نہ انھیں غم ہے نہ شادی کی ہے شادی　　　رہتے ہیں سبھی حال میں مردانِ خدا مست
میں ہوش میں اس کو کبھی اک روز نہ دیکھا　　　کس مے سے زلالِ جگر افگار رہا مست
وارفتہ ہوں کس چشم خماریں کا جو مجھ کو　　　کرتی ہے چمن میں گلِ نرگس کی ادا مست

رکاوٹ کج ادائی ہو چکی بس　　　ملو بھی اب جدائی ہو چکی بس
نہ رستم سے پھرا جب اُس کا پنجہ　　　کہا زور آزمائی ہو چکی بس
ادا کا بھی ادا کرنا ہے لازم　　　ستم گر بے ادائی ہو چکی بس

کوئی زلف کی لٹ میں کوئی گیسو میں چھپا ہے　　　اک قافلۂ دل ترے ہر مو میں چھپا ہے
چہرہ مرا دیتا ہے جو اُس میں سے دکھائی　　　کیا آئینہ آئینۂ زانو میں چھپا ہے
دیکھا تو زلال اُس کے دو ابرو میں نہیں خال　　　بے شک یہ زحل آ کے ترازو میں چھپا ہے

یادِ فندقِ یا میں اشکہائے خونیں سے　　　سالہا چمن میں کی مشقِ لالہ کاری میں

کس صبح کو خورشید لئے تارِ شعاعی　　　جاروب کشِ کوچۂ جاناں نہیں ہوتا

ہمارے قتل پہ شمشیر جنگ جو نہ اُٹھا　　　نگاہِ ناز کفایت ہے بوجھ تو نہ اٹھا
نہ کھو تو ہاتھ سے کیفیتِ شبِ مہتاب　　　نقاب چہرۂ زیبا سے ماہرو نہ اُٹھا

جہنم آگ میں اور خلد خاک پر لوٹے — لحد سے حشر کے دن جب یہ زردرو نہ اٹھا

کبودی ہو گئے جب یار کے عذار کے گل — ہوا میں سخت پشیمان اُن پہ مار کے گل
زلالؔ آگ ہی سینے میں کیا عجب نکلیں — ہماری آہِ شرربار سے چنار کے گل

کسی کاتب نے مگر نامہ لکھا تھا اس کو — آج تک رد زقلم ہوتے ہیں وچنار کے ہات

رہی ہی آٹھ پہر زلف پر شکن میں نسیم — ختن نسیم میں ہے اب نہیں ختن میں نسیم

یاد ہے مستیِ چشم اُس کی فراموش ہوں میں — سیر ہی یار تو مے نوش ہی بیہوش ہوں میں
رُخ سے اُس گل کی یہ کہتی ہی بیاضِ گردن — گلِ خورشید ہے تو صبحِ بناگوش ہوں میں
جب غزل جا کے پڑھے باغ میں تو اپنی زلالؔ — گل یہ چاہی ہے کہ سننے کیلئے گوش ہوں میں

آئینہ خانے میں جو گذر ہو کبھی زلالؔ — ہر عکس اُس کو دیکھ کے آغوش کھول دے

انداز سے خوباں کے نکلتی ہی یہی بات — پامالِ دو عالم دمِ رفتار کریں گے

جو دب گئے دمِ خواب اُسکے بال رخ کے تلے — نظر پڑے رگِ گل سی نشاں لکیروں کے

اتنی ہستی پہ کیا گھمنڈ کریں — گل پہ شبنم کا دانہ ہیں ہم لوگ

ہے طلوعِ مہر ہر ذرے میں خاور سے جدا　　رنگ دکھلاتی ہے یہاں ہر فرد جوہر سے جدا

اگر شبیہ کشی مجکو آتی جوں بہزاد　　تو اپنی آنکھیں بناتا ترے قدم کے تلے

دب جائے دل نہ غم میں بھلا آہ کیا کرے　　جنبش بزیر کوہِ گراں کاہ کیا کرے

وعدۂ وصل میں ہر روز یہی ہے نقشہ　　صبح ہاں منہ سے جو کرتا ہے تو پھر شام نہیں

چمک یہ حسن کی گرمی سے اُس کے منہ پر ہے　　کہ جیسے شیشے میں ہووے شراب کا عالم

پڑھتے ہی خط کو مرے طیش میں آیا شاید　　کہ جواب اُس نے لکھا خونِ کبوتر سے مجھے

سر نہیں ہے جو رہِ عشق میں برباد نہ ہو　　دل کہیں لگے نہ اُسے جس میں تری یاد نہ ہو
چاند سورج کے تئیں نور ملے کس جا سے　　چشمۂ فیض جو وہ حسنِ خداداد نہ ہو

نہیں کسی میں یہ طاقت کہ اُس کو روک سکے　　ہوا کے گھوڑے پہ عہدِ شباب جاتا ہے

باغِ ہستی میں نخلِ بید ہیں ہم　　فصل میں بھی ثمر کو رو بیٹھے

ٹھہر اے دستِ جنوں موسمِ گل آنے دے　　تو ابھی سے تو گریباں کو مرے آنے دے

کیا عجب ہی جو نزاکت سی چھلک آئے خوں سنگِ پا سے نہ رگڑ تو یہ پرستارِ قدم

کشتۂ تیغِ ناز تو کر ہی چکا تھا تس پر اور چل گئیں دل پہ برچھیاں عشوۂ چشمِ یار سے

نظر پڑے جو اُسے حسن وہ بھبوکا سا ملے نہ خاک میں کیوں ہو کے منفعل شعلہ

انکار ہی کرے نہ اگر یار کیا کرے منہ سے وہ اپنے وصل کا اقرار کیا کرے

زکی

جعفر علی خاں زکیؔ تخلص۔

عشق میں بلبل کو کیا نسبت ہی پروانے کیا تھ وصل میں مر جاے وہ یہ ہجر میں جیتی رہے

زخمی

کنور جی متخلص بہ زخمی خلف الصدق رائے بالک رام، جوانے وجیہہ و قابل و دانا و مہذب الاخلاق است فقیر اورا روزے در مشاعرۂ مرزا حاجی صاحب دیدہ بود وضعِ مرزایانہ دارد در خواندنِ شعر ہم تتبعِ مردمِ ولایت می کند عمرش قریب بچہل رسیدہ شاگردِ مرزا قتیلِ مرحوم شدہ می گوید از زادہائے طبع اوست:۔

جہا جپاکہ نہ دیدم من از جفائے فراق مباد روزی کس ہمچو من بلائے فراق
جگر نہند بہ خوں جاں بلب رسید اے وائے من ستم زدۂ وایں عذاب ہائے فراق
ازیں بلاست رہائی مرا کجا ممکن فراق بہر منست و منم برائے فراق
منال ایں ہمہ زخمیؔ ز دردِ ہجر منال خدا دہد بتو روزِ جزا جزائے فراق

اضطرابِ تو و بیتابی بسمل دارم　　یارب این درد چه درداست که در دل دارم
وائے زیں حسرتِ دیدار که در خوں شب و روز　　دست و پا می زنم و خوں سوئے قاتل دارم
پیش ازاں دم که بمیرم بر من آرندش　　سخنے چند به آں حور شمائل دارم
یار با غیر بروں رفته و من خانه خراب　　نیست معلوم چرا جائے به محفل دارم
جاں بلب دل همه خوں، سینه پُر از داغِ جنوں　　طرفه حالیست که زخمی منِ بیدل دارم

یارب آں دم که بر ویش نظرے می کردم　　کاش ازیں عالمِ فانی سفرے می کردم

دل بیتاب هماں دیدهٔ خونبار هماں
رفت آں عیسیٰ بے رحم و منِ زار هنوز　　منتظر بر سرِ ره با دلِ افگار هماں
خطِ او گرچه به یاراں خطِ آزادی داد　　زخمیؔ نامه سیه ماند گرفتار هماں

کے کے تو از صبا به کنارِ من آمدی　　ما مردم از غم و به مزارِ من آمدی
می کشت رشکِ غیر مرا تا سحر و لے　　قربانت اے اجل که به کارِ من آمدی
زخمی چه بد بلاست که بر دست بجیلهٔ　　چوں بے خبر به مشتِ غبارِ من آمدی

عتاب آلوده می آئی و در کف خنجرے داری　　مرا اول بکش گر قصدِ قتلِ دیگرے داری

هم چو بسمل می طپید دل در کنارِ من هنوز　　بوئے خوں می آید از مشتِ غبارِ من هنوز
رفتی از دیده و دل بے تو طپانست هنوز　　یادِ شبهائے وصال آفتِ جانست هنوز

هم چناں بے تو مرا شعله بجانست که بود　　ناله زار هماں برق فشانست که بود

از گلِ عارضِ او سبزہ دمیدہ است ولے
ہم چناں طفلی ازاں چہرہ عیانست کہ بود
رفت عہدے کہ سرے داشت بما ہم گاہے
ما ہما ئیم ولے یار نہ آنست کہ بود

پس از ہر جنگ صلحش گرچہ لذت بیشتر دارد
ولے بر ہر سخن جنگش تماشائے دگر دارد
عجب می آیدم چوں قصدِ بزمش می کند جمیؔ
کہ ناداں خواہشِ وصلش باین دامانِ تر دارد

بس کہ قربِ مدعی در خاطرش جا کردہ است
بہر قتلم حیلہ ہائے تازہ پیدا کردہ است
خوں چساں بر سر نوشتِ خود بگریم زخمیاؔ
نامہ از بہرِ رقیب آں شوخ انشا کردہ است

سر بار است کجا بامنِ دل تنگ اورا
کہ پئے صلحِ رقیب است بمن جنگ اورا
گرچہ ہمنیر برابرشں زدو رفت ولے
ہر ہی گردِ غبارم دو سہ فرسنگ اورا
آنکہ ہرگز نہ زند گوش برا فسونِ کسے
کردہ رام آں ہمہ زخمیؔ بجہ نیرنگ اورا

زائر

آغا میرزا جان زائرؔ تخلص از اولادِ محمد رفیع باذلؔ مصنفِ حملۂ حیدری جوانِ قابل و دانا است و بزمزمہ خوانیِ حملۂ حیدری امروز در تمام شہر نظیرِ خود نہ دارد، ماورائے ایں صفتِ موسیقہ و گفتنِ شعرِ فارسی ہم بطورِ تتبعِ ولایت زایان دلفریبی می نماید و در زمینِ اساتذہ قدم می نہد و البتہ کہ از عہدۂ آں می برآید فقیر او را در مشاعرۂ میاں صدر الدین صدرؔ دیدہ و کلامش بہتر شنیدہ برمز خرفاتِ فارسی خود را ہم کمو شش رسانیدہ عمرش از چہل متجاوز خواہد بود آنچہ مراحسب الطلب نوشتہ داد اینست :-

من از جورے ستمگارے نگارے کردہ ام پیدا
ز داغِ لالہ زارے گلعذارے کردہ ام پیدا

زدستِ شہسوارے صیدِ دل را اور ہانیدہ — بمیدانِ محبت جاں شکارے کردہ ام پیدا

زنازِ یاسمیں بوئے زبس رنجیدہ ام اکنوں — بہ نازِ یاسمینے شرمسارے کردہ ام پیدا

گراز رعنا نگارے شہر یارے کندہ ام دل را — شہِ زریں کلاہے تاجدارے کردہ ام پیدا

زبس از خوش ادائی دیدہ ام من کج ادائی ہا — بجائش مہ لقائے راز دارے کردہ ام پیدا

زبس پامالِ رخشِ شاہ حسنے جان و دل گشتہ — جوانِ یکہ تازے شہسوارے کردہ ام پیدا

زجورِ عنبریں موے زبس پیچیدہ ام در دل — سرو کارے بہ زلفِ مشکبارے کردہ ام پیدا

زداغِ وحشیِ رم خوردۂ از ایں غزل زاؔر — شکارے چوں غزالِ دشت بارے کردہ ام پیدا

دلا از جورِ یارے غمگسارے کردہ ام پیدا — زدستِ دلربائے جاں شکارے کردہ ام پیدا

دلم خوں کردہ از بس عشوہ جوئے دشمنِ حسنِ گل — بخاطر الفتِ غلماں شعارے کردہ ام پیدا

چو از شیریں مقالی حرفِ تلخی خوردہ در گوشم — بزعمش خسروِ عالی وقارے کردہ ام پیدا

گسستم از درِ ناسفتۂ سلکِ محبت را — بآب و تابِ لعلِ تاب دارے کردہ ام پیدا

زحکیمِ تاج بخشے سر اگر پیچیدہ ام لیکن — یگانہ گوہرے گوہر نثارے کردہ ام پیدا

نہاں دارد گہر دندانی از بس سلکِ گہر از من — زنجرِ دیدہ در تر شاہوارے کردہ ام پیدا

صنوبر قامتے بر من قیامت کردہ گر برپا — وگر سروِ چمانے خوش کنارے کردہ ام پیدا

ببر داز اعتبارم بے وفائی از جفا کارے — بعاشق دلدہی کن شہر یارے کردہ ام پیدا

بشاہانِ جہاں زیبد مرا کے سر خرد بردن — من اے زاؔر رشتہ دلدل سوارے کردہ ام پیدا

زاؔر[1]

میر حسن عسکری زاؔر تخلص پسر میر تقی میؔر بمقتضائے موروثی موزون الطبع آمدہ

---

(۱) نسخہ رامپور میں زاؔر کا ذکر ہے جو اس نسخہ میں نہیں۔

چیزیکہ موزوں می کند آں را بہ نظرِ امام بخش ناسخ می گزراند یا ایشاں گفتہ می دہند والاّ کودکاں را در حداثتِ سنِ بلوغ ایں فصاحت و بلاغت کے حاصل می شود۔ رویہ پدرش دیگر بود و او بر رویہ دیگر افتادہ۔ عمرش قریب سی خواہد بود، از وست :۔

وصل منظور ہے فرقت سے کنارہ کب ہے
وہ بھی اولیٰ ہے مجھے یہ بھی مجھے انسب ہے

میرے مرنے سے جو تو خوش ہے تو میں بھی راضی
جو کہ مطلب ہے ترا یہاں بھی وہی مطلب ہے

صحبتِ اہلِ خرد جبر ہے نادانوں کو
طفل کو خانۂ زنداں سے فزوں مکتب ہے

آتشِ غم سے میں دن رات جلا کرتا ہوں
داغِ فرقت میرے طالع کا مگر کوکب ہے

زلف کے سوز میں رو تا ہوں میں جوں ابرِ بہار
روزِ روشن میرا ساون کی اندھیری شب ہے

گرچہ درویش ہوں پر زر نہ لیا سلطاں سے
دامنِ حرص رہا دور کفِ احساں سے

تیری باتیں جو کبھی آئینہ رو یاد آئیں
مدتوں صورتِ تصویر رہے حیراں سے

آب گریہ سے نہ سوزِ دلِ بیتاب مٹا
آتشِ برق کبھی بجھتی نہیں باراں سے

رنگ سو بدلے یہاں پر نہیں ممکن اے زار
وصل کا روز مبدل ہو شبِ ہجراں سے

ردیف (س)

سراج

سراج الدین خاں سراج تخلص

نہ پوچھو آسماں پر تم ستارے
ہماری آہ کی چنگاریاں ہیں

سلام

نجم الدین علی خاں سلام تخلص۔

حدیثِ زلف چشم یار سے پوچھ درازی رات کی بیمار سے پوچھ

سید

میر یادگار علی سید تخلص۔

کیا اب امید کریں وصل کی مرتے مرتے عمر تو کٹ گئی دکھ ہجر کے بھرتے بھرتے

سید

میر امجد علی سید تخلص جوانِ شیریں گفتار است کلامِ خود را از نظرِ مرزا قتیل گذرانیدہ و میگذراند بیش ازیں نظمِ مرثیہ و سلام میکرد از چندے بہ ترغیبِ مرزائے موصوف خود را بہ شعر گفتن مصروف داشتہ عمرش تخمیناً از سی سال متجاوز خواہد بود و در ہر غزلِ طرحی مشاعرۂ مرزا حاجی[1] صاحب شریکِ دورۂ یاراں بودہ از دست :۔

جدا وہ جب سے ہوا ہے کنارے میرے گیا ہے دل ہی مرا اختیار سے میرے

ترے نہ آنے سے پیارے جو مجھ پہ گذری رات وہ پوچھ اس دلِ امیدوار سے میرے

رکھے ہے دل کو جو اس زلف و رخ سے وابستہ خبر اسی کو ہے لیل و نہار سے میرے

دلِ ستم زدہ جلتا ہے قبر میں شاید دھواں اٹھے ہے جو اب تک مزار سے میرے

وہ مہرباں رہے ہے غیروں ہی پر سدا سید نہ بیٹھے آکے کبھی پاس پیار سے میرے

---

(۱) مرزا حاجی قمر شریک، می شد۔ (ن)

جا سینے میں کس طرح نہ دیں تیرے سناں کو
آرام اسی میں ہے دلِ غمزدگاں کو

پہلوئے دلِ زار تو جاتا ہے کہاں ہائے
تنہائی میں یہاں چھوڑ کے مجھ سوختہ جاں کو

جوں شمع جگر سے ابھی اٹھنے لگیں شعلے
لاؤں کبھی لب تک میں اگر سوزِ نہاں کو

یوں دیکھے تھا یار اپنے کو سید دمِ آخر
جو رو دیا دیکھ اُس کی میں چشمِ نگراں کو

پاس اور کے دیکھوں ہوں جو اُس رشکِ قمر کو
رہ جاتا ہوں میں تھام کے بس اپنے جگر کو

نایاب ہے ایسی ہی کہ پائی نہیں جاتی
کتنا میں شبِ ہجر میں ڈھونڈوں ہوں سحر کو

بے ہیچ یہ جاتا نہیں وعدہ ہے کسی سے
آتے ہی شتاب اتنی چلے آج جو گھر کو

میں جی ہی سے جاتا ہوں چلے جائیو تم بھی
دم بھر تو مرے پاس سے اب اور نہ سرکو

سید سے جو پوچھی خبر اُس کوچے کی ہم نے
رو اُس نے دیا دیکھ کے حسرت سے اُدھر کو

کون غم، دوری میں تیری جان پر غم کا کرے
لب پہ ہے مہماں بھروسا کیا کوئی دم کا کرے

دیر سے میں منتظر ہوں اے اجل تو ہے کہاں
تیغِ ہجراں سر پہ میرے کب تلک چمکا کرے

دل جگر تو بہہ گئے خوں ہو کے آنکھوں سے آہ
دیکھیں کیا سید ترا رونا یہ ہر دم کا کرے

کبھی بھولے سے بھی اُس نے نہ ادھر دیکھ لیا
ہم نے بیتابیٔ دل تیرا اثر دیکھ لیا

لائی پھر پھر ہمیں بیتابیٔ دل ہم کو آہ
بارہا در سے ترے کر کے سفر دیکھ لیا

ڈرتے ڈرتے گئے تب یار کے کوچے میں ہم
خوب ساجی کے ادھر اور اُدھر دیکھ لیا

کشتۂ رشک ہیں اُس صید کے جس نے تہِ تیغ
رخِ قاتل کی طرف پھر کے اگر دیکھ لیا

نہیں ممکن ہے کہ ٹھہرے کوئی ساعت گھر میں
اب تو سید نے پیارے ترا گھر دیکھ لیا

بوقتِ قتل مرا کس عدو نے نام لیا	پہنچ کے سر پہ جو ہاتھ اُس نے اپنا تھام لیا

مضطرب اتنا تہِ خنجر تو اے بسمل نہ ہو	دیکھ ٹک آلودۂ خوں دامنِ قاتل نہ ہو

حسرت بھرے اس طرح چلے ہم ترے کوچے	جس طرح کہ چھوٹے وطن لے دلائے کسو سے

سروری

شیخ رضی الدین عرف غلام مرتضیٰ سروری تخلص وطنِ بزرگانش ابراہیم آباد سودھرہ من مضافاتِ صوبۂ لاہور است، خودش در شاہجہاں آباد نشو و نما یافتہ۔ شخصِ سن و جہاں دیدہ و کثیر الکلام و شاگردِ نظام خاں معجز است در فارسی دانی و سلیقۂ نظم آں مہارتِ تمام دارد از دوازدہ سال بہ لکھنؤ رسیدہ با فقیر از شاہجہاں آباد از تۂ دل آشناست انتخابِ دیوانِ اوست:۔

بدل توقعِ بہبودِ روزگار مدار	بنائے کار بجز فضلِ کردگار مدار
نہ دادِ حکمتِ حق اختیارِ کار بہ کس	امید مطلق از چرخِ بے مدار مدار
لباسِ عاریتی واگذار و ننگ مکن	برہنہ باش و زکس در زمانہ عار مدار
خموش باش کہ وضعِ جہانیاں دگر است	بحرفِ حق سرِ خود بر فرازِ دار مدار
بہ چرب و نرمی جاوید مرہمِ جاں شو	دردنِ خستہ دلانِ جہاں فگار مدار
قبائے سبز دریدہ است ہر گلِ چمن	ہوائے خرقہ دریں موسمِ بہار مدار
دریں بہار سروری بہ عزمِ زاہدِ خشک	بغیر بادہ خوری ہیچ کاروبار مدار

فتاد بر سرِ من سایۂ ہما آخر	نشانِ تیرِ تو شد استخوانِ ما آخر

مگر کہ شرطۂ توفیق دست یار شود / گذشت کارِ من از سعیِ ناخدا آخر

نبودہ است چنیں فتنۂ قیامت ہم / قدِ تو بر سرم آوردہ صد بلا آخر

ندیدہ ایم بدیں رنگ چہرہ ات ہرگز / بگو بگو کہ ندانیم ماجرا آخر

زفکرِ دہر سروری مباش بادلِ تنگ / کہ غنچہ وا شود از جنبشِ صبا آخر

اے حسنِ تو از حور و ملک خوشتر و بہتر / حرفِ لبِ لعلت ز نمک خوشتر و بہتر

رخسارۂ تابانِ تو گر نورِ تجلی است / ہست از مہ و خورشیدِ فلک خوشتر و بہتر

بیکار نشستن بتو ساقیست چہ لازم / در ہر دو کفت جامِ بطلک خوشتر و بہتر

برزعمِ حسوداں بمن آں لطفِ نہانی / گر بیشترک نیست کمک خوشتر و بہتر

اے آنکہ ترا علم کمال است و عمل نیست / در مرتبہ از تست خرک خوشتر و بہتر

ہر جا کہ بود ذکرِ معارف ز سروری / مطرب بسرا ایں غزلک خوشتر و بہتر

گل گل شگفت باغ چو نیرنگ یار را / دیدم بہارِ صلحِ گلِ جنگ یار را

در باغ بوسہ بر دہنش میزنم کہ ہست / با غنچہ نسبتے دہنِ تنگِ یار را

باشد ز درد و داغِ محبت سرشتِ ما / مہر و وفائے عشق خطِ سرنوشتِ ما

ہر کس مرادِ خویش ز جائے طلب کند / بہتر بود ز کعبۂ زاہد کنشتِ ما

ایواے چوں کنیم گر از دستِ چپ رسد / در روزِ حشر نامۂ اعمالِ زشتِ ما

از نعمتِ دو کون سروری بریدہ ام / خوں خوردنِ دلست نعیمِ بہشتِ ما

چو ہست راہ بدل الفتِ نہانی را / چہ سود عرض کنم مطلبِ زبانی را

شد تنگ ترا ز دیدۂ مورے نفسِ ما　　وز دیدۂ صیاد برآید قفسِ ما

ہمیں بہ حسرتِ دیدار می کشد مارا　　کہ رشکِ صحبتِ اغیار می کشد مارا
دو دل شدیم چو در کفر و دیں نظر کردیم　　خلافِ سبحہ و زنار می کشد مارا

نبود بدست اگر ز جہاں ہیچ شے مرا　　صد شکر دادہ اند بہ کف جامِ مے مرا
دیوانگی بہ سلطنتِ جم برابر است　　داغِ تو بود افسرِ کاؤس و کے مرا
بعد از وفات نالہ ز خاکم تواں شنید　　قالب تہی اگرچہ بود ہم چو نے مرا

اے وائے کارِ من ز پیام و خبر گذشت　　چشمم ز گریہ سیر شد آہ از اثر گذشت
اے دل دگر بگو بچہ امید زندہ　　یار آمد و بسوے تو نا دیدہ در گذشت
قربانِ طرزِ وعدہ فراموشیٔ توام　　صد وعدہ ہائے شب چو نسیمِ سحر گذشت
عاشق اگرچہ از دل و دیں در گذشت لیک　　نتواند از تو اے بتِ بیداد گر گذشت
ہمت روانہ داشت کہ گوید برُوئے من　　حالیکہ از جفائے تو بر نامہ بر گذشت

ترکِ چشمِ ... تو دل و جانِ من است　　ہندوے زلفِ تو غارت گرِ ایمانِ من است
باد بر ذائقہ ام لذتِ عشقِ تو حرام　　جز خیالِ تو اگر سر بگریبانِ من است

در علمِ عشق ہر کہ بہ مجنوں برابر است　　در کیشِ عقل بہ سرِ فلاطوں برابر است
از بس کہ در فراقِ توام ریخت خونِ دل　　چشمم ز جوشِ گریہ بجیحوں برابر است
شاگردِ معجزم جو سر دری بہ فنِ شعر　　مضمونِ من بہ معنیٔ مفتوں برابر است

شب کہ دل در آرزوئے جلوۂ فریاد داشت　　آشیاں گم کردہ صیدے چشم بر صیاد داشت

از چراغِ صبحدم روزِ قیامت روشن است　　کاسماں اول بنائی کار را بر باد داشت

بر سروری منتِ آبِ خضر نبود کہ او　　آب در جوئے حیات از دشنۂ فولاد داشت

نہالِ قدِ تو کز بوستانِ جاں برخاست　　قیامتے است کہ با فتنہ ہم عناں برخاست

کامے ولے ز چرخ اگر می تواں گرفت　　آساں مداں بخونِ جگر می تواں گرفت

ہرگز بگوشِ سنگدلاں جا نمی کند　　از نالہ ترجمانِ اثر می تواں گرفت

در خاک و خوں ز حسرتِ دیدار می طپند　　از کشتگانِ خویش خبر می تواں گرفت

در راہِ عشق لختِ دل و آبِ دیدہ بس　　زادی اگر برائے سفر می تواں گرفت

صد وعدۂ ناکردہ بیک بار شکستن　　تقصیرِ وفا نیست بہ تجویزِ غرور است

گل کرد بہ جنت ز دلِ لالہ بر آمد　　آں داغ کہ از دستِ تو بر سینۂ حور است

آں بلبلِ مستم کہ بہ گلزارِ محبت　　با دام در آویزم و با دانہ در افتم

حقوقِ الفتِ دیرینہ ام ادا نہ کند　　چہ بے وفاست دلم با تو ہم وفا نہ کند

بشہرِ عشق شہیدانِ بے دیت باشند　　بگو بہ قاتلِ من فکرِ خوں بہا نہ کند

گرفتم ایں کہ مروت شود برابرِ قہر　　و لیکن ایں مژہ و چشم از کجا آرد

اگر ہزار جفا می کنی سروری را　　ہماں شرائطِ عہد و وفا بجا آرد

سروش

شیخ مراد علی سروشؔ تخلص شاگردِ شیخ امام بخش ناسخؔ، جوانِ صلاحیت شعار مہذب الاخلاق است عمرش از سی متجاوز خواہد بود، شعر را سادہ سادہ می گوید۔ از وست :-

دنیا میں تجھ سا کب کوئی صاحب جمال ہے
خورشید تیرے سامنے ہو کیا مجال ہے

اے رشکِ آفتاب تو اس وقت گھر نہ جا
کہنے کو میرے مان یہ وقتِ زوال ہے

سوزِ دروں سے موسمِ گرما ہے منفعل
بارانِ چشمِ ترسے خجل برشگال ہے

آنے کا نام بھی نہیں لیتا وہ اور ہمیں
اک آن اُس کے ہجر میں جینا محال ہے

کیوں روزِ ہجر کو نہ قیامت کا دن کہوں
مجکو تو ایک گھڑی تری فرقت میں سال ہے

ہر دم فراقِ یار میں ہے آرزوئے مرگ
کب ہم کو اے سروشؔ امیدِ وصال ہے

بچ گئے اب کی اگر عشق کے آزار سے ہم
دل لگا دیں گے نہ پھر ایسے ستم گار سے ہم

عشق میں آپ کو قمری کے برابر نہ کریں
سرو کو دیویں نہ تشبیہہ قدِ یار سے ہم

تیر کیوں مارتا ہے تیغ سے کر قتل ہمیں
عشق رکھتے ہیں فقط ابروئے خمدار سے ہم

ٹھنڈی سانسیں نہ بھریں ہر گھڑی کیونکر ای وائے
سخت جلتے ہیں تری گرمیٔ بازار سے ہم

ہم سے ٹوٹا نہ دلِ بلبلِ نالاں ہرگز
ایک بھی پھول نہ لائے کبھی گلزار سے ہم

دل دیا جس کو سروشؔ اپنا وہی دشمن ہے
رکھیں امیدِ وفا کیا کسی دلدار سے ہم

سامان

خواجہ محمد حسین سامانؔ تخلص خلفِ خواجہ ترس سکنہ شاہجہاں آباد، مولدش

لکھنؤ است۔ از ہیزدہ سالگی بمقتضائے موزونی طبع چیزے بجائے خود موزوں می کرد آخر آنرا برائے دریافت حسن و قبح روزے بہ نظر فقیر گذرانید در طبعش لطافتے یافتم، ایا بہ گفتن شعر کردم، دو سال است کہ انچہ می گوید باصلاح فقیر می رساند کہ بہمیں وتیرہ چندے مداومت کرد بجائے خواہد رسید، عمرش بست وہشت سالہ خواہد بود، از وست:

منہ تک سے بھر دو میرے زخم کے ناسور کا — کون احساں سر پہ لیوے مرہم کافور کا

بستر خار مغیلاں فرش مخمل ہے مجھے — خاک صحرا کو سمجھتا ہوں میں دامن حور کا

مرگئے تو پھر قضائے گلشن ہستی کہاں — جاں بلب رہنا غنیمت ہے دل رنجور کا

توسن غمزہ دہاں چلنے میں ہے صرصر سے تیز — اب ہمیں ملک عدم رستہ نہیں کچھ دور کا

لاکھ وہ بیزار ساماں ہو ولیکن جیتے جی — چھوڑیو مت دامن شوق اس بت مغرور کا

ہم کو مشکل ہی رہا ہجر میں نالاں ہونا — زخم دل سیکھ گیا یار سے خنداں ہونا

تیز رفتار ہے گو ناقۂ لیلیٰ لیکن — چشم مجنوں سے لازم نہیں پنہاں ہونا

تیغ ابرو کے تلے سجدہ کرے تو جانو — اے برہمن بہت آساں ہے مسلماں ہونا

گر صبا گیسوئے لیلیٰ کو نہ جنبش دیتی — بید مجنوں کو نہ آتا کبھی لرزاں ہونا

آستیں اس نے چڑھائی تو ہوا قتل جہاں — تیغ خونریز کا اچھا نہیں عریاں ہونا

اے شب ہجر دکھانا نہ سیاہی اپنی — گور میں نور سحر بن کے نمایاں ہونا

یہ بہت دور ہے ہمت سے تری اے ساماں — چھوڑنا مرگ کو اور زیست کا خواہاں ہونا

نوک مژگاں تک مرا لخت جگر گر آئے گا — رشک سے ابر بہاری خون ہی برسائیگا

مت اٹھا اے دست شوخی رخ سے جاناں کے نقاب — میں بہت کم حوصلہ ہوں مجکو غش آجائیگا

تیشہ بھی ہمراہ اس کے دفن کر دیجو کوئی — کوہکن سقف لحد سے ورنہ سر ٹکرائیگا

آتشِ الفت سے میں تو جیتے جی ہی خاک ہوں
استخواں میرے پسِ از مردن ہما کیا کھائیگا

یاد جب آجائیگی اُس گل کے چہرے کی بہار
ہے یقیں ساماں چمن میں جی مرا گھبرائیگا

مقابل اپنے جب وہ رشکِ گل آئینہ رکھتا تھا
تو عکسِ رخ کو اپنے آپ ہی حیرت سے تکتا تھا

الٰہی تشنہ لب تھی روح کس رندِ شرابی کی
مئے گلگوں کا ساغر دستِ ساقی میں چھلکتا تھا

عدم تک پہنچنا ہم کو ہوا تھا کس قدر مشکل
سمندِ عمر جو ہر گام چلنے میں جھجکتا تھا

چمن میں رات کو... شمیمِ زلفِ جاناں کا
مثالِ بوئے گل جس سمت جاتا تھا مہکتا تھا

ہمارے نالۂ شبگیر کی شہرت تھی جب ساماں
تو پھر مرغِ سحر بھی باغ میں چلا نہ سکتا تھا

اس قدر ایذا نہ دے اے دردِ رنجوری مجھے
گور تو نزدیک ہے گر اُس سے ہے دوری مجھے

بن چکا جسمِ گلی اب مرضیٔ ربِّ جلیل
بندۂ خاکی کرے یا عالمِ نوری مجھے

خوابِ مرقد میں جو آزادی سے ہوں راحت طلب
جانتے ہیں قیدیٔ زندانِ مجبوری مجھے

چاندنی چھٹکی چھپا خورشید اے ساقی شتاب
جامِ نرگس میں پلا صہبائے انگوری مجھے

صحنِ گلشن میں گھٹا دیکھ کے کالی کالی
چہچہے مرغِ چمن کرتے ہیں ڈالی ڈالی

بارِ گوہر نہیں کانوں سے جو اٹھتا تو یہ شوخ
پھول لالے کے پرو لیتے ہیں بالی بالی

تاثیر نہ کی جذبۂ الفت کی عمل نے
محروم رکھا وصل سے قسمت کی خلل نے

شدت سے لگا خونِ بدن جبکہ ابلنے
لبریز کیا گور کو ناسورِ بغل نے

پہنچا تو درِ گلشنِ جنت پہ میں لیکن
آگے نہیں دیتے ہیں ملایک مجھے چلنے

عالم نظر آتا اگر اُس شعلۂ رخ کا
جاتے نہ پتنگے شررِ شمع پہ جلنے

شبنم نہیں پڑتی ہے تو من افعیٔ صحرا
آتے ہیں مرے سبزۂ تربت پہ اُگلنے

اے دیدۂ گریاں نہ کر و قطرہ فشانی
موتی ہیں اگر حشر کے دن تم کو اگلنے

لکھتے ہی تری ساقِ بلوریں کی صفائی
کاغذ پہ لگا خامۂ بہزاد پھسلنے

نظارہ کہاں جلوۂ دیدارِ صنم کا
فردائے قیامت پہ رکھا لیت و لعل نے

رنگت گلِ رخسارۂ خوباں میں بھری ہے
کیا کیا قلم صنعِ نقاشِ ازل نے

وا چشم نہ ہو گی طرفِ چہرۂ قاتل
شرمندہ کیا ہے مجھے تاخیرِ اجل نے

ساماں ہے اسیرِ سرِ ہر مو دلِ غمگیں
پاتا ہے کوئی حلقۂ کاکل سے نکلنے

سجاد

میر سجاد سجاد تخلص از ہندوستان زبانان قدیم[1] است، شعرِ ایہام را بطورِ ریختہ گویانِ ہندی گو گفتہ معاصرِ میاں آبرو و مضمون و ناجی وغیرہ بود، از وست :-

دل ہو گیا پھپولا پیارے تمام جل کے
کیا تجھ نہال سے ہوں امیدوار پھل کے

کیا دل کی بیقراری کیا آہ اور زاری
سجاد تجکو ہیں گے انداز سب اچپل کے

ایسے سے کیونکہ پہنچے کوئی دل کے کام کو
عاشق کا نام جو کہ نہ لیتا ہو نام کو

وہ زلف ہم سے رہتی ہے اینٹھی ہوئی ہمیش
وحشت ہماری صید سے رہتی ہے دام کو

چشم نے نرگس کی پھر شوخی نہ کی
ہو دو چار دس پانچ سی ایسی جھکی

گرچہ پکے تم سے کرتے تھے سخن
تو بھی تم نے ہم سے کچی کی یہ کی

(۱) ریختہ گو از قدما است (ن)

دیکھ لی نرگس تری ہم نے حیسا   شرم کی آنکھوں کو رہنے دے ڈھکی

جام وحدت سے گرچہ مستی ہے   بت پرستی بھی حق پرستی ہے

کھلے بندوں نشے کے بیچ آتا ہے چلا ہنستا   گلابی ہاتھ میں دارو پیئے سرشار وارستا
سب اہل گلشن اسکی بات سنتے باغ ہوتے ہیں   معطر زلف اپنی کھول کر پھولوں میں کر بستا
بہار آئی سبھی غنچے ہیں خواہاں آج تو دل کے   شتابی سے نہ دیکھ بلبل ارزاں اسکو ٹک ستا
تجھے لائق نہیں گل توڑ کر کر ہاتھ میں رکھنا   تری یہ انگلیاں مہندی لگی پھولوں کا ہی دستا

نرگس تری کب آنکھ سے آنکھیں سکے ملا   خون جگر نہ باغ میں غنچے کے تئیں کھلا
اکسیر اس کا دیکھنا عالم کے بیچ ہے   جن تجھ قدم کی خاک کو منہ پر کیا طلا
اس کی صفا کے عکس سے آئینہ مر گیا   جب دل کی آرسی کے تئیں ہم دیا جلا
مرہم سے دل کے زخم کو ہوتی ہے بے کلی   ٹانکا اڑے ہے سینے پہ پتھر کی جوں سلا
ساقی بغیر جام کے دل کا بچاؤ نہیں   جوں فیل مست آوے ہے ابر سیہ بلا
پامال بے طرح کئے ڈالے ہیں یہ صنم   یارب انھوں کے ہاتھ سے پھر پھیر دل ولا
کیوں مشت گل ہی دل کے نہ رونے میں بہ گئی   سجاد مجکو چشموں سے باقی ہے یہ گلا

جن نے تجھ آنکھوں کو اے رام جاں جھل مل دیا   عاشق بیتاب کو اُن نے دل بے کل دیا
غم نہیں گر گھر ہوا پامال ہیں تیرے جائے دل   پیچ پر تجھ زلف کے گویا کہ اُس کو بل دیا
رات اندھیری کاٹنی ہجرت کی ہوئی مشکل مجھکو   دیر مت کر تن کے اب اے شمع ڈھنگ جلدی آ
آخر ہم اس درد سے رنگ زرد ہو کر مر گئے   عشق تھا حق میں ہمارے زہر گویا مل دیا

تجکو اے سجاد غیر از خنجر بیداد کے — اور بھی کچھ ظالموں کی دوستی نے ہیں دِ

جب ہم آغوشِ یار ہوتے ہیں — سب عزیزے درکنار ہوتے ہیں
ناخدائی ٹک ایک کر ساقی — ایک کشتی میں پار ہوتے ہیں
زلف کے کھونے میں اے صیاد — صید سارے شکار ہوتے ہیں

ں میں کس واسطے منت یہ عبث خامہ کی — دل کے قاصد کو کچھ حاجت ہی نہیں نامہ کی
پیرہن دیکھ لیا خوب طرح یوسف کا — چھب نہیں اُس میں سجن تیری کہیں جامہ کی

عاشقی میں جو قدم کہہ کر رکھے — دشت میں مجنوں قدم کہہ کر رکھے
یار کا جامہ ہمیں ہے گا عزیز — یوسف اپنا پیرہن تہہ کر رکھے

تجھے جب غیر سے ملنا نے ہے — کیا ب اس بات سے کیا کیا بھنے ہے
ہمارے رنگ کا ہے کہربا دیکھ — دِوانا ہو کر اب تنکا چنے ہے

یہ گلہ میرا کہے کوئی جا کے اُس خونخوار سے — میں جدا شاکی ہوں تجھ سے سر جدا تلوار سے

سفیر

غلام نبی خاں سفیر تخلص کہ از پیشِ والئ ایران بہ رسمِ رسالت بہ کلکتہ آمدہ د
صاحب کلانِ کلکتہ رسمِ استقبالش بجا آوردہ او را بسیار عزت و توقیر کردہ واز بریِ چہرۂ
قومِ خود مجلسِ رقص ترتیب دادہ از آنجملہ حور نژادے بہ تیغ غمزۂ خونریز قتیلِ خنجرِ عشقش

ساختہ و بہ نظر ہائے پنہانیِ آں مہماں ..... حسن و ناز را نو اختہ مشارٌ الیہ ایں غزل حسبِ حالِ خود در شانِ او گفتہ و غلغلۂ فصاحت در علما و فضلا انداختہ و بعضے از دوستاں آنرا نوشتہ در لکھنؤ کہ مخزنِ شعرا و فصحا است فرستادہ تا ہمہ موزوں طبعانِ ایں دیار در جوابِ غزلش غزلہا تصنیف کردند و بہ کلکتہ نویسانیدہ فرستادہ، غزل این ست:-

امشب جمالِ یارِ من دارد تماشائے دگر | یا آنکہ من می بینمش بہتر ز شبہائے دگر
گلہا ہمہ رنگین و خوش اما گلِ رخسارِ او | در باغِ حسن است از صفا خوشتر ز گلہائے دگر
در پیشِ مراءتِ رخش محو اند یوسف طلعتاں | ہر عزیزے دیگرے آمد زلیخائے دگر
بر دعوے اعجازِ او لعلش گواہی می دہد | از مرہم دیگر بہ بیں کارِ مسیحائے دگر
از گوشۂ ابرو ہمی با خندہائے زیرِ لب | دارد بہ قصدِ جانِ من ہر لحظہ ایمائے دگر
در کشورِ جاں اے پری شد خانۂ دل جائے تو | دلدار را جز دل بلی حیف است ماوائے دگر
از ایں ہمہ گل چہرگاں من بر تو نگزیدم کسے | رحمے کہ نبود جز توام جاناں دلارائے دگر
یا تو بدینِ احمدی بہرِ وصالِ من بیا | یا کن مرا عیسیٰ نسب نبود جز ایں رائے دگر
تا کے تغافل آخر از روزِ شمار اندیشہ کن | کامروز را باشد ز پے البتہ فردائے دگر
تاثیرِ عشقِ پاک بیں گر وصلِ تو اے نازنیں | جز دیدنِ رویت مرا نبود تمنائے دگر
خوش آنکہ در بزمِ طرب من با تو باہم روز و شب | تو سرخوش از نارالعنب من مست صہبائے دگر
از حرفِ دولت کامِ جاں شیریں نشست امشب بہم | دارم تمنا از لبت حرفِ شکر خائے دگر
شد از سفارت حاصلم در عشقِ تو نام آوری | زیں رہ بروں کرد از سرم عشقِ تو سودائے دگر

ساحر

شیخ فضلِ حق عرف غلام مینا ساحر تخلص ولد شیخ فضلِ امام متوطن کاکوری جوانے صلاحیت شعار است پیش ازیں خود را مصروفِ نثر نویسی می داشت و از عہدۂ

آں بطورِ استادانِ سلف خوب می برآمد بایائے فقیر خیال موزوں کردنِ شعرِ فارسی درویش گذشت وانچہ موزوں کرد در مشاعرہ ہا خواند و آنرا از نظرِ فقیر گذرانید بطورِ شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ دریں بیابانِ دشوار گذار پا می گذارد و موردِ تحسین و آفریں می شود اگر زمانہ فرصت داد دریں کوچۂ تنگ و تار کہ ہر نااہل را قدم گذاشتن بسیار دشوار است یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود، ازوست:-

زبس شرارِ غم از استخوانِ من برخاست — چہ شعلہا کہ پس از مرگ از کفن برخاست
بذوقِ غربتِ کوئے تو ہر کہ داشت دلے — غبارِ غم شدہ واز کوچۂ وطن برخاست
مگر در آتشِ گل سوخت بلبلِ شیدا — کہ بوئے مرغِ کباب امشب از چمن برخاست
زبسکہ از تفِ دل اشکِ گرم از مژہ ریخت — ہزار شعلہ زہر تارِ پیرہن برخاست
بہ گلشنے کہ چو ساحر سرودیم نالۂ گرم — شرر ز مغزِ دلِ مرغِ نغمہ زن برخاست

نمی یابم دریں محفل حریفِ ہمزبانِ خود — برنگِ شمع خود گریم بسوزِ داستانِ خود
بسودائے شکنجِ دامِ صیادے کہ من دارم — زد آتش بلبلِ باغِ جناں در آشیانِ خود
خوشا بے بال و پر مرغے کہ در فصلِ خزاں چوں من — بنارِ آشیاں زد شعلہ از برقِ فغانِ خود
تو بے پروا خیالت اینکہ بر حالم دلے سوزی — اگر صد رہ زداغِ غم گذارم مغزِ جانِ خود
ازاں بوئے کبابِ دل پس از مردن ز خاک آید — کہ آتش خانہ دارم بہ مشتِ استخوانِ خود
دراں وادی کہ گم شد ہر قدم صد خضرِ رہ پیما — کجا جویم نشانِ نقشِ پا از کاروانِ خود
جوابِ آں غزل ساحر کہ شیخِ خوش سخن گوید — منِ آتش نفس در زیرِ تیغم از زبانِ خود

نہ دیدم جنس از الفت ببازارے کہ من رفتم — نہ چیدم جز گلِ حسرت بہ گلزارے کہ من رفتم
نمکدانہا نگوں کردم بہ داغِ سینۂ بلبل — بایں افغانِ دلکش در چمن زارے کہ من رفتم

آں شمع کہ شب رہ بہ شبستانِ من انداخت
برقیست کہ آتش بہزار انجمن انداخت

مہری زدہ بودم بہ لبِ نکتہ سرائے
وصفِ خط وخالِ تو مرا در سخن انداخت

آں تیشہ کہ برکوہِ جگرمی زنم امروز
صد شعلۂ غیرت بدلِ کوہکن انداخت

نازم بخمِ زلف رسائیِ تو کہ دل را
از دام رہا کردہ بچاہِ ذقن انداخت

فریادِ منِ خستہ ز دستِ دگرے نیست
عشق است کہ کارم تبو پیمان شکن انداخت

زندانِ غمِ تست کہ یوسف صفتاں را
چوں ساحرِ غربت زدہ دور از وطن انداخت

کے از جوہرِ تیغِ گل اندامان خبر دارد
کہ در دستے دلِ خوں گشتہ در یکدست سر دارد

بہ پیشِ چشمِ آں کافر بہ بیدرداں نظر دارد
کہ میگوید فغانِ عاشقِ شیدا اثر دارد

تا کارِ پائے شوق ز سر می تواں گرفت
راہِ عدم چو شمعِ سحر می تواں گرفت

سرگشتہ ماند پیکِ قضا عمرہا و گفت
حاشا سراغِ ساحر اگر می تواں گرفت

مارنجہ ز بے رحمئ صیاد نہ گردیم
از دام اگر سر دہد آزاد نہ گردیم

شاید بہ لبِ تشنہ زند آبِ بقائے
آزردہ دل از خنجرِ فولاد نہ گردیم

ایں آں غزلِ دلکشِ نوری است کہ فرمود
آں نیست کہ از عذرِ ستم شاد نہ گردیم

تا شمع صفت سوخت تمنائے تو مارا
چشمے است سراپا بہ تماشائے تو مارا

عمریست کہ چوں ساحرِ بے نام و نشانت
از خویش بروں کرد تمنائے تو مارا

جاں سوختگاں را چو بمیدانِ تو یابند
عمرِ ابد از شیوۂ جولان تو یابند

آشوبِ دل و آفتِ جاں فتنۂ دوراں — اینہا ہمہ از سروِ خراماں تو یابند
آنانکہ بخوناب طپانند چو بسمل — لذت بدل از کاوشِ مژگان تو یابند
تا حشر بکوثر نفروشند شہیداں — جاں بخش زلالے کہ بہ پیکان تو یابند
ہر جا شود از سینہ دلِ تشنہ لباں گم — برگردِ سرِ چاہِ زنخدانِ تو یابند
سرمایۂ شورِ دل و آشوبِ قیامت — بوئے است کہ از زلفِ پریشان تو یابند
ساحر ہمہ جا زد نفساں گرمِ بیاناں — طرزِ سخنِ عشق ز دیوانِ تو یابند

چہ نالہ در قفس اے مرغِ گلستاں زدہ — کہ پہلوئے منِ خونین جگر سناں زدہ
ز جامِ مے کہ شب از چشمِ من نہاں زدہ — ہزار شعلہ بر شکم بہ مغزِ جاں زدہ
فتد بجانِ تو برق اے ادب کہ وقتِ سخن — بہ بزمِ وصل مرا قفل بر دہاں زدہ
ہماں بروئے تو ہنگامۂ نظر گرم است — بہ تیغ گردنِ من گرچہ شمع ساں زدہ
کبابِ آتشِ رشکِ تو گشتم اے لبِ جام — کہ بوسہ برلبِ آں مستِ سرگراں زدہ

نہ بیمِ حشر نہ اندیشۂ جزائے ہست — تو جور پیشہ نہ دانستہ خدائے ہست
ز بیمِ خوئے تو قاتل بحشر نتواں گفت — کہ خصمِ جانِ کسے خنجر آزمائے ہست
اسیرِ حلقۂ دامم دلے ببوئے چمن — نگاہِ من برہِ آمدِ صبائے ہست
جوابِ آں غزل است ایں کہ گفتہ است قتیل — نہ دشمنے سرِ نعشم نہ آشنائے ہست

اے باد رسی آخر تا دامنِ یارِ من — دو دشت چہ گراں گردد از مشتِ غبارِ من
پروانہ صفت گردد گردِ تو غبارِ من — اے گل شگفتہ باشی گر شمعِ مزارِ من
وقتیکہ دریں صحرا ترکانہ بہ صید آئی — ظلم است اگر پوشی چشمے ز شکارِ من

دل رفته ز کف بیروں جا کرد بسرِ سودا | تا بر سرِ کوے او افتاد گذارِ من
زیں رشک چساں آتش در دل نه فتد ساحر | شد بزمِ کساں روشن از شعلهٔ عذارِ من

ما را به قیدِ جسم و غمِ جاں گداختند | ایں شمع را به تیرِ شبستاں گداختند
آتش دلانِ وحشتِ فراقِ تو کوه سنگ | سیماب ساں ز گرمیِ افغاں گداختند
از غیرتِ تواے نئے کلکِ هندیم | آتش دمانِ خاکِ صفاهاں گداختند
در عشقِ برق روئے بتے از ازل مرا | سر تا قدم چو ساحرِ نالاں گداختند

حرفے نه میانست میانے که تو داری | رمزے بزبانست دهانے که تو داری
زاں تیرِ تو از تیرِ قضا بیشتر افتد | کز حلقهٔ چشم است کمانے که تو داری
ساحر همه عاشق سخناں رفته ز خویشند | در پیشِ لبِ سحر بیانے که تو داری

نگه به گوشهٔ چشمت بدل چناں افتد | که تیر بر هدف از حلقهٔ کماں افتد
کشاده ام بدعا دست و دل کشیدم پیش | که گر خدنگِ تو افتد بریں نشاں افتد
فغانِ بلبلِ زارے زند بجاں ناخن | که در هجومِ گل از چشمِ باغباں افتد
خروشِ مرغِ چمن آں زماں خراشد دل | که کارِ باغ بتاراجیِ خزاں افتد
بجانِ ساحرِ شیدا فتد ز رشک آتش | حدیثِ شوقِ تو هر جا که بر زباں افتد

سرور

لاله لچهمی رام پنڈت متخلص به سرور وطنِ آبائی ایشاں کشمیر است از یک دو
پشت در هندوستان استقامت گرفته شعر را به صفائی تمام میگوید عمرش متجاوز از شصت

خواہد بود فقیر او را در مشاعرۂ مرزا حاجی دیدہ، صاحبِ دیوان است. از وست:-

اے بست خوں بجگر کردہ بدخشانی را | رشکِ فرما شدہ روے تو گلستانی را
آہ ازیں چرخ جفا پیشہ کہ در فصلِ بہار | می کند جا بہ قفس مرغِ خوش الحانی را
سرورا مشب چو حزیں آہ و فغانے داری | عشقت آمیخت بدل دردِ فراوانی را

سپند

میرزا لطیف بیگ سپند تخلص ولد مرزا دائم بیگ ابنِ منعم بیگ رسالدارِ عہدِ وزارت از عہدِ نواب شجاع الدولہ جنت آشیاں تا ایں زماں جوانِ مہذب الاخلاق و با اعتقاد است چوں بمقتضائے موزونیٔ طبع چیزے کم کم موزوں می کرد شوقِ دلش او را بسوئے من رہ بر و بمعرفتِ میاں فہیم بحلقۂ شاگردیٔ فقیر در آمدہ و قدرت بر غزل گفتن پیدا کردہ عمرش تخمیناً بست و دو سالہ خواہد بود، از وست:-

میں اسیرِ غم کہاں اور کوچۂ قاتل کہاں | یہ نہیں معلوم جا کر دل ہوا گھائل کہاں
بیٹھ کر مجھ سے اٹھا جاتا نہیں اے ہمرہاں | مجھ نحیف و زار سے طے ہو سکی منزل کہاں
یار سے اُس سے زمین و آسماں کا فرق ہے | چاند سا مکھڑا کہاں اور وہ مہِ کامل کہاں
چاک کر سینے کو میرے یار تو پچھتائے گا | زخمِ غم رکھتا ہوں میں پہلو میں میرے دل کہاں
جامِ مے پہنچے وہاں پر تیری باعث ای کلال | ورنہ لب اسکے کہاں تھے اور میری گل کہاں
کشتیٔ صد پارہ کی تختے پہ ہوں میں جاں بلب | دیکھئے لیجائے یہ دریائے بیساحل کہاں
یار کا خالِ زنخداں ہو گیا ہے اے سپند | دیکھیو آنکھ کا ہے جا تیلی کا میرے تل کہاں

جانتے تھے ترے ہاتھوں سے ہیں نالاں کتنے | دل دیا ہم نے تجھے ہم بھی تھے ناداں کتنے
بن چکی زلف کہیں ہاتھ سے رکھو شانہ | ورنہ ہو جائیں گے دل اور پریشاں کتنے

عیدِ قرباں کو بھی اُس شوخ نے دروا نہ کیا
مر گئے سر کو ٹپک قیدیٔ زنداں کتنے

مرضِ مرگ سے آخر کو وہ ناچار ہوا
گو فلاطوں کے تئیں یاد تھی درماں کتنے

گھر سے میرے ترا جانے کو نہیں جی کرتا
پاؤں پھیلائے ہیں تو نے شبِ ہجراں کتنے

مریضِ عشق ہو جو اس کو کیا شفا ہووے
الٰہی کوئی کسی کا نہ مبتلا ہووے

جدائی عاشق و معشوق کی قیامت ہے
کسی سے یار کسی کا نہ یوں جدا ہووے

جرس کرے ہے فغاں یوں جو ہمرہاں ہر دم
نہ ناتواں تو کوئی پیچھے رہ گیا ہووے

ملا کرے ہے وہ ہاتھوں میں خونِ دل میرا
نہ اس قدر بھی کوئی مائلِ حنا ہووے

بہت سا مشکِ ختن تو نے سر اٹھایا ہے
خدا کرے کہ کہیں زلفِ یار وا ہووے

سپندؔ اب تو دیا ہم نے اپنا دل اُس کو
ہمارے حق میں برا ہووے یا بھلا ہووے

جاں لبوں پر ہے دم شماری ہے
آج کی رات ہم پہ بھاری ہے

چین دل کو نہیں کسی کروٹ
بیقراری سی بیقراری ہے

قبر میں بھی نہ دیگا چین مجھے
گر یہی دل کی بیقراری ہے

سامنے واں رکھا ہے آئینہ
اور یہاں آہ دم شماری ہے

نہیں بچنے کا میں کسی عنواں
زخمِ تیغِ فراق کاری ہے

حرفِ شکوے کا لب پہ لا نہ سپندؔ
کام عاشق کا جاں نثاری ہے

کٹ گئی وصل کی شب باتیں ہی کرتے کرتے
دل کے دل ہی میں رہے اپنے تو ارماں کتنے

ذرۂ ریگ بھی مامور ہے اب منہ ان سے
یا نگوں تھے مرے زخموں پہ نمکداں کتنے

ایک پل تو مہ و خورشید برابر ہو جائے | آئینہ کاش دوچار رخِ دلبر ہو جائے

پیشِ نظر جب اپنے وہ گل پیرہن نہ ہو | کس طرح خار آنکھوں میں سیرِ چمن نہ ہو
ہم بھی جواب رکھتے ہیں دشنامِ تلخ کا | باتیں تو وہ سنے جو کسی کے دہن نہ ہو
یہ جانیو کہ عاشقِ زلفِ بتاں نہ تھا | مرنے کے بعد پاؤں میں جسکے رسن نہ ہو
سختی سے جاں لبوں پہ گر آوے فراق میں | تو بھی تو نرم وہ بتِ پیماں شکن نہ ہو
منزل پہ پہنچ رہوں گا میں نازک دماغ ہوں | تو اے جرس برائے خدا نعرہ زن نہ ہو

پنہاں مری آنکھوں سے وہ صورت ہوئی تھی | برگشتہ کبھی ایسی تو قسمت نہ ہوئی تھی
مائل کہیں جبتک کہ طبیعت نہ ہوئی تھی | اے ہم نفساں اپنی یہ حالت نہ ہوئی تھی

ردیف (ش)

شعلہ

شیخ محمد سلیمان شعلہ تخلص ولد شیخ محمد عیسیٰ مفتی قصبۂ دیوا شیخ قریشی جوانِ شوریدہ مزاج است در ہمانجا مولد و نشو و نمائے اوست(۱) از چندے در لکھنؤ استقامت دارد پیش ازیں کم کم فکرِ شعرِ فارسی می کرد حالا دریں ایام فکرِ شعرِ ہندی می کند و آنرا بقلمِ اصلاحِ نوازش حسین می رساند، عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود، از وست:

سنتے ہیں ترا یار ملا اور کسی سے | دل تو بھی چل اب جی کو لگا اور کسی سے

---

(۱) یافتہ۔ (ن)

ہم وہ ہیں کہ مرجائیں پراے رشکِ مسیحا تجھ بن کبھی پوچھیں نہ دوا اور کسی سے

نہ کرو شیفتۂ زلف کو زنجیر عبث خود گرفتار ہی یہ اس کی ہی تدبیر عبث
تیرے دیوانے کی ہی قید سے نالاں ہی ایک غل مچاتا نہیں ہر حلقۂ زنجیر عبث
جل ہی جاؤں تو مرے حال پہ شاید وہ جلے شعلہ اب اُس کے سوا اور ہی تدبیر عبث

شمیم

شیخ محمد صابر شمیم تخلص ولد شیخ عبداللہ جوانِ مہذب الاخلاق و دلچسپ و منش عمرش سی سالہ خواہد بود، از سہ سال شوقِ نظمِ[1] شعرِ ہندی دامنِ دلش بسوئے خود کشیدہ ہرچہ گفت آنرا بہ نظرِ فقیر در آوردہ، از وست:-

دل مرا جس بتِ پرفن کا طلب گار رہا اُس کو صورت سے مری زیست تک انکار رہا
مفت وہ جنسِ گراں ہاتھ لگی ہے اپنے سالہا شہر سبھی جس کا خریدار رہا
ڈر سے قاتل کے اٹھایا نہ کسی نے ہرگز لاشہ افتادہ مرا بر سرِ بازار رہا
رازِ دل کس سے کہوں جا کے بتا تو ہی شمیم نہ شفیق اپنا کوئی اور نہ غمخوار رہا

مت کھولنا تو کاکلِ پیچیدہ دیکھنا ظالم نہ کھل پڑے دلِ شوریدہ دیکھنا
مانی نے اُس کی دی مجھے تصویر یوں کہا رکھیو چھپا کے یہ ورقِ چیدہ دیکھنا
لاتا ہے میرے دیدۂ خونبار پر بلا مستی کو لب سے یار کے چسپیدہ دیکھنا
باغِ جہاں میں آہ نہ روزی ہوا ہمیں نخلِ امید کا کبھی بالیدہ دیکھنا
نالے سے تیرے چونک نہ اٹھیں کہیں دلا کنجِ لحد میں مردمِ خوابیدہ دیکھنا

---

(۱) شوقِ شعر گوئی (ن)

خندہ زن مستی لگا جب وہ بتِ پرفن ہوا — لوگ یہ سمجھے شگفتہ غنچۂ سوسن ہوا
یہ وسیلہ مغفرت کا میری سمجھو روزِ حشر — کوچہ اُس رشکِ بتاں کا جو مرا مدفن ہوا
بعد مرنے کے کیا قسمت نے اتنا تو سلوک — کاسۂ سر اپنا پامالِ سمِ توسن ہوا
تیرہ بختی کے سبب اُس چہرۂ پرنور سے — کلبۂ احزاں نہ اپنا ایک شب روشن ہوا
گردشِ قسمت سے یہ مجکو گلا ہے اے شمیمؔ — کوچۂ دلدار میں اغیار کا مسکن ہوا

چشمِ نرگس کی کھلے پر بھی تو بیدار ہے کب — سچ ہے حیرت زدہ کو لذتِ دیدار ہے کب
بلبلِ گلشنِ تصویر ہوں میں ہم نفساں — قابلِ نالہ کشیدن مری منقار ہے کب
کس لیے جھاڑے تو صحنِ چمن بادِ بہار — اُس کو میلانِ طبیعت سوئے گلزار ہے کب
مدعی رشک سے کرتا ہے یہ تہمت مجھ پر — اُس کے اور میرے بھلا وصل کا اقرار ہے کب

مت خوں سے اپنے چوبِ قفس رنگ، عندلیب — ہوتا نہیں پھڑکنے کا یہ ڈھنگ عندلیب
گا ہے خزاں ہے اس میں کبھی موسمِ بہار — باغِ جہاں کا ہے یہی رنگ عندلیب

دریغ! لیلیٰ! تو سوئے عدم سدھاری آج — کرے گا قیس کی پھر کون غمگساری آج
امیدِ زیست کی اپنی مجھے نہیں ہرگز — لگا ہے دل پہ مری زور زخمِ کاری آج
حنا لگا کے کیا خونِ دل کو عاشق کے — نظر پڑی ترے ہاتھوں کی دستکاری آج
شمیمؔ ہی نہیں کچھ مصحفیؔ سے فیض اندوز — ہے خار و گل پہ بہم فیض اسکا جاری آج

تدبیر کوئی اب نہیں بن آتی ہے مجکو — وہ دیکھوں ہوں تقدیر جو دکھلاتی ہے مجکو
یہاں تک غمِ فرقت سے بدن ہو گیا لاغر — بستر پہ اجل ڈھونڈھ کے پھر جاتی ہے مجکو

نقشے کے ترے روبرو اے مایۂ خوبی　　یوسف کی بھی تصویر نہیں بھاتی ہے مجکو

ملنا نہیں گر یار کا قسمت میں تو اے مرگ　　کیوں گور کی آغوش کو ترساتی ہے مجکو

پھرتا ہوں میں کب بندگیٔ پیر مغاں سے　　اے بنتِ عنب کس لئے بہکاتی ہے مجکو

ملتا ہی نہیں محملِ لیلیٰ کا ٹھکانا　　بانگِ جرس اس دشت میں دوڑاتی ہے مجکو

چتون میں مصور نے یہ انداز رکھا ہے　　تصویر تری دیکھ کے شرماتی ہے مجکو

آ جلد کہیں اے بتِ بے رحم کہیں جلد　　بیتابئ دل رات کو تڑپاتی ہے مجکو

اس وقت چمن سے تو شمیم آیا ہے شاید　　تجھ سے جو چلی پھولوں کی بو آتی ہے مجکو

رہے وہ زینتِ گیسوئے مشکبو کرتے　　تمام رات گئی ہم کو ہائے ہو کرتے

ملا پتہ نہ کہیں شاہدِ وفا کا ہمیں　　عدم سے یہاں تلک آئے تھے جستجو کرتے

غضب تو یہ ہے نہیں نیند رات کو آتی　　وگرنہ خواب ہی میں اُس سے گفتگو کرتے

اُدھر کو چاک کیا سینہ بخیۂ غم نے　　ادھر کو جیب رہے بخیہ گر رفو کرتے

ملی نہ دیدۂ خونبار سے ذرا فرصت　　نت آستیں کو رہے ہم تو شست و شو کرتے

مہندی نہ اُسکے پاؤں کی ہاں رات بھر کھلی　　یہاں چشمِ انتظار رہی رات بھر کھلی

بستر سے ضعفِ تن نے نہ ہلنے دیا ہمیں　　سنتے ہیں رات واں رہی زنجیرِ در کھلی

کرتا رہا میں شانہ صفت موشگافیاں　　لیکن نہ کچھ حقیقتِ موئے کمر کھلی

نت قتلِ عاشقاں پہ رہا مستعد وہ شوخ　　دوش و کمر سے اُس کے نہ تیغ و سپر کھلی

میں تیغِ انتظار کا کشتہ ہوں اے شمیم　　تربت میں بھی رہے گی مری چشمِ تر کھلی

بھنور سے نکلی کہ طوفاں سے پھر دوچار ہوئی　　ہماری کشتی نہ ساحل سے ہم کنار ہوئی

آپ سے کیا میں پھنسا زلفِ گرہ گیر میں تھا ۔۔۔ کیا کروں دامِ بلا تو مری[1] تقدیر میں تھا
وائے ناکامی مرا ٹوٹ گیا شیشۂ دل ۔۔۔ اس پری رو کے میں تسخیر کی تدبیر میں تھا

یارب پھر ایک بار تو اُس سے ملا مجھے ۔۔۔ جاتا رہا جو وصل کی شب پھر دکھا مجھے
درکار کیا ہے میرے لئے تیغِ آب دار ۔۔۔ کرتی ہے قتل تیری یہ سادی ادا مجھے
صورت دکھا کے خواب میں اپنی وہ دلفریب ۔۔۔ اک تازہ داغ از سرِ نو دے گیا مجھے
راہِ ختن سے میں تو نہ واقف تھا اے شمیمؔ ۔۔۔ اُس کا خیالِ زلف ہوا رہنما مجھے

دل یارِ جفا جو سے گرفتار نہ ہووے ۔۔۔ الفت کا کسی شخص کو آزار نہ ہووے
گر قتل نگاہوں سے مجھے اے بتِ خونخوار ۔۔۔ آغشتہ بخوں تا تری تلوار نہ ہووے
بیدار نہ ہوویں کبھی ہم خوابِ عدم سے ۔۔۔ محشر پہ اگر وعدۂ دیدار نہ ہووے
کس واسطے وہ جا کے پھنسے دامِ بلا میں ۔۔۔ بلبل کو اگر خواہشِ گلزار نہ ہووے
مانگیں ہیں نہ عاشق ہیں مرے یہ مجھے دشمن ۔۔۔ چنگا کسی صورت سے یہ بیمار نہ ہووے
میں گلشنِ فردوس میں جاتا ہوں ولیکن ۔۔۔ مشکل ہے جو واں سایۂ دیوار نہ ہووے
اے گل یہ روا ہے کہ تری بزمِ طرب میں ۔۔۔ سب ہوویں شمیمؔ جگر افگار نہ ہووے

لیلےٰ تو چل کے دیکھ تماشا ہے بن میں زور ۔۔۔ مجنوں نے سیج نکالی ہے دیوان پن میں زور
ابرِ تنگ میں جوں ہو عیاں ماہِ چاردہ ۔۔۔ جھلکے ہے اُس بدن کی صفا پیرہن میں زور
بعد از فنا بھی دیدۂ خونبار نے شمیمؔ ۔۔۔ ہم کو بہار اپنی دکھائی کفن میں زور[2]

---

(۱) ہی۔ (ن)
(۲) نسخہ رام پور میں شمیمؔ کے یہ شعر زیادہ ہیں :- (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۴)

شاد

رجب بیگ خاں شادؔ تخلص برادر زادۂ حیدر بیگ خاں جوانِ موزون الطبع از قدیم سرے بہ صاحبانِ سخن دارد و اکثر کلامِ خود را بہ نظرِ قلندر بخش جرأت گذرانیدہ۔

ازوست:-

بن اس کے ہیں چمن دل میں اپنے داغ بھرے
کہ جوں بہ موسمِ گل ہوں گلوں سے باغ بھرے

یہ نالۂ دلِ سوزاں نے شعلہ بازی کی
کہ جتنے خالی تھے مطبخ کے سب اوجاغ بھرے

سمجھ گلوں پہ نہ شبنم تو اے بتِ مے نوش
بہار نے یہ مئے ناب سے ایاغ بھرے

صبا چمن میں جو لیجائے نگہتِ جاناں
تو بوے عطر سے گل کا نہ کیوں دماغ بھرے

وہ گل ہو کیوں نہ بھلا ے دماغ پھر اے شادؔ
جو عاشقی کا دم اسکی ہر ایک زاغ بھرے

شاعر

میر کلو شاعرؔ تخلص خویشِ خواجہ میر دردؔ مرحوم مردِ بزرگ و سنجیدہ و فہمیدہ بود ہمیشہ آنرا بخدمتِ ایشاں از حاضرانِ وقت می یافتم، کمالِ کسرِ نفسی در خود داشتند،

کہیں تو خوں پڑا ہے اور کہیں پر اڑتے پھرتے ہیں
مزا بلبل نے پایا باغ میں دھومیں مچانے کا

چمن میں ہر طرف کو آتشِ گل شعلہ افگن ہے
خدا حافظ ہے اے بلبل تیرے آشیانے کا

شمیمِ ناتواں ایک دن نہ ایک دن قتل ہوئیگا
اسے لپکا پڑا ہے کوچۂ قاتل میں جانے کا

زلفِ جاناں کا بنا شانہ نہ ایک دن دستِ شوق
پیچ ہے اے ہم نشیں یہ بھی مری تقدیر کا

سلاسل جعدِ سنبل کو میں دیوانہ سمجھتا ہوں
چمن اسے غیرتِ گلزار تجھ بن مجکو زنداں ہے

دیوانِ ضخیم در زبانِ ریختہ ترتیب دادہ اند، چوں کلامِ ایشاں دراں روزہا کہ تذکرہ را دل می نوشتم بہم نرسید لہذا مرفوع القلم ماندحالا از جائے شعری بہم رسیدہ برائے یادگار بہ طریقِ ندرت نوشتہ شد، از وست :۔

گریباں پھاڑ کر کیدھر نکل جاویں ہم اے وحشت　　ہوئی ہے زندگی ناحق گلے کا ہار کیا کیجے

شرف

میر محمدی شرف تخلص کہ حال[1] درویشی بر خود درست داشت شخصِ سنجیدہ و فہمیدہ دیدمش دوبارہ بنائے مشاعرہ در شاہجہاں آباد گذاشتہ و یارانِ موزوں طبع را خواندہ بندہ ہم در مشاعرۂ ایشاں رفتہ بود۔ شعرے از ایشاں بہم رسیدہ۔ اینست :۔

صاف دل کا مرتبہ ہے عرش و کرسی سے بلند　　جلوہ گر ہے آسماں زیرِ زمینِ آستر

شور

خواجہ عاصم خاں شور تخلص از احوالِ ایشاں آگاہی نہ دارم، دو شعر از بیاضے نوشتہ شد اینست :۔

آرزو یہ ہے کہ اس طرح دن اور رات کٹے　　جتنی باقی ہے مری عمر ترے سات کٹے

آہ و فریاد ترے خوف سے کم کرتے ہیں　　پر میاں دل ہی سمجھتا ہے جو ہم کرتے ہیں

شورش

میر غلام حسین شورش تخلص، از قدما ست :۔

---

(۱) حالا لباس درویشی آراستہ است۔ (ن)

کیا چشم ہے وہ چشم کہ جو چشم تر نہ ہو
وہ آہ کیا بلا ہے کہ جس میں اثر نہ ہو

شاداں

قطب علی شاداںؔ تخلص۔

میں جو اک عاشقِ بیمار ہوں کن کا ان کا
کشتۂ ابروئے خمدار ہوں کن کا اِن کا

جمع عشاق ہیں شاداںؔ کی طرف کر کے خطاب
بول اٹھا یار کہ میں یار ہوں کن کا اِن کا

شایق

رائے امر سنگھ شائقؔ تخلص۔

ایک دل تھا مرے اسبابِ جہاں میں باقی
سو بھی وہ سوختۂ آتشِ ہجراں نکلا

شایق

لالہ سیوا رام شایقؔ تخلص جوانِ شوریدہ سر است بمقتضائے موزونیِ طبع چیزے بجائے خود موزوں می کرد و آنرا بہ مشورۂ مرزا علی نظیر می رسانید چوں فی الجملہ طاقتے دریں فن پیدا کرد کارِ مشورہ را بہ فقیر سپرد و شعر را بطور معنی مندانہ گفتن عادتِ خود ساخت بعد چندے پیشِ خواجہ حیدر علی آتشؔ رفت و کلامِ خود را بایشاں می نماید عمرش قریب سی سالہ خواہد بود ازوست:۔

یوں مرے لختِ جگر ہیں دیدۂ پُر آب میں
جیسے لہراتی ہیں گلگوں مچھلیاں تالاب میں

بام ہو ساقیِ خوش رو ہو بغل میں یار ہو
بادہ نوشی کا مزہ جب ہے شبِ مہتاب میں

کاٹتا ہوں میں تڑپ کر جس طرح سے روزِ ہجر
یہ قلق ہوتا نہیں شب کو دلِ سرخاب میں

دیکھ وہ آئینہ ہنستا ہے تو یوں جھڑتے ہیں پھول
پھلجھڑی کو جس طرح سے چھوڑتے ہیں آب میں

بخت خفتہ نے نہ پل بھر آنکھ لگنے دی مری
یار نے جس شب کیا آنے کا وعدہ خواب میں

ہر حباب بحر بن جاتا ہے نافہ مشک کا
کھول کر زلفیں نہاتا ہے وہ جس دم آب میں

رحم اب اے شدت گریہ بحال بیکساں
گھر غریبوں کے بہے جاتے ہیں یہاں سیلاب میں

ابلہی ہے ڈھونڈنا زیر فلک آسودگی
گاؤ کو فربہ نہ دیکھا خانۂ قصاب میں

اُسکی نورانی جبیں پر داغ چیچک کے نہیں
موتیا کے پھول پھولے ہیں شب مہتاب میں

در بدر ہم ٹھوکریں کھاتے نہ رسوائی کیساتھ
دوستی کرتے نہ گر اُس طفل ہرجائی کیساتھ

عالم وحشت میں یاد آیا جو سرو قد یار
خوب رویا میں لپٹ کر نخل صحرائی کیساتھ

وہ فراغت سے رہا ہم زندگانی سے تنگ
خضر کو نسبت نہیں کچھ اپنی تنہائی کیساتھ

تخم الفت بوکے پامال حسیناں ہوگئے
مل گئے مٹی میں شایق اپنی دانائی کیساتھ

لگا جاتا ہے برچھی آتے جاتے گور پر میری
ملا یہ پھل مجھے اُس جنگجو سے دل لگانے کا

وقار انساں کا کھو دیتا ہے آخر خندۂ بیجا
دہن ہونا کشادہ عیب ہے موتی کے دانے کا

سبزئ عالم مرے اشکوں کی طغیانی سے ہے
زندگانی جملہ مخلوقات کی پانی سے ہے

کس طرح دھوکا نہ ہو اس پر جبین یار کا
صبح کا تارا مشابہ خال پیشانی سے ہے

چار دن بھی رنگ گل ہرگز وفا کرتا نہیں
اس لئے مجکو گریز اس گلشن فانی سے ہے

میری دھونی پر پریزادوں کا رہتا ہے ہجوم
بوریا بہتر مرا تخت سلیمانی سے ہے

گو ہزاروں ہیں یہاں مرغ خوش الحان نغمہ سنج
رونق گلشن تری شایق غزل خوانی سے ہے

قید ہستی میں نہایت تنگ دل کا حال ہے
مرغ جاں کو سلسلہ تار نفس کا جال ہے

پاؤں کے نیچے سے نکلی جاتی ہی وہاں کی زمیں
میرے نالوں سی یہ کوئے یار میں بھونچال ہی

سلسلہ مجنوں سے جا ملتا ہے مجھ آزاد کا
چرمِ آہو بید کی ٹہنی چھڑی رومال ہی

رُک سکا حلقے سے چشم تر کے کب سیلاب اشک
آ گئے تیغِ موج کے گرداب سی کیا ڈھال ہی

چلتی ہی تلوار روز اُس سیمبر کے واسطے
اہلِ دنیا میں سبب جنگ و جدل کا، مال ہی

مجکو گھایل کرکے رحم آیا اُسے تو دیکھنا
پٹی اپنے زخم کی تلوار کا رومال ہی

کیوں نہ ہو اُس پر بھلا مجکو ہزارے کا یقیں
دیدۂ گریاں مشبک صورت غربال ہی

اس قدر سودا ہی کس کی زلف کا شایق تجھے
نوک نشتر کی طلب کرتی رگِ قیفال ہی

شافی

امین الدین شافی تخلص

مت زخمِ دل کو میرے کوئی التیام دو
ظالم کو بلکہ زخمِ دگر سے پیام دو

ششدر

میر شرف الدین ششدر تخلص ولد میر غیاث الدین ساکن رامپور شاگردِ احمد خاں
غفلت است از کلامش نومشقی معلوم می شود عمرش بست و چہار سالہ خواہد بود، ازوست:-

کیوں کہے ہی باغ سے مجکو نکل اے باغباں
پڑ گیا کیا میرے آنے سے خلل اے باغباں

کیا مزے سی چہچہے کرتی تھی بلبل گل کے پاس
تو نے ناحق آن کر ڈالا خلل اے باغباں

ٹک جو آنکھوں سی ہوا میرے وہ اوجھل باغ میں
کیا ہی بے کل سا میں پھرتا تھا پڑا کل باغ میں

رشک سی ہووے گی نرگس خاک جل جل باغ میں
شوخ مت جا تو لگا آنکھوں میں کاجل باغ میں

کیا گلوں کو کر دیا بادِ خزاں نے پائمال
باغباں روتا ہی تو جوہاتھ مل مل باغ میں

آن کر تیرے چمن میں دل بھی اپنا دے چلے
باغباں ہم نے یہ پایا خوب ہی پھل باغ میں

ایک تو ہم بےکلی سے مر رہے ہیں آپ آج
دوسرے ناصح نے مارا کر کے کل کل باغ میں

گو کہ خوش ہوتا ہی سب کا سیر سے دل باغ میں
پر ہمیں رُوتے ہیں گل سی خوب بلبل باغ میں

مر گئے ہیں ہم کسی گلرو کی دوری میں صبا
کر کسی صورت سے میری خاک داخل باغ میں

سیر کو جس دم گیا وہ باتجمل باغ میں
کیا ہی شرمندہ ہوئے سب غنچہ و گل باغ میں

آہ کیسی خاک اڑائی ہی خزاں نے باغباں
نام کو بھی اب نظر پڑتا نہیں گل باغ میں

سرو کو سکتہ ہوا کس کے قد و قامت کو دیکھ
قمریاں جو کر رہی ہیں شور اور غل باغ میں

کیا تعجب ہے اگر ہو جائے اے ششدر کباب
سن کے میرا نالۂ دل سوز بلبل باغ میں

لے کے دل پوچھتے ہو نام مرا
اس تجاہل کو ہے سلام مرا

جلد آ تا کہ چھوٹیں اس غم سے
نامہ بر کہیو یہ پیام مرا

اُس کی ترچھی نگاہ نے یارو
کر دیا ایک پل میں کام مرا

تیری شرم و حیا نے اے جانی
کھو دیا ننگ اور نام مرا

اب تو غفلت کے صدقے سے ششدر
سب یہ بالا ہوا کلام مرا

ہم نے جس طرف کر نظر دیکھا
وہی محبوب جلوہ گر دیکھا

صورتِ دوست کے سوا ہم کو
کچھ نہ آیا نظر جدھر دیکھا

لوگ کہتے ہیں ہم نے دیکھا یار
کس طرف تھا کہاں کدھر دیکھا

آہ کچھ بھی نہیں وفا اُس میں
کوئی ایسا نہ یہاں بشر دیکھا

کوئی ہمدم ملا نہ یہاں ششدر
خوب ہم نے تلاش کر دیکھا

جب سے پہلو سے ہوا ہی[۱] وہ دلِ زار جدا — تن سے ہی جان جدا جاں سی تنِ زار جدا
اینٹھ لیتی ہی مرے دل کے تئیں اے ہمدم — زلف بل دار جدا ابروئے خمدار جدا

آج تک اس شکل کی دیکھی نہیں تصویر ایک — خامۂ قدرت سے گویا یہ ہوئی تحریر ایک
شمع ساں سب تن بدن جل کر ہوا ہمنت آہ — سوزِ دل سے جب میں کھینچا نالۂ شبگیر ایک
مجھ سے وحشی کے تئیں پابند کرنے کیلئے — ہمدمو بس ہی کفایت زلف کی زنجیر ایک
کیوں دلا رنج و مصیبت تو اٹھاتا ہی عبث — ترک کر ملنا بتوں سی ہی یہی تدبیر ایک
کیا ہمارے حال پر تھی مہربانی آپ کی — کل جو مدت میں کیا نامہ ہمیں تحریر ایک
بخش دے بوسہ لیا ہی خواب میں تشندر نے رات — بس یہی مدت میں کی ہی آپ کی تقصیر ایک

کیا تڑپوں ہوں ہر شب ترے ایوان کے نیچے — تو دیکھ تو کوٹھے پہ ذرا آن کے نیچے
تھمتے جو نہیں اشک اب ان آنکھوں سے اک پل — ہے ابر مگر دامنِ مژگان کے نیچے
کیا اُس نے کیا ہے تہ و بالا مرے دل کو — بالا جو لٹکتا ہی ترے کان کے نیچے
مانند بگولے کے مری خاک بھی تشندر — گردش میں ہی اس گردشِ دوران کے نیچے

شوق

مولوی قدرت اللہ مرحوم شوق تخلص ساکن رامپور فاضل متبحر بود بمقتضائے موزونیٔ طبیعت فکر شعر ہم می نمود و آنجا نظیرِ خود نہ داشت، اکثر مردمِ آں نواح بہ حلقۂ شاگردیش آمدند، از دست ؛ -

بال بال اُس زلف کا رہتا ہی لہرایا ہوا — جس طرح چلتا ہے کالا ناگ کترایا ہوا

---

(۱) یہ دن ؟

بہکی بہکی ہم سے باتیں آج جو کرتا ہی شوخ — کچھ نہیں معلوم کس کا ہی وہ بہکایا ہوا
آتش غم سے نہ ہو کیوں چشم میری اشکبار — کہتے ہیں برسے ہی بادل خوب گرمایا ہوا
کہتے ہیں اس کو نزاکت چہرہ اُسکا پھول سا — گرمیِ نظارہ سے رہتا ہے کمھلایا ہوا
رال منہ سی خام طبعوں کے چوئی ہی جوں ثمر — جب سے دیکھا ہی بدن اُسکا وہ گدرایا ہوا
جانئے کیا ضد ہے میری ساتھ اُسکو ہمدو — دیکھ کر محفل میں مجکو پھر گیا آیا ہوا

گو نگاہوں سے وہ عالم کی نہاں رہتا ہی — پر ہر اک شان میں نت جلوہ کناں رہتا ہی
دل میں کس طرح مری غیر کے ہووے جاگہ — اس مکاں میں تو وہی مالکِ جاں رہتا ہی
جوں نگیں منہ کیا کالا ہیں سیہ کاری کر — روسیاہی میں بھی اک نام و نشاں رہتا ہی
یہ ادا دیکھ کے کیوں گل نہ گریباں پھاڑیں — مسکراتا ہی مرا غنچہ دہاں رہتا ہی
کوچے میں اپنے وہ مظلوموں کی سن کر فریاد — پوچھتا ہی کہ یہ کیا شور فغاں رہتا ہی
میرے مرقد پہ وہ اب آکے زراہِ اخلاص — کیا کروں پہروں تلک فاتحہ خواں رہتا ہی
مردمِ چشم مرا مردمِ دریائی ہے — سیل میں اشک کے جو غوطہ زناں رہتا ہی
شوقؔ پھر کہہ غزل اک تاکہ یہ سمجھیں سب لوگ — رامپور میں کوئی استادِ زماں رہتا ہی

گو کہ وہ جانِ جہاں مجھ سے نہاں رہتا ہی — رکھیو خوش اس کو تو یا رب وہ جہاں رہتا ہی
گو کہ اب دل سے مجھی تو نے بھلایا ظالم — پر ترا ذکر مجھے وردِ زباں رہتا ہی
ابر ساں میں تو سدا گریہ کناں رہتا ہوں — برق سا مجھ پہ وہ نت خندہ زناں رہتا ہی
جب سی دل اپنا دیا شوقؔ نے اُس قاتل کو — درپئے جاں ہی وہ سفاکِ زماں رہتا ہی

شفق

میاں بندعلی شفق تخلص جوانِ مہذب الاخلاق است پیش ازیں چند سال نقیر در روز ہائے کہ بنائے مشاعرہ تجدید بر روش انداختم بحلقۂ شاگردی من در آمدہ و چند غزل را باصلاح رسانیدہ، عمرش تخمیناً از سی متجاوز خواہد بود، ازوست:-

اس لاغری پہ رنج دہِ دوستاں ہوں میں — ہر چند ہوں سبک پہ دلوں پر گراں ہوں میں

اے اضطرابِ دل نہ تصدق چمن کا کر — رہنے دے مجکو باغ میں بے آشیاں ہوں میں

بیخود کیا ہے عشق نے ایسا کہ ان دنوں — معلوم کچھ نہیں مجھے یارو کہاں ہوں میں

ناقہ کہے ہے دوڑیو مجنوں ادھر شتاب — آیا ہوں آج نجد میں بے سارباں ہوں میں

اس دیکھنے کے واسطے مجکو بُرا بھلا — جو جی میں آوے کہہ تو میاں بے زباں ہوں میں

رہتا ہے دھیان اُس کا شب و روز اے شفق — جاتا ہوں جس مکان میں رہتا جہاں ہوں میں

یہی لکھا تھا خدا نے مری تقدیر کے بیچ — دل پھنسے جا کے تری زلفِ گرہ گیر کے بیچ

موئے ابرو کا ترے اُس میں پڑا ہے سایہ — اے غلط فہم یہ جوہر نہیں شمشیر کے بیچ

آ کے دنیا میں ملوث نہ ہو خاکی پتلے — شستگی شرط ہے انسان کی تعمیر کے بیچ

تیری چاہت میں شفق کا ہے میاں حال تباہ — نہ وہ تحریر میں آتا ہے نہ تقریر کے بیچ

شاداں

شیخ نبی بخش شاداں تخلص از تلامذۂ میاں پیر بخش مستر جوانِ مہذب الاخلاق است از ابتدائے شباب سرے بگفتنِ شعر داشت آخر ایں کار را سزاوار شدہ عمرش سی و پنج سالہ خواہد بود، ازوست:-

گو شام شبِ ہجر میں رو رو کے سحر کی
تو بھی نہ مرے حال پہ کچھ اُس نے نظر کی
طے کر گئے اک آن میں ہم عشق کی منزل
ہر چند کہ تھی راہ بڑے خوف و خطر کی
صد شکر کہ رخصت کا کلام آنے نہ پایا
بس مر گئے سنتے ہی خبر ہم تو سفر کی

اک اشارے ہی میں اغیار کے اٹھ جاتے ہو
لاکھ منت سے کبھی گھر جو مرے آتے ہو
خوں بہانا تمھیں شاید ہے کسی کا منظور
ہاتھ میں تب تو حنا غیر سے لگواتے ہو
میں تمھیں ذبح کے دم دیکھوں ہوں کس حسرت سے
قہر ہے اس پہ بھی تم رحم نہیں کھاتے ہو

جدا جو رُخ سے کسی کی نقاب ہوتا ہے
تو آپ شرم میں غرق آفتاب ہوتا ہے
جو صبر و شکر سے کاٹی ہیں ہجر کی راتیں
اُسی کو وصل میسر شتاب ہوتا ہے
عدول کر کے میں ناصح کا حکم پچھتایا
کہ خود پسند ہی سچ ہے خراب ہوتا ہے
جہاں کہ ہووے ہے پوشیدہ ربط اے ہمدم
دلوں میں دوستی کا وہاں حساب ہوتا ہے
ہم اپنے عہدِ جوانی کو یاد کرتے ہیں
کہیں جو ذکرِ شراب و کباب ہوتا ہے
بچے ہے آتشِ دوزخ سے وہ ہی اے شاد آں
کہ جس کے دل میں غمِ بوتراب ہوتا ہے

ظاہر ہر ایک پر مرا رازِ نہاں نہ کر
اے دل شبِ فراق تو آہ و فغاں نہ کر
کیا فائدہ جو جان سے جاوے کوئی غریب
کہنے سے غیر کے تو مرا امتحاں نہ کر
بزمِ بتاں کی سیر سے محروم میں ہوں
اے عشق اس قدر بھی مجھے ناتواں نہ کر
قاتل نے ناتوان مجھے جان کر کہا
زخمِ دگر سے تو ہوس اے نیم جاں نہ کر
لیلیٰ نے جا کے وادیٔ مجنوں میں یوں کہا
یہاں سے ارادہ چلنے کا اے سارباں نہ کر
غم نے گھلا دیا انھیں پہلے ہی اے ہما
تو جسم میں تلاش مری استخواں نہ کر

جھوٹی خبر نہ ہو کہیں قاصد کے مرگ کی　　شاداں ابھی تو آنکھوں سے آنسو رواں نہ کر

کچھ اُس کی فنِ عشق میں توقیر نہیں ہے　　جس شخص کی گردن تہِ شمشیر نہیں ہے

اک بوسہ پہ جلاد کے کرتے ہو حوالے　　اتنے سے گنہ کی تو یہ تعذیر نہیں ہے

آجائے جو بھولے سے کبھی اُس کا تصور　　اتنی بھی مری آہ میں تاثیر نہیں ہے

کیا خاک خوش آوے مجھے عالم کا مرقع　　پیشِ نظر اُس شوخ کی تصویر نہیں ہے

سمجھوں ہوں جسے دوست وہ ہو جائے ہے دشمن　　میری سی کسی شخص کی تقدیر نہیں ہے

زندگانی کا مزہ وصل کے اقرار میں ہے　　موت اپنی تو صنم بس ترے انکار میں ہے

گور کے مردوں کو دیتا ہے تو ٹھوکر سے جِلا　　معجزہ عیسیٰ کا ظالم تری رفتار میں ہے

دار وے وصل ملے تو اُسے ہوتی ہے شفا　　یک رمق جان ابھی ہجر کے بیمار میں ہے

خنجرِ عشق سے کاٹوں میں ابھی اپنا گلا　　غیر کا خون لگا کیوں تری تلوار میں ہے

وصل سے اسکے تو مایوس نہ ہو اے شاداں　　ایک دن باقی ابھی وعدۂ دیدار میں ہے

کیا ہے قتل اُس نے اس لئے تلوار سے مجکو　　محبت تھی نہایت ابروئے خمدار سے مجکو [1]

---

(۱) نسخہ رامپور میں یہ شعر زیادہ ہیں :-

رواں گلے پہ میرے کاش وہ چھری کرتا　　پہ غیر سے نہ میرے سامنے ہنسی کرتا

تیرے دیوانو کو کیا منتِ فصاد سے کام　　نوکِ نشتر کا مزہ دشت کے ہر خار میں ہے

یقیں ہے مجکو شاداں صدمۂ محشر نہ ہوئے گا　　وسیلہ ہے جہاں میں حیدرِ کرار سے مجکو

شگفتہ

مرزا سیف علی خاں بہادر شگفتہ تخلص خلفِ نواب شجاع الدولہ مرحوم مغفور کہ ذکرِ ایشاں در تذکرۂ اول گذشت، شخصِ جامع الکمالات است، در فنِ موسیقی و تیراندازی و شناوری و تصویرکشی و کشتی گرفتن و خطِ نسخ نوشتن دستے تمام دا[۱]رد و بمقتضائے موزونیٔ طبع کہ از طفولیت بود خود را ہمیشہ مصروفِ غزل گوئی داشتند در سرکارِ ایشاں از موزونانِ شہر یعنی مرزا کاظم علی جوان تخلص و منتظر و شاہ ملول الہام آمد و شد می کردند۔ رفتہ رفتہ مرتبۂ سخن را بجائے رسانیدند و دیوانے ضخیم مرتب ساختند از قضا آں دیوان در آتش گرفت خانہ مع اثاث البیت سوختہ ورقے ازاں نماند دل افسردہ شدہ چند سال فکرِ شعر نکردند آخر چوں ایں ناسور شفا می پذیرد توجہ بہ گفتنِ غزل گماشتند و در عرصۂ قلیل بہماں ضخامت دیوانِ دوم تیار کردند در کثیر الکلامی جناب را صائب ریختہ گفتن مناسبِ حال است در فصاحت و بلاغت و معنی بندی و سادہ گوئی و امثالِ زنانہ و مردانہ نظیرِ خود ندارند فقیر در مشورۂ ایں دیوان شریک از اول تا آخر است سنِ شریف از شصت متجاوز خواہد بود من انتخابہ نظم۔

کل ترے بیمار کی کچھ تھی طبیعت اَنتی — آج جو دیکھا تو منہ پر پھر گئی ہے مردنی

اس قدر مرغوب خاطر ہے مرا وہ نوجواں — دوڑتی ہے جس کے چہرے سی بدن پر سنسنی

کب کسی پر غیر دل اُس کا کل جانا کھلا — شب گیا یوں منہ پہ دامن کی لگا گلدامنی

اے شگفتہ تم سے حیف کیجے دریغ اک فلس داغ — کیونکہ کچھ دیتا کسی کو ہوگا یہ چرخ دنی

باغباں جب کہ نظر پھولوں پہ کرتا گذرا — دل پہ بلبل کے سبھی رنگ کا کھٹکا گذرا

(۱) استادہ وقت اند (ن)

ڈر تھا اس عشق کا سو عشق کیا ہے . . . | سامنا اُس نے کیا دل پہ خطرا گذرا
بارہا آندھی اٹھی ابر برستا گذرا | سر پہ انساں کے جو پوچھو تو نہ کیا کیا گذرا
پرزے کرنے کا ہوا حکم اُسے نامہ سمیت | داخلے کا مرے قاصد کے جو پرچا گذرا
ہر کسی کی نہیں طاقت جو قدم مار سکے | وادیٔ عشق سے قاصد کوئی پرلا گذرا
اس پہ سر تن پہ رہے یا کہ شگفتہ نہ رہے | دل پہ مضبوط مزاجوں کے جو گذرا گذرا

مری جاں دردِ دل سے شب کہاں تھی | زمیں اک چیخ تھی اک آسماں تھی
نہ سونگھا سگ نے نِی تھوکا ہما نے | جلی سی بسکہ بوئے استخواں تھی

بسکہ کھایا ہے زخمِ سر گہرا | خوں کا دریا ہے تا کمر گہرا
صاف کاجل کی کوٹھری ہے جہاں | سرمہ اتنا دیا نہ کر گہرا

بسانِ نقشِ قدم جو کہ خاکسار رہوا | اُسی سے دل میں تمھارے بھی اک غبار رہوا
بگولا گور سے اٹھا جو خاکساروں کی | وہی بلند ہو، اک گنبدِ مزار رہوا
نہ رویا عاشقِ بےکس کی گور پہ کوئی | مگر سحابِ کرم گستر اشکبار رہوا

دن کو تو خیر چاہا جہاں تم وہاں رہے | جب رات کو کہیں رہی پھر ہم کہاں رہے
گالی گلوج مار کٹائی نہ ہو سو کیوں | جب اُس کا ہاتھ اور نہ میری زباں رہے

دنبالہ ہے سرمے کا اور چشم وہ کالی ہے | اس رہ آہو نے اک شاخ نکالی ہے
چھنگلی مری چھنگا کی پنجے سے نرالی ہے | مرجان نے یہ پیوندی اک شاخ نکالی ہے

دل کے دینے میں اضطراب کیا | دیر کے کام کو شتاب کیا
چشم سے گوں دکھا کے غیروں کو | دل مرا نرگسی کباب کیا

ذرا تو جس ہیں تجسس ہو باغباں کو مرے | چھپا دو پھولوں کے جھنڈ وں میں آشیاں کو مرے

شوق

در مشاعرۂ میر صدر الدین صدر آمدہ خواندہ بود ، دیگر از احوالش خبر نہ دارم از وست :-

یہ دہن یہ منہ اور یہ آنکھ اور یہ تل کہاں | ہو ترے چہرے سے ہم چہرہ مہ کامل کہاں
بحر الفت میں بہہ جاتے ہیں لاکھوں آشنا | عشق کے قلزم کا دیکھا اے دل کہیں ساحل کہاں
شوق ہی صحرا نشیں اب عشق میں تیری میاں | قیس دل خستہ کہاں وہ صاحب محمل کہاں

گل چاک گریباں ہے تری گلبدنی سے | بلبل ہے جگر خستہ مری نعرہ زنی سے
دندان و لب لعل صنم کا ہے یہی وصف | وہ دُر ثمیں ہیں یہ عقیق یمنی سے
اک خار سا رہتا ہوں پڑا بستر غم پر | اے شوق یہ کاہیدہ ہوں ضعف بدنی سے

شوق

میرزا جوہر ولد میرزا وارث علی جوان موزون الطبع شوق تخلص می کند از چندے سرے بگفتن شعر پیدا کردہ چیزے بجائے خود موزوں می کرد آخر برہنمائی دانش رجوع مشورۂ اں بفقیر آوردہ شعر درست بستہ می گوید اما بسبب لکنت قلیل از خواندن در مشاعرہ متعذر است عمرش از سی متجاوز خواہد بود ، از وست :-

فائدہ کیا جو لئے جاتی ہو بستاں کی طرف
لے چل اے وحشتِ دل مجکو بیاباں کی طرف

مہر و مہ کو جو کیا حسن سے تیرے ہم سنگ
حسن تیرا تھا فزوں پلۂ میزاں کی طرف

اُس پری رو کی اگر وصل کی خواہش ہو تجھے
شوق سے جا تو چلا ملکِ سلیماں کی طرف

تجھ بن قلق سے بسترِ غم پر تمام رات
تڑپا کیا مرا دلِ مضطر تمام رات

حاصل[1] یہ عشق میں نہیں جاہ و حشم ہوا
آنسو تو فوجِ غم ہوئے نالہ علم ہوا

شکیب

نواب اصغر علی خاں شکیب تخلص خلف الصدق نواب عنایت علی خاں خلفِ نواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم مغفور، جوانِ مہذب الاخلاق و فہمیدہ و دانا است بمقتضائے موزونیٔ طبع از چندے سرے بگفتنِ شعر داشت و نظم خود را بہ کسے نمی نمود آخر چون عرائس افکارِ خود را بمشاطگیٔ خامۂ اصلاحِ فقیر رسانید در ابتدائے کار انتہا کرد فکرش بلیغ است و ذہنش رسا عمرش تخمیناً از سی متجاوز خواہد بود، از وست :۔

تابِ[2] لاوے اُسکی کیا دل کس قدر نخچیر کا
توڑ جاتا ہے تو ے پیکاں تمہارے تیر کا

کیوں ملاتا ہے مجھے تو خاک میں چرخِ کہن
میں ورق ہوں عاشقانِ رفتہ کی تصویر کا

آب داری اس کو کہتے ہیں زہے اندازِ قتل
مانگتا پانی نہیں کشتہ تری شمشیر کا

قیس کب دور سے دیکھ اُس کو پکارا نہ کیا
ساربان نے طرفِ نجد گذارا نہ کیا

---

(۱) حاصل یہ تیرے عشق میں جاہ و حشم ہوا (ن)
(۲) لا سکے کیا تاب اس کی دل کسی نخچیر کا (ن)

اپنے بیمار کو کہتا ہے وہ عیار بہ طنز
کیوں مسیحا نے ترے درد کا چارا نہ کیا
قد پہ کر تیرے نظر سرو کو بھولی قمری
دیکھ بلبل نے تجھے گل کا نظارا نہ کیا
سیکڑوں قتل کیے اُس نے کسی ن بھی شکیبؔ
تو نے نظارۂ مژگانِ صف آرا نہ کیا

رو چکا جان کو میرے دلِ نالاں میرا
ہو چکا آہ مسیحا سے بھی درماں میرا
آنکھیں اُلجھی ہوئی رہتی ہیں تری زلفوں میں
کیونکہ ہو آن سے جدا شانۂ مژگاں میرا
نہیں ممکن کہ خبر دل کی نہ دل کو ہووے
آشکارا ہے بتاں پر غمِ پنہاں میرا
جب سے دیکھا ہے میں اُس شوخ کے مژگاں کو شکیبؔ
ہے صدا پنجۂ وحشت میں گریباں میرا

کل ہنستے ہنستے اُس نے جو منہ کو پھرا دیا
رجعت کا آفتاب کے عالم دکھا دیا
یارانِ رفتہ کا مجھے ملتا نہیں پتہ
گو جستجو میں جان کو میں نے کھپا دیا
اک تیغ میں تمام ہوئے شیخ و برہمن
دم میں صنم نے دونوں کا جھگڑا چکا دیا

غریب و بے وطن ہوں گردِ راہ کارواں ہوں میں
مریضِ عشق ہوں آزردہ جان و ناتواں ہوں میں
تو اے صیاد کیوں کرتا ہے مجھکو ذبح ٹک رہ جا
کہ دل میں اپنے اس دم سوچتا طرزِ فغاں ہوں میں
کوئی پروانے کو کہہ دے نہ یہ منہ پر چڑھے میرے
مثالِ شمع سوزاں اے شکیبؔ آتش زباں ہوں میں

در پردہ ستم ہوتے ہیں سو جانِ حزیں پر
عاشق ہوئے جس دن سے ہم اک پردہ نشیں پر
ہم اُس کے تصور میں جہاں بیٹھ گئے ہیں
نقشے ہی بنایا کئے ہیں روئے زمیں پر
کیا تیغِ ملاحت نے تری کاٹ کیا کم
آتی ہے ہنسی خندۂ زخمِ نمکیں پر
دیکھا ہے شکیبؔ جگر افگار نے کس کو
شادی سے جو رکھتا ہی نہیں پاؤں زمیں پر

عجب طرح کی کشاکش تھی مہ جبینوں میں — گیا جو آئینہ اک روز ان حسینوں میں
نہ پاس بیٹھے نہ بولے چلے گئے منہ پھیر — کھڑے کھڑے جو کبھی آئے بھی ہمنشینوں میں
بہارِ لالہ دکھاؤں گا باغباں تجکو — بھرے ہیں لختِ جگر میں نے آستینوں میں

برا ہوتا ہے آزارِ محبت — کوئی بچتا ہے بیمارِ محبت
کبھی جس پر نہ اک سیدھی نظر کی — وہ میں ہی ہوں گنہگارِ محبت
چھپا دیں گے تری الفت تو لیکن — نہ ہوگا ہم سے انکارِ محبت

جی ہی جی میں تری باتیں جو کیا کرتے ہیں — دل کی ہم اپنے تسلی تو ذرا کرتے ہیں
کس کی طاقت ہے کہ کچھ منہ پہ تمھارے بولے — ہے بھلا وہ بھی اگر آپ برا کرتے ہیں
ہر کسی سے نہیں ہوتا ہے محبت میں شکیب — وہ جو صابر ہیں کوئی شور و بکا کرتے ہیں

آپ کو خاک میں ملاؤں گا — خاکساروں میں جب کہاؤں گا
دل یہ کہتا ہے اُس کے کوچے میں — گر گیا اب کی پھر نہ آؤں گا
کتنی ہی وہ جفا کرے گا شکیب — میں زباں پر نہ شکوہ لاؤں گا

رنگِ ثبات ہی نہیں اس گلستاں کی طرح — ڈالیں کس اعتماد پہ یہاں آشیاں کی طرح
شاگرد کچھ جرس ہی نہیں دشتِ شوق میں — سیکھی ہے ہم سے نے بھی آہ و فغاں کی طرح
تیغِ ستم کو تیز لگا کرنے اور بھی — سرگشتہ یا فلک ہے مجھے سنگِ فساں کی طرح
تیرِ دعا ہدف پہ لگے گا تبھی ترا — چندے شکیب چلہ نشیں ہو کماں کی طرح

دامِ الفت میں پھنسی ہیں اب تو اے صیاد ہم — دیکھئے اس دام سے ہوتے ہیں کب آزاد ہم
دیکھنی پڑتی نہ ہم کو آفتِ نیرنگِ حسن — خوب تھا پیدا جو ہوتے کور مادر زاد ہم
ہر بنِ مو پر ہمارے زخم اک تیشے کا ہے — یہ تماشا تجکو دکھلائیں گے لے فرہاد ہم
ہم سے حیرانوں کا نقشہ کھینچنا ہے کیا ضرور — خود برنگِ صورتِ تصویر ہیں بہزاد ہم
باغ میں یاد آئی جب اُس گل کی مسی کی دھڑی — برگِ سوسن کو ہی سمجھے خنجرِ فولاد ہم
کارواں نے حالِ زار اپنا نہ پوچھا یا نصیب — جوں جرس کرتے رہی گو نالہ و فریاد ہم
یک دگر فرہاد و مجنوں ہم سے لیتے تھے سبق — تھے فنونِ عشق بازی میں کبھی استاد ہم
بزمِ عشرت ہم نے جانا قیدِ زنداں کو شکیب — نالۂ زنجیر کو سمجھے مبارکباد ہم

شعور

شیخ عبدالرؤف شعور تخلص ولد شیخ حسن رضا عرف بستی میاں ابن شیخ وجیہ الدین جوانِ مہذب الاخلاق است، بزرگانش متوطن بلگرام و خودش در لکھنؤ تولد و نشو و نما یافتہ. مشارٌ الیہ[۱] و منشی ظہور محمد ظہور تخلص کہ ذکرش در حرف الظا خواہد آمد، برادر عم زادہ بودہ بمقتضائے موزونی طبع خیالے گفتنِ شعرِ ہندی را در سر جا دادہ بعد از شاگرد شدنِ برادرِ بزرگِ او ہم بحلقۂ تلامذۂ فقیر در آمدہ. ذہنے رسا و طبعے ممیزہ دارد، اگر چندے مشق نمود دریں فن از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد، عمرش تخمیناً بست و یک سالہ است از وست:-

حق تعالیٰ نے تجھے رشکِ قمر پیدا کیا — کم ترا اِس انداز کا کوئی بشر پیدا کیا
ہو گیا سطحِ فلک جوں کاغذِ آتش زدہ — آہِ سوزاں نے ہماری یہ اثر پیدا کیا

---

(۱) عمواد منشی ظہور محمد ظہور کہ ذکرش خواہد آمد، در سنہ ۱۲۳۱ھ نزدم آوردہ است۔

شور سر میں دردِ دل ہیں آبلے پاؤں میں ہیں — ہم نے یہ نخلِ محبت کا اثر پیدا کیا

کیوں نہ سمجھیں تجکو یکتا سارے خوبانِ جہاں — مادرِ گیتی نے کب ایسا پسر پیدا کیا

شیشہ بازی آنسوؤں کی نت یہ کرتے ہیں شعور — دیدۂ گریاں نے اپنے کیا ہنر پیدا کیا

قتل کرنے کو جو قاتل نے بٹھایا تہِ تیغ — کشتۂ تیغ نے بس سر نہ اٹھایا تہِ تیغ

پہنچے صدمہ نہ کہیں بازوئے قاتل کو مرے — دلِ عاشق میں نہ کچھ خوف سمایا تہِ تیغ

خون سے تاکہ نہ ہو دامنِ قاتل افشاں — ہم ہوے سرو ولے سر نہ اٹھایا تہِ تیغ

ہمدم ایسا ہے مرا کون کہے جو اُس سے — بے گنہ ہم کو اسے کیوں تم نے بٹھایا تہِ تیغ

آن کر جمع ہوئی خلق تماشے کے لئے — سب نے بس ترے کشتے کو جو پایا تہِ تیغ

سر کو زانو پہ دھرے اپنے میں بیٹھا ہوں شعور — کشتنی مجھ سا تو مقتل میں نہ آیا تہِ تیغ

تا مرا خوں سے دمِ قتل نہ ہو تر دامن — باندھ لیتا ہے کمر سے وہ ستمگر دامن

رشکِ گلزار بھلا ہووے نہ کیونکر دامن — اشکِ خونیں سے مرے تر ہے سراسر دامن

اپنے عاشق کو سناتا ہے وہ کہہ کر دمِ ذبح — خون سے بھر نہ مرا تو تو تڑپ کر دامن

پوچھا کرتا ہوں جو اُس سے میں سدا اے دیدۂ تر — چھوٹتا ہاتھ سے میرے نہیں دم بھر دامن

قتل پر کس کے کمر باندھی ہے سچ کہیو میاں — باندھے رہتے ہو کمر سے جو تم اکثر دامن

کرے کس طرح نہ پامال دلِ عالم کو — چلنا اُس سروِ خراماں کا اٹھا کر دامن

دعوئے خون سے محشر کے یہی مطلب ہے — ہاتھ میں ہووے مرے تیرا ستمگر دامن

جو وحشتِ نجد کو لیلیٰ کبھی سوار ہوئی — تو روحِ قیس رواں پیچھے جوں غبار ہوئی

جب آیا گورِ غریباں کی سیر کو وہ شوخ — بگولا بن کے مری خاک بھی نثار ہوئی

خوشی سے لوٹے جو آتے ہیں آہوانِ حرم — مگر کہ طبع تری مائلِ شکار ہوئی
شعورؔ ہو گئے صحرا میں خار تک بھی ہرے — جو شکلِ ابر مری چشم اشکبار ہوئی

جو شانہ گیسوئے جاناں میں ہم کبھو کرتے — تو تیری لٹ سے دلِ گم گشتہ جستجو کرتے
ہمارے دل پہ یہ آفت نہ آتی اک سرِ مو — پسند ہم جو نہ وہ زلفِ مشکبو کرتے
سیاہ بختِ ازل ہوں کہاں یہ میرا نصیب — کہ قتل کر کے مجھے آپ سرخرو کرتے
یہ آرزو ہی رہی دل میں اپنے تا دمِ نزع — جو آتا یار تو کچھ اُس سے گفتگو کرتے
جو پڑتی بے کسیٔ عاشقاں پہ اُن کی نگاہ — کسی کا خون جہاں میں نہ خوبرو کرتے
ہمارے نامے کا ہو جاتا زعفرانی رنگ — جو ہم رقم تمہیں کچھ حالِ زرد رو کرتے
اُسی کا سجدہ بجا لاتے شیخ وقتِ نماز — بآبِ دیدۂ عشاق گر وضو کرتے
ہمارا خون نہ چھوٹے گا تیغِ قاتل سے — زمانہ گرچہ گذر جائے شست و شو کرتے
شعورؔ یاد جو آئی وہ بادہ پیمائی — تو ہوش جاتے رہے بس سبو سبو کرتے

گلشن میں تیری زلف جو اے سیم بر کھلی — ہر غنچہ مشتری ہوا اور مشت زر کھلی
نکلا نہ کام ناخنِ تدبیر سے ذرا — دل کی گرہ مری نہ کبھی عمر بھر کھلی
میں اُس کی یاد میں جو رہا محوِ انتظار — تو بعد مرگ کے بھی رہی چشمِ تر کھلی
کیونکر نہ خونِ دل مرے سینے میں جوش کھائے — رنگت حنا کی خوب کفِ یار پر کھلی
پرواز کر ہی جائے گا صیاد مرغِ روح — کھڑکی نہ فصلِ گل میں قفس کی اگر کھلی
مہرِ سکوت لب پہ جو وہ رکھ کے رہ گیا — کیا خط پہ میرے مہر نہ تھی نامہ بر کھلی
جانا عدم کو گلشنِ ہستی سے ہے ضرور — ہر ایک کے لئے ہے یہ راہِ سفر کھلی
اتنا شعورؔ خوابِ فراغت نہ چاہیے — تیری نہ آنکھ اب تلک اے بے خبر کھلی

بے سبب وہ نہ مُرے قتل کی تدبیر میں تھا
اُس کے ہاتھوں ہی سے ٹنا مری تقدیر میں تھا

مضطرب بس کہ ہوئے تھے وہ مرے بعد از قتل
موجِ دریا کا سماں جوہرِ شمشیر میں تھا

مُنتظر تھا ترا دیوانۂ گیسو جس رات
عالمِ چشم ہر اک حلقۂ زنجیر میں تھا

جنبشِ لب کا گماں ہوتا تھا عاشق کو ترے
اس قدر لطفِ خموشی تری تصویر میں تھا

پائے قاتل پہ دمِ ذبح گیا سجدہ میں بھول
دھیان اپنا جو لگا نعرۂ تکبیر میں تھا

او کماں ابرو جو اک تیر لگایا تو کیا
اشتیاق اس سے زیادہ دلِ نخچیر میں تھا

مرغِ بسمل سا تڑپتا تھا ہر اک مرغِ سحر
اثرِ تیر مرے نالۂ شبگیر میں تھا

مکھڑا جو کھلے صبحِ تمنا نظر آوے
گر زلف ہو وا تو شبِ یلدا نظر آوے

دو چار قدم ساتھ تمہیں چلنا تھا لازم
گر کشتۂ الفت کا جنازہ نظر آوے

وحشی کا ترے حال یہ ہے کوسوں ہی بھاگے
اپنا بھی کبھی اُس کو جو سایا نظر آوے

سر اپنا تو کٹوا کے میں یوں خون میں تڑپوں
کیا قہر ہے یہ اُس کو تماشا نظر آوے

ہر دم جو نہ ہو سامنے تصویرِ خیالی
تو صبر ترا اے دلِ شیدا نظر آوے

ہر لحظہ طپاں رہتی ہے یہاں آہ کی بجلی
کس طرح مری گور پہ سبزا نظر آوے

کیوں مجھ سے تو رہتا ہی خفا یہ مجھے بتلا
کیا یار گنہ مجھ سے ہوا یہ مجھے بتلا

سوگند سرِ عاشقِ مذبوح کی تجھکو
کیونکر ہوئے رنگین کف پا یہ مجھے بتلا

اُس شوخ کا زیبا گلِ رخسار ہے یا گل
گلشن کی قسم تجکو صبا یہ مجھے بتلا

گر شکوۂ بے مہری کیا تو وہ یہ بولا
کہتے ہیں کسے مہر و وفا یہ مجھے بتلا

زلف اُس کی یہ کہتی تھی مرے دل کو پھنسا کر
کس طرح تو اب ہوگا رہا یہ مجھے بتلا

دل عشوہ و انداز و ادا سے تو لیا چھین
پھر کس لئے ہے ناز و ادا یہ مجھے بتلا

یہ خوبیٔ انصاف کہ دشنام تو دینا
اور کہنا کہ کیا میں نے کہا یہ مجھے بتلا

مہندی بھی ترے ہاتھوں کی ملو ڈالے ہی دل کو
یہ خون ہی یا رنگِ حنا یہ مجھے بتلا

کیا تجھکو گرفتاریٔ بلبل سے ہی حاصل
صیادِ جفا پیشہ بھلا یہ مجھے بتلا

بیجا نہ تھا اُٹھ بیٹھنا بے چینی سے میرا
شب سامنے آنکھوں کے وہ تصویر کھڑی تھی

اک ہاتھ دھرا دلپہ اک انگشت دہن میں
یوں کشتۂ الفت کی تری لاش پڑی تھی

اُس گوہرِ یکتا کی جو میں یاد میں رویا
ہر اشکِ مسلسل مرا موتی کی لڑی تھی

صدمے سے شبِ ہجر کے جیتا جو بچا تو
بیمارِ تپِ ہجر تری عمر بڑی تھی

کی اُس نے ہی آسان دمِ تیغ سے ورنہ
منزل یہ شعورا اپنے لئے سخت کڑی تھی

خاک برسر ہم پھریں صحرا میں رسوائی کیساتھ
یار ہو آئینہ اُس محوِ خود آرائی کے ساتھ

عشق میں اس شوخ کے پہنچے قریبِ مرگ ہم
ناتوانی بھی گئی اپنی توانائی کے ساتھ

چھوڑ کر مجکو چلے تم خیر اب اے مہرباں
ساتھ تنہائی مری ہی میں ہوں تنہائی کے ساتھ

مدعی ہم کو بصد افسوس جو شب گھر لیگئے
ہم بھی اک عیار تھے ساتھ اپنے خنجر لے گئے

حور و غلماں کے تئیں جو آرزوئے سر تھی
جب ملایک خاک کوئے یار آ کر لے گئے

پائے دیوار اُس کو بس اُس شوخ نے پھکوا دیا
سامنے اُس کے مرا جلاد جب سر لے گئے

زیست ہی تک ہے فقط امیدِ دل خیالِ تخت و تاج
کچھ ہی ساتھ اپنے سلیمان و سکندر لے گئے

حاصلِ عشقِ بتانِ سنگدل ہم کیا کہیں
غم کا ایک چھاتی پہ اپنی دھر کے پتھر لے گئے

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اُس بتِ مغرور نے
نذر کو اُس کی جو یہ اشکوں کے گوہر لے گئے

ناتوانی مانعِ چاکِ گریباں ہوگئی
ہاتھ اپنا ہم گریباں تک کبھی گر لے گئے

کی کشش جوں سنگِ مقناطیس جانِ سخت نے
جب مری گردن تلک وہ اپنا خنجر لے گئے

اپنی تربت پہ گُلِ نرگس ہی اُگتے ہیں شعورؔ
گور میں بھی حسرتِ دیدار دل پر لے گئے

زنبور کہوں عشق کو میں یا کہوں عقرب
سینہ میں عجب طرح کی ایک نیش زنی ہے

کرنے کے نہیں ہم تو صنم ترکِ محبت
جو ہووے سو ہو اب تو یہی دل میں ٹھنی ہے

ناداں میں کہا تجھ سے مرے لختِ جگر کی
کر قدر کہ یہ رشکِ عقیقِ یمنی ہے

ہر موے بدن ہے اُسے پیکاں کے برابر
نازک بدنی سی کوئی نازک بدنی ہے

مر جاؤں گا اک روز یونہیں ہجر میں تیرے
دانتوں کا تصور مجھے ہیرے کی کنی ہے

ہر نوکِ مژہ اُس کی شعورؔ اپنے تو حق میں
نشتر ہے کبھی اور کبھی برچھی کی انی ہے

ترے دستِ حنائی میں ادا کیا ہی نکلتی ہے
نہ میں ہی جان دیتا ہوں قضا بھی ہاتھ ملتی ہے

شفق میں کوند جانا برق کا بس یاد آتا ہے
نیامِ سرخ سے تلوار اُس کے جب نکلتی ہے

تری رفتار پر کبکِ دری ہی نے فقط غش ہے
نسیمِ صبح بھی اے گل روش پر تیری چلتی ہے

گرانباری کے باعث کاہ مثلِ کوہ ہے جسکو
بھلا شمشیر کب اُس دستِ نازک سے سنبھلتی ہے

بجا ہے جاں کنی ہے جس قدر صدمہ ہو اعضا کو
دمِ آخر یہ حسرت روح قالب میں مچلتی ہے

شعورؔ اُس نے کہا یہ دل میں اپنے دیکھ کر مجکو
جو اُس کو مار ڈالوں تو بلا کچھ سر سے ٹلتی ہے

کچھ عجب ہے یہ ہمارے دلِ دلگیر کا نقشہ
جس طرح سے ہو بلبلِ تصویر کا نقشہ

چشمِ مہ و خورشید بھی ہے جس سے جھپکتی
کچھ ہے یہ ترے حسنِ جہانگیر کا نقشہ

لازم ہے کہ پیکانِ دلِ عاشق کا بنا دے
نقاش اگر کھینچے ترے تیر کا نقشہ

ساتھ اُس کے سرِ عاشقِ مذبوح بھی ہووے
کھینچے جو مصور تری شمشیر کا نقشہ

ہر بات تری سحر ہے ہر حرف ہے تصویر — تقریر کا نقشہ وہ، یہ تحریر کا نقشہ
بل کھاتا ہوا سانپ جو چلتا ہے زمیں پر — کھینچے ہے کسی زلفِ گرہ گیر کا نقشہ
پوچھا نہ شعورِ جگرِ افگار کو اُس نے — بس دیکھ لیا آہ کی تاثیر کا نقشہ

اس واسطے کہ گل کو دکھاوے بہارِ گل — آئینہ آبِ جو نے رکھا ہے دوچارِ گل
عارض سے کس کے ہے یہ مشابہ جو ہر سحر — کرتا ہے آسماں دُرِ شبنم نثارِ گل
فصلِ بہار آکے چمن سے چلی گئی — مرغِ اسیر کرتے رہے انتظارِ گل
پامال یہ خزاں نے کئے گلشنِ جہاں — باقی رہا نہ خار تلک یادگارِ گل
اُس کے زوالِ حسن کے جب آگئے دن قریب — بادِ صبا بھی ہو نہ سکی غمگسارِ گل
آتش سے یوں ہی پھونک دے بلبل کا آشیاں — پھر کیا کرے کہ اُس میں نہیں اختیارِ گل
آکے کس طرح سے نہ ہوں ذبح بلبلیں — ہر شاخِ گل ہے نیمچۂ آبدارِ گل
گل اپنے زیبِ گوش وہ گل کس طرح کرے — ہووے عرق عرق جو پڑے اُس پہ بارِ گل
اے عندلیب! شیفتۂ رنگ و بو نہ ہو — ناداں اس چمن میں نہیں اعتبارِ گل
جھونکوں سے جو ہوا کے اُسے اضطراب ہے — بلبل کے ہاتھ لگ نہیں سکتا شکارِ گل
داغوں سے تن ہوا ہے مرا نخلِ گل کی شکل — باور نہیں تو کر لے تو لے گل شمارِ گل

کرے صبا اور نسیم جب وصفِ یار کی زلفِ پُر شکن کا — خطا ہے اُس وقت ذکر کرنا کسی کو پھر نافۂ ختن کا
گلِ مرادِ وصالِ جاناں ہی میسر کرے دُعائے دل — نہ شیفتہ ہوں میں گل کا یارب نہ آرزومند یاسمن کا
نقاب چہرے سے گر اُٹھا دے یقین ہے یہ ماہ پردہ ہو دے — جو زلف بکھرا دے اپنے رُخ پر خیال ہو خلق کو گہن کا
جواب نامے کا لاوے قاصد جو بعد مُردن وہاں سے یار کے — یہ ہے وصیت اسی کو کرنا جواب نامہ مرے کفن کا
مزا اُٹھایا یہ خارِ صحرا کا میرے پاؤں کے آبلوں نے — خیال آیا نہ خواب میں بھی دلِ حزیں کو کبھی وطن کا

نہیں تعریف ہو سکتی تری شکل و شمائل کی — فروغِ حسن سے تشبیہ کیا دوں ماہِ کامل کی
حجابِ عشق دیکھو پھر گیا رُخ خود بخود دوں ہی — مری تصویر سے تصویر اُس کی جو مقابل کی
فغان و گریۂ بسمل ہی ساماں برق و باراں کا — رکھے ہی عالمِ برقِ طپاں شمشیر قاتل کی
سرِ رہ جھاڑتا تھا روز مجنوں اپنی پلکوں سے — نہ ہوئے تا کوئی شے سدِ رہ لیلیٰ کی محمل کی
برنگِ نقطۂ موہوم پایا ہم نے ہستی کو — حقیقت کھل گئی آنکھوں میں اپنے فردِ باطل کی
شعورؔ اس باغ سے جانا تھا مثلِ بوئے گل ہم کو — ٹھہر کر راہ میں کیوں ہم نے کھوٹی اپنی منزل کی

ردیف (ص)

صواب

شیخ محمد اشرف صوابؔ تخلص

کب کوئی دل کی کدورت مرے دھو دیتا ہے — جس سے کہتا ہوں میں احوال سو رو دیتا ہے

صوفی

شاہ علی اکبر صوفی تخلص کہ در آود قیام داشت، از وست:-

یا زدہ غازہ برخسار بہار است بہار — دیدۂ لختِ جگر بار بہار است بہار
شبلی و نعرۂ مستانہ تماشا است عجب — نعشِ منصور و سرِ دار بہار است بہار

صادق

نواب جعفر علی خاں صادقؔ تخلص ولد محمد مومن خاں نیشاپوری عموئی کلاں نواب

امیر خاں انجام مقربِ فردوس آرام گاہ جوانے بود باغ و بہار، طبع رنگینش بگفتنِ شعر ہندی و فارسی مہارتے کمال داشت چنانچہ در ہر دو زباں مثنوی و دیوانِ مختصرے ازوے یادگار است، از انتخابِ بیاضِ اوست:۔

مدام نشہ چو خم می تراود از دلِ ما ۔۔۔ مگر ز بادہ سرشتند در ازل گلِ ما
بقتلِ ما چہ فسوں کردہ است قاتلِ ما ۔۔۔ کہ رفتہ است طپش از خیالِ بسملِ ما
چو بلبلے کہ گذارند در چمن قفسش ۔۔۔ بوصل ہم نہ رود داغِ ہجر از دلِ ما
چو عمر قافلۂ ما ہمیشہ در سفر است ۔۔۔ مگر بدوشِ نفس بستہ اند محملِ ما
زمیں چو چشمۂ سیماب در طپش آید ۔۔۔ اگر بخاک بریزند خونِ بسملِ ما
چو نقشِ پائے ز وا ماندگانِ تسلیم ۔۔۔ ہر زمیں کہ فتادیم گشت منزلِ ما
ز موج کم نہ شود بے قراریٔ دریا ۔۔۔ چہ غم ز سلسلہ دار جنونِ کاملِ ما
فلک کبود شد از دودِ آہِ ما صادق ۔۔۔ چگونہ آئینہ گردد دمے مقابلِ ما

تا کنم جزوِ دلِ صد چاک داغِ خویش را ۔۔۔ روز و شب چوں لالہ می سوزم دماغِ خویش را
در دلِ تنگم خیالت دست و پا گم کردہ است ۔۔۔ باوجود بینائی نیابد سراغِ خویش را
ہم چو آں شمعے کہ در قندیل روشن می کند ۔۔۔ می فروزم در دل از شوقِ تو داغِ خویش را
خواجہ بر خود بسکہ می بالد برنگِ گرد باد ۔۔۔ می برد بر آسماں ہر دم دماغِ خویش را
در بیاباں ہا کجا رہ گم کند مجنونِ ما ۔۔۔ گر ز چشمِ آہواں گیرد سراغِ خویش را
ہمچو آں نقدیکہ در زیرِ زمیں دفنش کنند ۔۔۔ می برم باخود بزیرِ خاک داغِ خویش را
شورِ بلبل بسکہ صادق بے دماغم کردہ است ۔۔۔ پاک می سازم ز گلہا صحنِ باغِ خویش را

ز جوشِ دل سرشک از چشمِ گریاں می شود پیدا ۔۔۔ ہوا چوں گرم تر گردید باراں می شود پیدا

زبس افتادہ دل چوں دانہ ہائے اشک در راہش　　بجائے سبزہ از خاکِ رہش جاں می شود پیدا

صادق

صادق علی خاں عرف میاں مستیا صادق تخلص ولد فتح علی خاں جوانِ خوش گفتار و نیکو اطوار است۔ بشاگردی قلندر بخش جرأت امتیاز دارد و در رویۂ شعر گفتنش را بعدِ او بخوبی بجا می آرد، عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود، از دست:-

میں نہیں مطلق تری اس ظلم رانی سے خفا　　پھر کروں کیا ہوں میں اپنی سخت جانی سے خفا
سو جگہ گرتا ہوں اٹھتا ہوں جو بستر سے ذرا　　مرگ مجھ سے ہے خفا میں ناتوانی سے خفا
دیکھ کر صادق کو کل افسوس کیا آیا ہمیں　　وہ جواں پھرتا تھا اپنی نوجوانی سے خفا

سن کے وہ کہنے لگا رات کو شیون میرا　　میری رسوائی کے درپے ہے یہ دشمن میرا
کس نے موقوف کیا جھانکنا جو کرتا ہے　　ٹکڑے دل ہائے وہ دیوار کا روزن میرا

یہ چتونوں میں کہے ہے کہ خیر سے گھر جا　　ملاؤں آنکھ جو اُس چشمِ شرگیں سے میں

پھر کیا کریں جو ہاتھ نہ تم سے اٹھائیں ہم　　دانستہ اپنی جان کو کیونکر گنوائیں ہم
لو اب تو بس رکھائیاں چھوڑو کہ وصل میں　　تم پاؤں کھینچو ہاتھ کہاں تک بڑھائیں ہم
تم آپ سا سمجھتے ہو جھوٹا ہمیں بھی خیر　　بس کیا ضرور ہے کہ پھر اب قسمیں کھائیں ہم
کیا کیا نہ یاد آئی ہے گھر میں ہمارے آہ　　اُن کا پکار کر کے وہ آنا کہ "وہ آئیں ہم؟"

جب ہم دیکھتے ہیں یار کو اغیار سے ہم　　تک کے منہ اس کا بھی رہ جاتے ہیں ناچار سے ہم

تیرے ہمسایہ بھی رہنے کی خوشی کچھ نہ ہوئی
سخت عاجز رہے اس بیچ کی دیوار سے ہم

چین دل کو جو زمانے سے نہیں ہے صادقؔ
آپ بیزار ہیں اب اپنے ہی اشعار سے ہم

غیر کے ہوتے ہمیں گھر میں بلایا نہ کرو
دل جلے جو ہوں انہیں اور جلایا نہ کرو

دیکھو شوخی کہ مجھے دیکھ کے غمگیں بولا
گھٹ کے مر جاؤ گے تم رنج اٹھایا نہ کرو

یہ ستم کس سے کہوں جس پہ کہ دل آیا ہے
وہ یہ کہتا ہے کہ گھر میں مرے آیا نہ کرو

گر یہ کہتا ہوں کہ بندہ ہوں تمہارا صاحب
ق دیکھو ہر بات پہ تم مجکو ستایا نہ کرو

تو وہ کہتے ہیں کہ میں اور ستاؤں گا تمہیں
تا ہر اک شخص سے دل اپنا لگایا نہ کرو

ہر گھڑی حالتِ دل کر کے بیاں اے صادقؔ
آپ رویا نہ کرو ہم کو رلایا نہ کرو

رکھے ہے قدر بھلا تیرے روبرو کوئی
کہاں ہے منہ کہ جو ہو تجھ سے دوبدو کوئی

چین دے اب تو کہیں نالۂ شبگیر مجھے
آہ معلوم ہوئی بس تری تاثیر مجھے

وہ مستِ ناز جو غیروں کے اختیار میں ہے
تو ایک شعلۂ آتش مرے مزار میں ہے

کس سے کہوں آہ جا کے حالت دل کی
گھٹتی جاتی ہے روز طاقت دل کی

وہ جان نہ آیا اور یہاں جان چلی
افسوس رہی دل ہی میں حسرت دل کی

جب عشق میں ذلت اور خواری کھینچے
دل کیونکہ نہ اپنا شرمساری کھینچے

یارو یہ غضب کہیں سنا ہے تم نے
بوسہ مانگوں تو وہ کٹاری کھینچے

جو بات میں چاہتا ہوں اُسے منظور نہیں
ہر بات پہ کرتا ہے وہ مغرور نہیں
گر آنکھ ملاؤں تو وہ چتون میں سا کہے
کم بخت تو اُس طرح مجھے گھور نہیں

خط کو نہ پڑھے اگر وہ جانی قاصد
کہہ دیجیو حالِ دل زبانی قاصد
جس طرح بنے کمال ہوگا احساں
لانا اس کی کوئی نشانی قاصد

خواہش میں بتوں کی روز و شب گذرے ہے
نت کھینچتے ہی رنج و تعب گذرے ہے
اک روز نہ پایا عاشقی میں آرام
اوقات ہماری بھی عجب گذرے ہے

صادق

پسر انور علی بیگ صادق تخلص گذاشتہ رجوع[1] بہ مرزا قتیل آورده جوانِ عنایت عمرش بست و دو سالہ خواہد بود، از دست :-

جو کہتا ہی یوں مجکو ترے آنے سی کیا حاصل
تو اُس کے پاس پھر یارو مجھے جانے سی کیا حاصل
مناسب کیا ہی پردے میں تجھے اے ماہ رو رہنا
ملا ہو جس سی جی پھر اُس سی شرمانے سی کیا حاصل
خدا جانے وصال اُس کا میسر کب تلک ہووے
دلا ہو وہ تجکو اتنا غم کھانے سے کیا حاصل
محبت چیز کیا ہی سخت اس میں ہیں حیراں ہوں
پتنگوں کو بھلا اے شمع جل جانے سی کیا حاصل
جو تیرے پاؤں کی آہٹ سی در کو بند کر لیوے
تو صادق اُس کے در پر سر کو ٹکرانے سی کیا حاصل

عشق میں جب سی پڑا اس دل ناشاد سی کام
ہی مجھے نے کی طرح نالۂ و فریاد سے کام
نہیں سرکارِ زمانہ سے فراغت ملتی
روز نکلے ہی نیا عالمِ ایجاد سے کام

---

(۱) شاگرد مرزا قتیل۔ (ن)

ناخنِ فکر نے کی اپنی وہاں کوہ کنی | نہ نکلتا تھا جہاں تیشۂ فرہاد سے کام
باغباں سے نہیں وابستہ غرض کچھ اُن کی | جو گرفتارِ قفس رکھتے ہیں صیاد سے کام
میں کسی کے قدِ موزوں کا ہوں عاشق قمری | نہ تو کچھ سرو سی مطلب ہے نہ شمشاد سے کام
میں ہوں دیوانہ نزاکت کا تری ہی اے گل | مجکو ہرگز نہیں طفلانِ پری زاد سے کام
سخت مشکل ہے فنِ شعر کا آنا صادق | چاہیئے نت رہے شاگرد کو استاد سے کام

صابر

منشی میر حسن صابر تخلص کہ بخدمتِ منشی گری[1] نواب ملک سعادت علی خاں بہادر غفراللہ عنہ عزِ امتیاز داشت اکثر مرثیہ و سلام از قدیم گفتہ آمدہ گاہ گاہے فکرِ شعر ہم می کند بہ بندہ ارتباطے کمال دارد مطلعِ خوبی از زبانش بہ سمع فقیر رسیدہ عمرش سی و پنج سالہ خواہد بود، از وست :۔

شروعِ عشق ہے اور چشم تر ابھی سے ہے | طپیدنِ دل و سوزِ جگر ابھی سے ہے

صفدر

میر صفدر علی صفدر تخلص شاگرد میاں[2] نصیر کہ از شاہجہاں آباد بہ گوالیار رسیدہ ہمراہِ ایشاں آمدہ بود جوانِ صلاحیت شعار و مہذب الاخلاق است ایں چند شعر از نتائج طبع او بہم رسیدہ بہ تحریر آمد از وست :۔

جب کہ آتش کدہ یہ سینۂ سوزاں بن جائے | جلوۂ برق نہ کیوں چاکِ گریباں بن جائے
خاکساری کے میں صدقے ہوں کہ جسکی دولت | زیرِ پا نقشِ قدم تختِ سلیماں بن جائے

---

(۱) کچہری (ن)

(۲) شاگرد میاں نصیر دہلوی ہمراہ میاں مذکور اول بہ گوالیار بعدہ بہ لکھنؤ آمدہ بود (ن)

گلِ مقصد مرے دامن کے گر ہوں زینت | تار دامن کا ہر اک خارِ مغیلاں بن جائے
تو اگر گھر سے نہ نکلے تو مجھے ہے یہ یقیں | دیدۂ حلقۂ در دیدۂ گریاں بن جائے
یہ جو صفدر ہے دل و جاں سے تمھارا بندہ | کام[1] اُس کا بھی بھلا یا شہِ مرداں ہو جائے

کھول دیتی گرۂ زلف صبا کیوں نہ ہوئے | تیرے پاؤں سے لگی رہتی حنا کیوں نہ ہوئے
یا الٰہی مرے ناخن ہیں جو یہ سینہ خراش | غنچۂ دل کی مرے عقدہ کشا کیوں نہ ہوئے
خونِ دل پیتے ہیں اپنا اسی غم میں غنچے | یعنی اس کی گرہِ بندِ قبا کیوں نہ ہوئے

صاحبقران

صاحبقران تخلص ساکنِ بلگرام شخصے ہاجیؔ[2] زنانِ طوایف بود فی الحقیقت دریں فن نظیرِ خود نہ داشت و معنی ہائے تازہ در ہجوایں قوم می بست چوں نوشتنِ آں کلام در تذکرۂ بزرگان روا نبود چند شعرِ سادہ اش بہ طریقِ ندرت بہ قلم آورد، مشارٌالیہ بعمرِ ہفتاد سالگی ازیں جہاں درگذشت، از وست :-

سخن اُس لعلِ لب کے وصف میں موزوں ہوویگا | برنگِ لالہ جب تک دل ہمارا خوں ہوویگا
ادا و ناز و انداز جفا پر تیرے اے ظالم | نہ ہووے گا کوئی عالم میں جو مفتوں نہ ہوویگا
نہ ہو صاحبقراںؔ گو ہر بار وہ جبہ سائی پر | ولے جو اس کا سنگِ آستاں چھوڑوں نہ ہوویگا

اس شجر کا نہ کچھ ثمر پایا | آہ کو آہ! بے اثر پایا

---

(۱) کام اس کا بھی کہیں، یا شہ مرداں بن جائے۔ (ن)

(۲) ہاجیؔ فرقہ لولیان بود و نظیرِ خود نداشت بلکہ موجدِ ایں طرز گردید۔ (ن)

کبھی ناشاد کبھی شاد ہوئے آخر ہیچ　　گو تعلق سے بھی آزاد ہوئے آخر ہیچ

خونِ دل ٹپکے ہے ان آنکھوں سے پانی کی طرح　　اب نظر آتی نہیں کچھ زندگانی کی طرح
اُس ستم گر بے وفا کو آہ دونوں یاد ہیں　　مہربانی کی طرح، نامہربانی کی طرح

تا نہ مٹ جائے رسم در راہِ وفا　　لکھتے رہتے ہیں آشنا کاغذ
صنعتِ کارساز لکھنے کو　　ہوا پیدا قلم بنا کاغذ

ہے اگر لکھنا رسالہ زلف کا　　پہلے کاغذ پر کرو شانے سے خط

دود ہے سنبلِ عذارِ شمع　　گُلِ عارض سے ہے بہارِ شمع

سیاہ بختوں کے دل میں نہیں ہوائے چراغ　　جلے ہے داغ جگر کا وہاں بجائے چراغ
تو رشک اس پہ نہ صاحبقراں کہیں کھانا　　جو گُل فراق میں اُس شمع رُو کے کھائے چراغ

وجود اس جہاں کا عدم دیکھتے ہیں　　عجب خواب ہے یہ جو ہم دیکھتے ہیں

دل پر کھنچی ہے ابروے خمدار کی شبیہہ　　پھرتی ہے اپنی آنکھ میں تلوار کی شبیہہ
ہوتے ہیں ہاتھ مانی و بہزاد کے قلم　　ہے آبدار کیا تری تلوار کی شبیہہ
وہ بے وفا طبیب تو آنکھیں چرا گیا　　دیکھی جو اپنی چشم کی بیمار کی شبیہہ

کیا دل گھٹا ہے تیرا ہم سے جو آنکھ بدلی — اوروں کو صاف ساقی ہم کو شراب گدلی
کل دیکھنا کہ ایراں تسخیر وہ کرے گا — صاحبقراں نے جا کر کابل کی آج حد لی

گدازِ دل سے کچھ بہتر نہیں دنیا میں ای غافل — نہ لینا گر کوئی دیوے تجھے اکسیر سونے کی
ندامت کر تو اُن سیمیں بروں کی تیغ... — نہ کاٹے مو برابر بھی کہیں شمشیر سونے کی

دیدۂ آبلہ میں کھٹکے ہے — مژہ ہی نوکِ خار ہی کیا ہے

تقدیر کرے ہی یوں تدبیر کے سو ٹکڑے — پر زور کماں سی ہوں جوں تیر کے سو ٹکڑے
اس فصلِ بہاراں میں زنجیر نہ کر ناصح — ہوویں گے کوئی دم میں زنجیر کے سو ٹکڑے

باریک گرچہ مو سے نازک خیال باندھے — مضمون تری کمر کا کس کی مجال باندھے
ہوتا وہی ہے حاصل جو اُس نے لکھ دیا ہے — گو دم میں سو طرح کے ہم نے خیال باندھے[1]

صنعت

کریم الدین صنعتؔ تخلص ساکنِ مراد آباد شاگردِ مولوی قدرت اللہ شوقؔ عرش

---

(۱) نسخہ رامپور میں یہ شعر زیادہ ہیں :-

جب کہ جلوا ہوا مجلس میں تیرے آنے کا — رات کو بھر گیا دل شمع سے پروانے کا

دلِ مضطر کی تسلی سے ہوا یہ معلوم — ہو گیا اُس سے مگر رات قرار آنکھوں میں
ہم نہ کہتے تھے نہ کر اتنا تصور خط کا — اب بلا سی میری آیا جو غبار آنکھوں میں

قریب چہل و پنج سال خواہد بود، از وست :-

نہ مونس نہ ہمدم نہ ہم یار ٹھہرے　　فقط غم ہی کھانیکے غمخوار ٹھہرے
یہ مانا کہ ہیں آپ دلبر و لیکن　　ہمارا ہی دل لے کے دلدار ٹھہرے
کہیں کیا نصیبوں کی خوبی ہمیں کو　　طرح دے کے اب تم طرحدار ٹھہرے
یہی چاہیے مرحبا، تم ہمارے　　مٹا کر نمود، اب نمودار ٹھہرے
پئیں خونِ دل ہم غم اُسکے ہیں ہر دم　　وہ مبار زدم دے کے خونخوار ٹھہرے
سنا جبکہ حاضر ہے صنعت تو بولے　　کہ کہدو اُسے زیرِ دیوار ٹھہرے

صدر

میر صدر الدین صدرؔ تخلص از اولادِ خواجہ باسط صاحب، جوانِ صلاحیت شعار و مہذب الاخلاق از چندے شوقِ موزونیٔ اشعار بہم رسانیدہ خود را بہ شاگردیٔ خواجہ حیدر علی آتشؔ کشیدہ زمزمۂ سخن را بہ سمعِ دوستاں و عزیزاں خواندن گرفت تا آنکہ بہ عرصۂ قلیل بلدِ ایں کوچہ شدہ معرفت بہمہ موزوناں پیدا کردہ بنائے مشاعرۂ تازہ بوسیلہ مکانِ خود گذاشت و فقیر را میرِ آں مجلس بہ سببِ زیادتیٔ عمر قرار داد۔ آخر چوں فلکِ تفرقہ انداز خواہندۂ ایں چنیں مجالس از قدیم نیست و بے وجہ او را سفرے یک دو منزل در پیش آمد ازیں جہت ایں صحبتِ منعقدہ را سلسلہ بگسیخت۔ فقیر در چہار مشاعرہ اش مع شاگرداں حاضر بود، عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود، از وست :-

تیری بہارِ حسن کا عالم نہ پائے گل　　ہنس کر ہزار اپنی خجالت مٹائے گل
بلبل نے اُس کو تنگ بغل میں لیا نہ ہو　　سو سو جگہ سے نکلی ہوئی ہو قبائے گل
جس طرح میرے زخمِ جگر ہنس رہے ہیں صدرؔ　　اس خوبصورتی سے نہیں خندہائے گل

کشتۂ حسن فسوں ساز مسیحا ہووے — گل ترے آگے چراغ ید بیضا ہووے

حور کو تو نظر آجائے تو شیدا ہووے — اے پری تجکو پری دیکھے تو سودا ہووے

اس سے کر یاد خدا اُس سے نظارہ بت کا — دل جو کعبہ ہو تو پھر چشم کلیسا ہووے

بے زبانی سے ہے مجبور وگرنہ قاتل — دہن زخم ترے شکر میں گویا ہووے

مذہب اہل کرم میں ہے تکلف ممنوع — یہ نہ دیکھا کہ حنائی کف دریا ہووے

چشم مے گوں کو تری ہوش ربائی منظور — زلف پر پیچ کو مقصود کہ سودا ہووے

دست پُرس وہاں ہے جنوں کو کہ نہیں عقل کو دخل — پاؤں واں رکھتی ہے وحشت تو جہاں جا ہووے

شب مہتاب میں بھی آ کبھی اے مہر لقا — مہ و خورشید ہوں اک جا تو تماشا ہووے

داغ منظور نہیں ہے مجھے مرہم کے لئے — درد سر واسطے صندل کے نہ پیدا ہووے

کوہ کن سے کہوں حال اپنا تو سر کو پھوڑے — سنے مجنوں یہی افسانہ تو سودا ہووے

محفل یار میں اے صدر نہ ہو غیر کا دخل — باغ میں سبزۂ بیگانہ نہ پیدا ہووے

پڑے رہتے ہیں ہم خاموش تصویر نہالی سے

عدم کی سیر کی ہستی میں میں نے شعر حالی سے — بندھے مضموں کمر کے بیشتر نازک خیالی سے

وہ کشت سیر حاصل سرزمین عشق میں ہوں میں — ملے گا ہاتھ دہقاں خوب میری پائمالی سے

قد اپنا ضعف پیری سے نہ خم اے سرکش سمجھو — تواضع کی رہی ہے مشق ہم کو خوردسالی سے

چمن میں کونسا محبوب شوخ و شنگ آیا تھا — ہوا ہے سرخ گوش گل یہ کس کی گوشمالی سے

نہ بھولی ترک دنیا سے حلاوت عشق بازی کی — فقیری میں بھی ہم کو شوق ہے اسم جمالی سے

خدا محفوظ رکھے برق سے خرمن کو دہقاں کے — پہنچ لے مجھ تلک دانہ مری قسمت کا بالی سے

پسینے کی ترے آتی ہے ان میں سے بہت خوشبو — رہے گا بلبلوں کو خار گلہائے نہالی سے

سر بازار جب ہونے لگا سودائے حسن اُس کا — خجالت ہم نے کھینچی صدر اپنے دست خالی سے

حیرانِ کار ہیں خطِ سبزِ بتاں میں ہم
پاتے ہیں یہاں بہار کا عالم خزاں میں ہم

تنہا روی قبول نہیں دردِ سر قبول
خاموش ہو جرس تو رہیں کارواں میں ہم

اُس سے بھی پیش آتی نہیں غیر دوستی
دشمن سمجھتے ہیں جسے اپنے گماں میں ہم

دردِ فراقِ یار و تمنائے وصلِ یار
یہ یادگار چھوڑ چلے ہیں جہاں میں ہم

منظور قتل ہے کسی منکر کا اس کو صدرؔ
کیا کاٹ پاتے ہیں تری تیغِ زباں میں ہم

مختصر درد و غمِ ہجر کا دفتر ہو جائے
وعدۂ وصل مری جان مقرر ہو جائے

سلسلہ ہے یہی جمعیتِ خاطر کا صبا
نہ پریشان کہیں وہ زلفِ معنبر ہو جائے

ہے یقیں سختیٔ ایام سے اپنے مجھکو
موم کو ہاتھ لگاؤں گا تو وہ پتھر ہو جائے

حیف ہے ہنس کے نہ بولے کبھی یار اور مجھ
روتے روتے شبِ ہجراں سحر اکثر ہو جائے

قہر ہے الفتِ دلِ خوبانِ ہرجائی کے ساتھ
عاشقوں کو قتل کرتے ہیں یہ رسوائی کے ساتھ

دشتِ وحشت میں ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہے وہ
چل نہیں سکتا ہے مجنوں تیرے سودائی کے ساتھ

اس لئے مشہور ہے افسانہ میرا کو بکو
مجھکو الفت تھی کسی محبوبِ ہرجائی کے ساتھ

چشمِ بینا پر ہے روشن فرقِ اصل و نقل کا
دیدۂ تصویر کو کیا ربط بینائی کے ساتھ

رات بھر کرتی بیانِ سوزِ دل پروانے سے
رکھتی گر نسبت زبانِ شمع گویائی کے ساتھ

ہو کے پیدا دوسرے کی شکل دیکھی ہی نہیں
عمر کی ہم نے بسر اے صدرؔ تنہائی کے ساتھ

حرمان و یاس و غم کا شگفتہ چمن نہ ہو
جب تک کہ تازہ سینے کا داغِ کہن نہ ہو

ممکن نہیں کشادہ جبیں سے تری جبیں
تیرے دہن سے تنگ یقیں ہے دہن نہ ہو

شالِ سیاہ لپیٹی ہے کانوں سے یار نے
اندیشہ ہے مجھے کہیں سورج گہن نہ ہو

ردیف (ض)

ضاحک

میر غلام حسین ضاحکؔ تخلص پدر میر حسن شخصے قابل و ظریف الطبع بود مزاجش بطرف ہزل گوئی بیشتر راغب و با مرزا رفیع اور را مکابرہ ہم در پیش آمدہ چیزے او و چیزے او در حق یکدیگر از قسیم ہجویات جا و یدند۔ شعرے بہ طریق ندرت نوشتہ۔

قصہ تھا محبت کا کہ کوتاہ نہ ہوتا　　در پیش اگر روزِ اجل آہ نہ ہوتا

ضمیر

میر مظفر حسین ضمیرؔ تخلص خلفِ قادر حسین خاں سر آمدِ صلحائے عالی مقدار جوانِ سخنی و ذو فنون است عمرش سی سالہ خواہد بود ہمراہ شیخ محمد بخش کہ واجد تخلص دارد شیرینی تقسیم کردہ بود و بحلقۂ شاگردی نفیر در آمدہ بود، ارادہ آں داشت کہ ہرگاہ نظم کردنِ شعر را بیا موزم مرثیہ و سلامِ جناب سید الشہداء علیہ السلام گفتہ باشم آخر چوں بغایت رسید نامی در مرثیہ گوئی برآورد[1]۔ از دست :-

صدمے سے شبِ ہجر کے کب جان بر آئی　　یہ شام نہیں آئی قضا ہی مگر آئی

دیکھا مرا بستر جو کل اُس شوخ نے خالی　　ہر چند کیا ضبط مگر آنکھ بھر آئی

کرتا ہے کئی دن سے مرے قتل کی تدبیر　　صد شکر کہ اُس بت کی طبیعت ادھر آئی

آتے ہی ترے آ گئی ایک جان سی تن میں　　اے نکہتِ گیسوئے معنبر کدھر آئی

تصویرِ خیالی کی تری کیا کہوں شوخی　　گہہ چھپ گئی نظروں سے تو گاہے نظر آئی

---

(۱) برآورد و گوئے سبقت ربودہ۔ (ن)

گلشن میں خزاں آئی تو بلبل یہ پکاری
اب فصلِ بہاری گلِ داغِ جگر آئی

تربت پہ چڑھانے کو ترے سوختگاں کے
لے کر پرِ پروانہ نسیمِ سحر آئی

ہر تارِ نہانی ہی کو سمجھا میں رگِ گل
یاد اُس گلِ نازک کی جو مجکو نگر آئی

پوچھو تو ضمیرِ جگر افگار کہاں ہے
جس دن سی گیا وہ نہ پھر اُس کی خبر آئی

حالت مری جب اُس کو دگرگوں نظر آئی
اور دل کو تو کیا چشمِ مسیحا کی بھر آئی

کاہیدہ کیا آہ جنوں نے مجھے یہاں تک
زنجیر مرے پاؤں کی آخر اُتر آئی

کس وقت پھنسی تھی کہ رہا ہو کے چمن تک
لے دوائے نہ پھر بلبلِ بے بال و پر آئی

حسرت کا داغ لے کے چلے ہم بجائے گل
سب یہ کہیں کہ ہم بھی گلستاں سے لائے گل

آیا ہوں سننے نالۂ مرغِ چمن ضمیر
لائی نہیں ہے مجکو چمن میں ہوائے گل

جب تک کہ تو جلوہ گر نہ ہووے
میری شبِ غم سحر نہ ہووے

افسوس کہ جی سے ہم گذر جائیں
اور تیرا ادھر گذر نہ ہووے

عاشق ترا اپنی جان کھووے
پر حیف تجھے خبر نہ ہووے

مرجائیں ہم آہ کرتے کرتے
اور دل میں ترے اثر نہ ہووے

صد حیف ضمیر ہم تو روئیں
اُس کی کبھو چشم تر نہ ہووے

ضبط

نوازش علی خاں ضبط تخلص خلفِ مقصود علی خاں تیر انداز ولد عارف اللہ خاں[1]

---

(۱) عارف خاں (ن)

ازخواصانِ جناب فردوس آرام گاہ خاتمِ سلطنتِ ہندوستان محمد شاہ بادشاہ غازی کہ از عرب(۱) آمدہ بودند دریں جا ثروت حاصل کردہ مشارٌالیہ جوانیست بزہد و صلاح آراستہ و بزیورِ اخلاق پیراستہ بمقتضاے موزونیٔ طبع کلامِ موزونِ خود را بہ شیخ امام بخش ناسخ می نماید ازوست :-

چرخ کیا تو نے یہ اے گنبدِ گرودں مارا | کہ ہمیں ہجر میں کرخستہ و محزوں مارا
لختِ دل آنے لگے ہمرہِ اشک اب ہوائے | تم نے رو رو کے مجھے دیدۂ پرخوں مارا
وہ بلا ہی مرضِ عشق عزیزو جس نے | کوہکن کوہ میں اور دشت میں مجنوں مارا
منزلِ عشق تھی گو ضبط بہت دور دراز | ہم نے اس میں بھی قدم حد سی کچھ افزوں مارا

کس کس جفا پہ ضبط کیا تو نے آہ ضبط | اللہ رے تیرا ضبطِ سخن اور خموشیاں

ردیف (ط)

طپاں

میرزا رمضان بیگ طپاںؔ تخلص ولدِ مرزا رجب بیگ ابنِ مرزا مدار بیگ قوم مغل چغتہ ساکنِ قصبۂ آسیون من مضافاتِ صوبہ اودھ سرکار لکھنؤ کہ بزرگانش در عہدِ سلاطینِ ماضیہ از ہر و در ہندوستانِ جنت نشان شاہجہاں آباد آمدہ شرفِ آستاں بوس بادشاہی دریافتہ بخدمتِ چکلہ داریٔ پرگنہ قصبۂ مذکور و معافیٔ بعضے قریاتِ متعلقۂ آں سرباہات

---

(۱) کہ جدش از عرب دہلی آمدہ و ازاں جا بہ لکھنؤ نشو و نما یافت: و از جانب والدہ سید۔ (ن)

برافراختہ دراں قصبہ توطن اختیار کردند و خودش در باگر مؤنجانہ جدِ مادرِ خود تولد دنشو ونما یافتہ و در آسیوتن بہ سن تمیز رسیدہ جوان شوریدہ مزاج است، در سنہ ۱۲۲۵ھ از موطنِ خود برائے تلاشِ معاش واردِ لکھنؤ گردیدہ چوں قوت علمی داشت خود را بمقتضائے موزونیِ طبع بہ گفتنِ شعرِ فارسی و ہندی و نثر نویسیِ سلیس و عاشقانہ وغیرہ مصروف ساخت و رجوع برائے اصلاح بہ فقیر آوردہ و در مدتِ ہفت[1] سال ہر دو زبان فارسی و ہندی را بلد شدہ بالفعل در مشاعرہ ہا کلامش رونقِ تمام پیدا می کند و موردِ تحسین و آفرینِ ہمسراں می گردد و مختصر و عاشقانہ گوئی پسندِ اوست، عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود از وست :-

بے زبانم بہ سوالے لب خود وا نہ کنم　　جاں بہ حسرت دہم و عرضِ تمنا نہ کنم
اے طپاں سوے ارم گر ببرندم ز او　　چشم پوشم ز رخِ حور تماشا نہ کنم

سرے با تیغ ابرو داشت با مژگانِ دلبر ہم　　گلویم شب تہ شمشیر بود و زیر خنجر ہم
نہ دانم ایں قدر من در شب ہجراں چہ بیتابم　　کہ خواہم بر زمیں می تابد و بر روئے بستر ہم
طپاں صاحب علم گویند و ہم صاحب قلم ما را　　فرو آرد با سر مردِ میدان و سخنور ہم

رفت از برِ من آفت جانی کہ داشتم　　دادم ز دست سرو روانے کہ داشتم
دل پارہ پارہ گشت ز تابِ جمالِ دوست　　شد نذرِ ماہتاب کتانے کہ داشتم
بر باد شد ز دستِ فلک آں ہم اے طپاں　　در کویش از مزار نشانے کہ داشتم

خواہم گریم گہے بہ پیشش　　آگاہ کنم ز حالِ خویشش

---

(۱) در ہفت سال چنیں مشق سخن نمودہ کہ از ہمہ سر بر آوردہ است. (ن)

مجروحِ نگاہ می دہد جاں — مرہم نہنی چرا بریشش
عقرب کہ بود تہ قبایم — اے کاش خوری تو نیز نیشش

در پسِ پشت ببیں گوش برآوازے ہست — سخن آہستہ بزن گر بنتا ازے ہست
بے سبب نیستی از دردِ غریباں منکر — می نماید کہ بہ بزمِ تو سخن سازے ہست
ساختم مونسِ جاں چوں تو پری رخسارے — ہاں بدانست خود البتہ مرا نازے ہست
مفلسم گرچہ ولے حوصلہ عالیست طپاں — بال فرسودہ ہنوزم سرِ پروازے ہست

مُردم بہ غمت صبا خدا را — گوے آں یارِ بے وفا را
اے وائے بحالِ ما غریباں — لطفے نہ بود اگر شما را
انکار مکن ز بوسہ در وصل — از یاد ببر دمے حیا را
مردیم ز دردِ ہجر مردیم — رہ نیست بکوے یار ما را
ہمراہِ جنازہ کاش آئی — از کوے تو می برند ما را
یارب بہ شبِ فراق شاید — تاثیر ندادۂ دعا را
دل دادہ طپاں بپادشاہے — گو کشتہ ز جور صد گدا را

بردل بہ کنیم جبر تا چند — اے وعدہ خلاف صبر تا چند

تا چند طپم بے او اے مرگ نے آئی تو — مردم بغمِ جاناں بے رحم کجائی تو
زیں خندہ کہ خواہی کشت امروز یقیں دارم — فردا بسرِ خاکم با چشمِ تر آئی تو
جاں بر شدن از دستت معلوم نمی دانم — اے عشق چہ خوانندت ظالم چہ بلائی تو

زراہِ لطف اگر سویم نگہ دلدار م اندازد — ہزاراں رخنہ چرخِ کینہ ور در کارم اندازد

نقاب افگندہ بر رخ می رسد آں شوخ در محشر — کہ آں جا ہم بدر رہ حسرتِ دیدارم اندازد

علاجِ ایں طبیباں سازوارم چوں نمی آید — اجل کو تا نقابے بر رخ بیمارم اندازد

کند دام اے طبیباں از ہمت من پائے رفتارے — جنابِ خضر اگر خود را بدستِ خارم اندازد

رشکم زبدل خوردن پیکانِ تو آید — برگشتہ نازے کہ ز میدانِ تو آید

آں پنجہ کجا کاں سرِ دامانِ تو آید — کو دست کہ او تا بہ گریبانِ تو آید

باشد کہ دلا یار بدردت رسد اکنوں — غالب کہ مسیحے پئے درمانِ تو آید

حاشا کہ دمے بے تو من آسودہ نشینم — مشکل کہ قرارم شبِ ہجرانِ تو آید

در سینہ نگہدار طبیباں ایں دمِ آخر — تا بر سرِ بالینِ تو جانانِ تو آید

باکہ گویم اے طبیباں غمِ دل — ناید از دوست غمگساریِ ما

چہ آتشے کہ نیفتاد در دلِ شیریں — ازاں چراغ کہ بر گورِ کوہکن می سوخت

جاں نمی رود از تن ہجر جاں گزاے ہست — اے اجل اگر آئی یا تو مدعائے ہست

اشعار ہندی

مدت سے میاں نقاہت گھر کر گئی ہے تن میں — وہ دن گئے جو طاقت پاتے تھے ہم بدن میں

دستِ حنائی سے جو کفنا گیا ہے قاتل — مہندی کی بو ہے میرے لوہو بھرے کفن میں

شیریں عبث ہے رونا، نادان لکھ دیا تھا — کلکِ قضا نے یونہی تقدیرِ کوہکن میں

عاشق تھی گل کی بلبل، دیوانہ یار کا میں — کوئے صنم میں مجکو گاڑا اُسے چمن میں

یہ فیضِ مصحفی ہے انصاف کیجئے گر اعزاز ہے طپاںؔ کا جو مجلسِ سخن ہیں

ہاں کیجے ایک بار و یا پھر ہاں نہیں ہم کو نہیں پسند یہ ہر دم کی ہاں نہیں
وہ بولتے نہیں تو نہ بولیں گے یار بھی گر واں دہن نہیں ہے تو یہاں بھی زباں نہیں

ہم آزما چکے ہیں بہت گرم و سردِ عشق دیکھیے اُسے فریب جو ناکردہ کار ہو

ہووے بیتاب مری طرح سے فریاد کرے وہ بھی دن ہو کہ کبھی وہ بھی مجھے یاد کرے

ہم ہیں مجروحِ نگہ اک پردگی کے اے طپاںؔ زخمِ دل جراحِ نامحرم کو کیا دکھلائیے

اے طپاںؔ عشق تھا اک پردہ نشیں سے مجکو جان دی میں نے پہ ظاہر نہ مرا راز ہوا

جفائیں جھیلیاں پر دم نہ مارا طپاںؔ قائل ہوں میں تیری جگر کا

اس کو کہتے ہیں بیقراریِ عشق گو رہیں بھی ہمیں قرار نہیں
کس کے غم میں گھل گیا ہے ان دنوں اے طپاں تیرا تو وہ عالم نہیں

رنج جھیلوں کب تلک اُس بن دم نکل جاوے کہیں وہ نہیں آتا نہ آوے موت ہی آوے کہیں
دیر کیوں قاصد نے کی ہے کچھ بھید کھلتا نہیں ہم جوابِ خط سے گذرے نامہ بر آوے کہیں
اے طپاںؔ وہ تو نہ آیا چین کیونکر آئے گا دھیان ہی اُسکا کرو تا رات کٹ جاوے کہیں

کون اٹھاوے گا ترے جور و جفا میرے بعد
دخل کیا ہے جو کوئی نام وفا میرے بعد
اے طپاںؔ کاش موئے پر تو مجھے یاد کرے
اتنی توفیق اُسے دیوے خدا میرے بعد

دور یارانِ رفتہ بستے ہیں
اُن کی شکلوں کو ہم ترستے ہیں
میری حالت سی کاش ہوں آگاہ
میرے رونے پہ جو کہ ہنستے ہیں
ہے مشبک دل و جگر اپنا
جان نکلے تو لاکھ رستے ہیں
سیکھ ہم سے طریق رونے کا
دیکھ اے ابر یوں برستے ہیں
یک طرف آیئے طپاںؔ ہم تو
اُن کی صورت کو بھی ترستے ہیں

سوزِ غمِ جاناں میں جلتا تھا طپاںؔ شاید
شب ہم نے کسی گھر میں دیکھا تھا دھواں ہوتا

یار آتا ہے شبِ ہجر نہ تو آتی ہے
رحم لازم ہے اجل کس لئے ترساتی ہے
روکئے غیر سے ملنے کو تو ہو آزردہ
بات وہ آپ کی چڑھ ہی جو مجھے بھاتی ہے

جن کو گل کرنا نہ بھاتا تھا دمِ خفتن چراغ
حیف ہی اُن کے نہ ہووے گر سرِ مدفن چراغ

بزم میں روشن کرے گر عارضِ جانانہ شمع
رشک سے جل جائے مانندِ پرِ پروانہ شمع
دل پتنگے کا جلا شب دیکھ جانسوزی مری
رات بھر روتی رہی سن کر مرا افسانہ شمع

طالع

شمس الدین تخلص طالع۔

جفائے یار کو ہم التفاتِ یار کہتے ہیں　　شفا و عافیت کو اپنی ہم آزار کہتے ہیں

طرب

چھنو لال طرب تخلص ولد منشی رسوا رام قوم کائتھ سکسینہ وطنِ بزرگانش شمس آباد و بعضے از بزرگانش چندے در شاہجہاں آباد ہم استقامت داشتہ خودش در لکھنؤ تولد شدہ وہم اینجا نشو ونما یافتہ و بہ سنِ تمیز رسیدہ چوں از عالمِ مکتب نشینی در صغرِ سن موزوں طبع داشت از ہفتدہ سالگی چیزے موزوں می کرد آخر از نظرِ نوازش حسین عرف مرزا خانی می گذارند حالا چوں کلامش از فیضِ صحبت بزرگاں بپایۂ پختگی رسیدہ از استادِ خود پائے کم نمی آرد عمرش تخمیناً بست وسہ سالہ خواہد بود ، ازوست :-

کس کو دکھاؤں میں یہ بھلا ماجرائے چشم　　ناسور پڑ گئے ہیں عزیز و بجائے چشم

ان دونوں پر ہے عشق میں ایک حادثہ بڑا　　روتی ہے چشم بہرِ دل و دل برائے چشم

مجکو کسی سے خلق میں چشمِ وفا نہیں　　رد یا نہ میرے حال پہ کوئی سوائے چشم

باتیں تری سنا کریں اور دیکھیں تیری شکل　　وہ مدعائے گوش ہے یہ مدعائے چشم

آوے طرب جو تیرا وہ خوش چشم باغ میں　　نرگس کے دستِ کیجیو تو بھی فدائے چشم

کام اپنا خیالِ رُخِ جاناں سے نکالا　　کارِ شبِ عشرت شبِ ہجراں سے نکالا

یہ ساری پریشانیاں کیں ہم نے گوارا　　لیکن نہ دل اُس زلفِ پریشاں نے نکالا

ہم سہہ نہ سکے طعنۂ ابنائے زمانہ　　غیرت نے ہمیں محفلِ یاراں سے نکالا

یہ طالبِ ایذا ہیں کہ جو پاس لگا خار　　ہم نے جو نکالا اُسے پیکاں سے نکالا

دل کو شطِ الفت میں طرب آپ ڈبایا　　دانستہ اُسے ہم نے نہ طوفاں سے نکالا

سدا شبنم کو اپنی چشمِ تر پر رشک آتا ہے
گلِ تر کو گلِ زخمِ جگر پر رشک آتا ہے

ہماری آہ نے ایسا اثر پیدا کیا ہے اب
دعائے خلق کو جس کے اثر پر رشک آتا ہے

قدم بوسیِ جاناں ہر گھڑی اُس کو میسر ہے
مرے ہونٹوں کو اسکے سنگِ در پر رشک آتا ہے

یہ رخسارِ صنم پر کیا ہی گستاخانہ پھرتی ہے
ہمیں تو ہر گھڑی اپنی نظر پر رشک آتا ہے

نہ جس کو دین کی خواہش ہے نے کچھ کام دنیا سے
طربؔ ہم کو بس ایسے ہی بشر پر رشک آتا ہے

یہ کس کی جستجو میں اس قدر بیتاب پھرتا ہے
جو یوں آٹھوں پہر خورشیدِ عالم تاب پھرتا ہے

زبس ہیں گرد پھرنے کی ہوس میں اُسکے رہتا ہوں
تو اشک آنکھوں سے گر کر صورتِ گرداب پھرتا ہے

طالب

پنڈت کشمیری کہ طالبؔ تخلص می کند پیش ازیں در حینِ حیاتش شاگردِ جرأت بود و در ایامیکہ میاں نصیرؔ بار دوم از شاہجہاں آباد بہ لکھنؤ گذر کردند بہ حلقۂ تلامذۂ ایشاں در آمد عمرش تخمیناً سی و پنج سالہ خواہد بود، از وست :-

دل[1] یہ بے وجہ نہیں کاکلِ دلدار میں ہے
دیکھئے کیونکہ ہو جانبر دہنِ مار میں ہے

جوں ترے خال تہ زلف ہیں تاباں اے ماہ
یوں چمک کاہی کو تاروں کی شبِ تار میں ہے

دیکھنے کا ترے ہے مجکو تعشق اتنا
رات دن تارِ نظر رخنۂ دیوار میں ہے

عِلمِ آہ لئے کچھ نہ فقط فوجِ سرشک
صف بصف آ کے کھڑی کوچۂ دلدار میں ہے

ہمدموں لختِ جگر کے مرے ٹک دیکھو تو
لال یہ ملتے ہی کبھی دیدۂ خونبار میں ہے

عشق میں کیا ہوئے انگشت نما ہم طالبؔ
ذکر اپنا ہی ہر اک کوچہ و بازار میں ہے

---

(۱) دل تو بے وجہ پھنسا کاکل دلدار میں ہے (ن)

کس لئے تم ہم سے خفا ہو گئے — طور جو اگلے تھے سو کیا ہو گئے
کھل گئی جوں گل مرے دل کی کلی — وا جو ترے بندِ قبا ہو گئے
مُور(۱) تری چال پہ مرتے ہیں اب — کبکِ دری کب کے فدا ہو گئے
شب کی نہ کچھ پوچھو کہ ہم کس لئے — جان سے بھی تنگ دلا ہو گئے
خواب میں دلبر سے ہم آغوش تھے — آنکھ کے کھلتے ہی جدا ہو گئے

ہے جوں رخِ گلنار ترا ماہ جبیں سرخ — یوں صبح کو خورشید بھی ہوتا ہی کہیں سرخ
نام اس کا جو کھدوائے تو ہی لختِ جگر بس — ایسا نہیں ملنے کا دلا کوئی نگیں سرخ
وہ رنگ تو آتش میں بھی اے شوخ نہ دیکھا — غصے میں جو دیکھا ہی ترا روئے حسیں سرخ
ہے آمدِ لختِ جگر اب سینے سے اسکے — آنکھیں ترے طالب کی یہ بیوجہ نہیں سرخ

تو جو کہتا ہی کہ میں کل ترے گھر آؤں گا — ہی بھروسا یہ مجھے بختِ بدانجام سی کب
فصلِ گل آئی ہی اور نغمہ سرا ہے بلبل — دیکھیں ہم چھوٹیں گے صیاد کے اس دام سی کب
دلِ غم دیدہ تو ہے تشنۂ دیدار ترا — اس کو تسکین ہو بھلا نالہ و پیغام سی کب

طالب

مولوی اللہ داد عرف حافظ شبراتی طالب تخلص شاگردِ مولوی قدرت اللہ شوق حیثمش در ایامِ طفلی از چیچک رفتہ باوجودِ نابینائی تحصیلِ علومِ عربیہ نمودہ فاضلے است متبحر و عالمے است ملاس (؟)، مسکنش رامپور است۔ عمرش چہل سالہ خواہد بود۔ ازوست:

---

(۱) کون تیری چال پہ مرتا نہیں (ن)

جی سے جاتا ہوں مجھے تھام کسی صورت سے
کام دل سے بت ناکام کسی صورت سے

قاصدا روز ہی وعدے کا بہانہ مت کر
لے پہنچ آج تو پیغام کسی صورت سے

نیک نامی میں تو حاصل نہ کیا کچھ میں نے
عشق اب کر مجھے بدنام کسی صورت سے

میں تو غش ہوں کسی صورت پہ نہ بیمار طبیب
ہم کو ہوتا نہیں آرام کسی صورت سے

شکل ہو خوب کسی کی تو مجھے کیا طالب
میں تو رکھتا نہیں کچھ کام کسی صورت سے

دل سے لے نالہ ہوئی صبح بدر ہو اس وقت
نور کا وقت ہی شاید کہ اثر ہو اس وقت

ایک بھی تم نہیں دیتے مری باتوں کا جواب
کس طرف دھیان ہی فرماؤ کدھر ہو اس وقت

ایک بوسے نہ تبدیل ہوا منہ کا مزہ
کیا مزا ہو جو کرم بار دگر ہو اس وقت

بزم اغیار میں دیکھو ہو تماشا بیٹھے
کیا تماشا ہے جو طالب کو خبر ہو اس وقت

ردیف (ظ)

ظاہر

خواجہ محمد خاں ظاہر تخلص

اے آہ اس قدر تو گر بے اثر نہ ہوتی
ممکن نہ تھا کہ اس کے دل کو خبر نہ ہوتی

ظہور

شیو سنگھ ظہور تخلص از سابقین است

چمن میں باندھنے مجکو نہ آشیاں دیتا
گلوں سے ملنے کی رخصت تو باغباں دیتا

جی نکلتا ہے مرا اُس بے وفا کے واسطے　　اُس کو لے آؤ کوئی مجھ تک خدا کے واسطے

ظہور

میرزا ظہور علی ظہورؔ تخلص از قدماست

اک نگہ میں غلام ہوتا ہے　　ٹک اِدھر بھی میاں نظر کرنا
راہ حق کی ظہورؔ ہے درپیش　　اس مکاں میں نہیں ہے گھر کرنا

فغان و آہ و نالہ سے نہیں آرام ٹک جی کو　　یہ دل ہے یا جرس ہے یا کوئی بیمار پہلو میں

کہے کوئی جا کر مری داستاں کو　　کہاں لے چھپا یار دلِ ناتواں کو

مکانِ سیر ہے پیارے نہ یہاں سے رم کیجے　　یہ گھر فقیر کا ہے بیٹھے کرم کیجے

ہمصفیر و رہو خوش ہم سے چمن چھوٹے ہے　　رخصتِ عیش و طرب ہے کہ وطن چھوٹے ہے

ظہور

منشی ظہور محمد ظہورؔ تخلص قوم شیخ خلفِ محمد اسمٰعیل صاحب عرف منشی نہال[1] مرحوم

---

(۱) عرف منشی نہال بن حافظ محمد صالح قوم شیخ ساکن بلگرام . . . . . موزوں طبع آباء و اجدادش ہمہ حافظ قرآن بودہ اند و ایں حافظ نیست مگر مہارت در ناظرہ خوانی جنیں دارد کہ در دو نیم پاس ختم قرآن شریف می نماید و در فارسی استعداد بقدر احتیاج دارد و بسیار زود نویس و خوشنویس است و در آں آوان مثنوی ظہور عشق منظوم نمودہ و ہر گاہ کہ مولوی مذکور (بقیہ صفحہ ۱۹۲ پر)

بلگرامی جوانے حلیم وسلیم وخود بیں و مہذب الاخلاق است از ابتدائے شباب شوقِ شعر ہندی داشتہ کلامِ اکثر اساتذہ نزدِ خود فراہم نمودہ و بمطالعہ استفادہ حاصل ساختہ و بمقتضائے شوخ مزاجی اول بہ طریقِ ہجو موزوں می کرد بعد وفاتِ والدِ خود بایائے مولوی کرم محمد کرمؔ تخلص کہ سلام و مرثیہ گاہ گاہے گفتہ اند و خیلے ذی اخلاق و فاضل و تبحر اند ازاں مکروہات باز ماندہ مدتے سلام و مرثیہ گفتہ بہ نظرِ اصلاحِ شاں گذرانیدہ بعد چندے کہ مولوی مذکور بہ طرفِ کالپی رفتند گفتۂ ایشاں را کار بند شدہ در سنہ یکہزار و دو صد و سی ہجری در حلقۂ شاگردیٔ فقیر آمدہ قوتِ نظمی پیدا ساختہ کلامش عاشقانہ است و طبعش در روانی چوں آبِ رواں و در زود خوانیٔ قرآن و زود نویسیٔ کتب سوائے منشی گری بے نظیرِ روزگار عمرش از سی متجاوز خواہد بود، از وست:

شب دیکھ کے احوال مری نوحہ گری کا
دم آرہا منقار پہ مرغِ سحری کا

ملتا ہے جوابِ خطِ عشاق بہ شمشیر
کیونکر کرے یہاں عزم کوئی نامہ بری کا

مگر کہ شب کو خیالِ رخِ نگار رہا
بندھا جو صبح تلک آنسوؤں کا تار رہا

کبھی وہ فرش پہ لوٹا کبھی وہ اٹھ بیٹھا
ترے مریض کو شب ایسا اضطرار رہا

ہزار حیف کہ ہم خاک ہو گئے مر کر
اور اب تلک ترے دل میں وہی غبار رہا

خیال کس کے رخ و زلف کا تھا تجکو ظہورؔ
سحر سے شام تلک تو جو اشکبار رہا

(بسلسلہ گذشتہ) بہ طرفِ کالپی رفتند بایائے شاں کہ نہایت منصف اند در ۱۲۳۰ھ در حلقۂ شاگردیٔ فقیر آمدہ مائل بہ غزل گوئی گردید در کمتر مدت دیوانے ترتیب دادہ اکنوں دیوانِ دوم ترتیب می دہد، و ارادہ دارد کہ دیوانِ خمسہ ہم ترتیب دہد و دو کتابِ نثر و ریختہ یکے بہ انیسِ ظہور و دگری خاتمِ سلیمان نیز تحریر ساختہ است و ایں ہمہ از اصلاحِ فقیر درست شدہ است۔ (ن)

باغِ جنت میں بہت یہ دلِ دلگیر لگا ۔۔۔ دی جو رضواں نے ترے سامنے تصویر لگا

جس کی زلفوں کا گرفتار ہوں میں کیا کہوں ۔۔۔ سوئے ہے ہر وہ سرِ شام سے زنجیر لگا

ہر لبِ زخمِ جگر وا ہے تمنا میں ہنوز ۔۔۔ او کماں ابرو مرے اور بھی اک تیر لگا

حال پوچھے تھا وہ زیں پیش تو اکثر میرا ۔۔۔ کیا سبب اب جو خفا ہو گیا دلبر میرا

رات بھر نالہ و فریاد کیا کرتا ہے ۔۔۔ ایک دم چپ نہیں رہتا دلِ مضطر میرا

کانپ اٹھتا ہے ترے کوچہ سے جو آتی ہے نسیم ۔۔۔ صورتِ بید کبھو یہ تنِ لاغر میرا

شوق دیدار یہی ہے تو ظہورؔ اس کو میں ۔۔۔ پیشتر مجھ سے نہ پہنچے گا کبوتر میرا

کیوں یارِ بے وفا پہ دلا مبتلا ہوا ۔۔۔ رسوا ہوا ذلیل ہوا تو بھلا ہوا

پہنچائی میری خاک نہ کوچے میں یار کے ۔۔۔ اتنا بھی کام تجھ سے نہ بادِ صبا ہوا

سنیو کہ کتنے چاک گریباں ہوئے ظہورؔ ۔۔۔ وحشت کا میری شور اگر جابجا ہوا

جب تلک حسن سے اپنے وہ خبردار نہ تھا ۔۔۔ کوئی اس شوخ ستم گر کا خریدار نہ تھا

اُس بیاباں میں گذر تھا مرا یارو جس جا ۔۔۔ محرمِ آبلہ پایانِ جنوں خار نہ تھا

اس کے دروازے پہ کیوں تو نے فغاں کی اے دل ۔۔۔ خیر گذری یہ کہ گھر میں وہ ستم گار نہ تھا

رات کو جا کے جو دیکھا ترے بیمار کے پاس ۔۔۔ آہ و نالہ کے سوا ایک بھی غمخوار نہ تھا

ملتے ہی یار کے بس تو نے شفا پائی ظہورؔ ۔۔۔ جز تپِ ہجر تجھے دوسرا آزار نہ تھا

کیوں گرا ہے دلا کچھ تجھے آزار ہے کیا ۔۔۔ تو کسی نرگسِ بیمار کا بیمار ہے کیا

دیکھ کر نبض مری رو رو طبیبوں نے کہا ۔۔۔ کچھ نہیں ہم پہ یہ کھلتا ترا آزار ہے کیا

آب و دانہ کی بھی صیاد کو جب ہو نہ خبر
سمجھے کیا خواہشِ مرغانِ گرفتار ہی کیا

رات دن تجکو جو روتے ہی گذرتا ہی ظہور
تجھ سے کچھ یار ترا ناخوش و بیزار ہی کیا

گھر سے باہر نہ کبھی اس کو نکلتے دیکھا
سیکڑوں کو کفِ افسوس ہی ملتے دیکھا

نخلِ مومی کی طرح سے چمنِ دہر میں آہ
کس نے اے یارو مجھے پھولتے پھلتے دیکھا

عجائب رنگ کل اس چشمِ گریاں نے دکھایا تھا
نہیں گر تھمتا آنسو تو پھر طوفان آیا تھا

نہ غم رکھتے تھے ہم کچھ سایۂ خورشیدِ محشر کا
تری دیوار کا جب تک ہمارے سر پہ سایا تھا

بُرا ہو دستِ وحشت کا کہ اُس نے کر دئیے پرزے
ابھی اپنا گریباں میں نے ناصح سے سلایا تھا

پسے جاتے ہیں غنچے سب دہانِ تنگ سے اُس کے
کچھ اس انداز سے وہ گل چمن میں مسکرایا تھا

بھلا مر کر تو فرصت گردشِ ایام سے پائی
کہ جیتے جی تو ہم کو خوب سا اس نے پھرایا تھا

بڑا احساں ہی تیرا ہم پہ جو اے ابر برسا تو
صبا نے ورنہ اُس کوسی غبار اپنا اڑایا تھا

ظہور اب تجکو وہ منہ بھی لگانے کا نہیں گاہی
بھلا کس واسطے ایسی سی تو نے دل لگایا تھا

اس قدر شوقِ جراحت دلِ نخچیر میں تھا
زخم کھائے تھی ولے دھیان ترے تیر میں تھا

جوہرِ تیغ سے آتی تھی مجھے نکہتِ گل
خون بلبل کا لگا کیا تری شمشیر میں تھا

دفعِ آفات کی کیں میں نے بہت تدبیریں
پیش آیا وہی جو کچھ مری تقدیر میں تھا

کھول کر پٹ میں کھڑا سنتا رہا دیر تلک
کچھ عجب ناز کا کھٹکا تری زنجیر میں تھا

مجکو مانی نے جو دکھلائی شبیہِ قاتل
بانکپن صاف عیاں نقشۂ تصویر میں تھا

نت پھاڑے ہی دامان نسیمِ سحری کا
یہ شوق ہے وحشی کو تری جامہ دری کا

دیوانہ ہوں میں ایک پری چہرہ کا مجکو
آسیب نہیں جن کا نہ سایا ہے پری کا

پوشاک یہ بھاتی ہے مرے سیم بدن کو
چکن جو ہو سادی تو کمر بند زری کا

اک روز ترے لب کا لیا تھا کہیں بوسہ
اب تک ہے مرے منہ میں مزا گل شکری کا

نے ہوش ذرا سر کا نہ پاؤں کی خبر کچھ
ان روزوں یہ عالم ہے مری بے خبری کا

کر باغ محبت کی ذرا سیر کہ اُس میں
ہر نخل نے پایا ہے ثمر بے ثمری کا

نہ طاقت ہے گھر آنیکی نہ واں مقدور جانے کا
مزہ ہم نے اٹھایا خوب اس دل کے لگانے کا

کوئی کہدے امیروں سے نہ بھولو اپنی دولت پر
بدل جاتا ہے نقشہ ایک ساعت میں زمانے کا

قفس سے چھوٹ کر آیا ہوں گلشن میں نہ ہوں کیونکر
لئے جاتا ہے کھینچے مجکو جذبہ آب و دانے کا

ہوائے دید جاناں ہے بھری سر میں بہت یارو
کھلا رکھنا ہماری گور میں تختہ سرہانے کا

ظہور اس کو تو دیکھو ذبح کے دم اپنے بسمل سے
نکالا ہے نیا انداز اُس نے منہ چھپانے کا

گو قتل ہزاروں کو وہ جلاد کرے گا
پر وضع تڑپنے کی مری یاد کرے گا

اے آہ اسیروں کا قفس تو ہی جلا دے
کس کس کو رہا دام سے صیاد کرے گا

ان دنوں آپ کی ہے گرمی بازار بہت
جنس کمیاب پہ گرتے ہیں خریدار بہت

دیکھ لینے دے دم ذبح مجھے جانب یار
اتنا احساں ہے ترا خنجر خوں خوار بہت

کس کے احوال کی صیاد نے کی ہے پرسش
ہم سے ہیں دام تغافل میں گرفتار بہت

خوں لگا ہے مرے قاتل کے جو داماں میں ظہور
کوئی چھڑکتا ہے کرتے دھوتے میں اصرار بہت

منہ سے برقع کو صنم اپنے نہ زنہار الٹ
ورنہ کتنوں ہی کا دم جائے گا اے یار الٹ

کفِ افسوس ملے روح نے میری اُس دم
لگتے ہی تن پہ گئی جب تری تلوار الٹ
مارے بیتابی کے کل کنجِ قفس میں صیاد
اتنا تڑپا کہ گیا مرغِ گرفتار الٹ

دھوتے ہو دامن سے تم آج مرا خوں عبث
باندھتے ہو دل میں یار اپنے یہ مضموں عبث
ناقہ چلا وہاں سے جب غیب سے آئی ندا
دشت میں اب نجد کے بیٹھے ہو مجنوں عبث

یار رو کیا آیا ہے مقتل کی طرف قاتل آج
ئے جاتا ہے ادھر کھینچے مجھے جو دل آج
رنگ گریہ کا نکلا ہے ہمارے آخر
قطرۂ اشک میں ہے خون بھی کچھ شامل آج
کس کا لاشہ ہوا مدفون ترے کوچے میں
آسماں پر سے جو ہوتے ہیں ملک نازل آج
تیرہ بختی میں تری نذر کروں کیا کیا کچھ
میرے گھر میں اگر آوے وہ مہ کامل آج
غم جاناں میں کوئی ڈوب موا کیا جو ظہور
شکل تصویر ہے خاموش لبِ سائل آج

تھی گر چہ جائے رحم دلِ نازنیں کے بیچ
پر ہم تو مر چلے نگہِ خشمگیں کے بیچ
تصویر ار مغاں جو کوئی یاں سے لے گیا
خاکے کھنچا کریں گے ترے ملکِ چیں کے بیچ
وحشت نے گرد کھایا اثر اپنا ہر کہیں
ٹھہرے گا میرا نام نہ ہرگز نگیں کے بیچ

اک نظر آ کے جو دیکھے ترا بیمار مسیح
آہ بے ساختہ کھینچے وہیں اک بار مسیح
اُس کا کس واسطے احسان اٹھاؤں یارو
کام عیسیٰ سے مجھے کیا ہے مرے یار مسیح
بھول جاوے وہیں اعجاز کو اپنے وہ بھی
گر کبھی خواب میں دیکھے لبِ دلدار مسیح

دلِ وحشت زدہ کیونکر کرے گلزار پسند
کہ اُسے آتے ہیں جنگل کے خس و خار پسند

کشتی بیٹھے ہیں زانو پہ دھرے سب سر کو　　دیکھئے کس کو کرے یار کی تلوار پسند
بال و پر جب نہ رہے ایک بھی اُس کا باقی　　کیوں قفس کو نہ کرے مرغ گرفتار پسند
ایک دو چمن کے وہ صیدوں میں سے کرتا ہے اسیر　　ہے طبیعت مرے صیاد کی دشوار پسند
سب سے انداز جدا ہے ترے کہنے کا ظہور　　اہلِ دانش نہ کریں کیوں تری اشعار پسند

گو لکھے سادہ اُسے عاشقِ گریاں کاغذ　　اشکِ خونیں سے وہ ہو جائیگا افشاں کاغذ
شوقِ وصل اُس کو میں لکھتا ہوں تعجب کیا ہے　　ہووے خامے سے اگر دستِ گریباں کاغذ

خون میں وہ کیسا تڑپتا ہے ابھی دل کھول کر　　دیکھ قاتل سیر دست و پائے قاتل کھول کر
اور بھی آہستہ وہ اپنے اٹھاتا ہے قدم　　میں نے دیکھا تیرے وحشی کو سلاسل کھول کر
جلوہ گر ہے ذرے ذرے میں یہاں اُسکا ظہور　　ایک ذرا تو دیکھ تو آنکھ اپنی غافل کھول کر

سر کو ٹکرا کے نہ سنگِ در و دیوار کو توڑ　　جوشِ وحشت ہے دلا تجکو تو کہسار کو توڑ
کس کا دیوانہ ہے وہ جس کے لئے عیسائی　　آج تک بیڑیاں بنواتے ہیں تلوار کو توڑ
جب صنم خانۂ ہستی سے ہوا دل بیزار　　رکھ دیا شعلۂ آتش پہ میں زنار کو توڑ

کس طرح نہ بھاوے مجھے جلاد کا انداز　　ہے سب سے الگ اُس ستم ایجاد کا انداز
اک دن جو گیا سیرِ گلستاں کو اُڑایا　　بلبل نے مرے نالۂ و فریاد کا انداز
چل کر رگِ گردن پہ ذرا سا وہ رہا تھم　　بھایا یہ مجھے خنجرِ فولاد کا انداز

آنکھوں سے رات اتنا بہا خونِ دل کہ بس　　بولے وہ لوگ بیٹھے تھے جو متصل کہ بس

آتے ہی فصل دے کی گلستانِ عشق میں — دل کی کلی کچھ ایسی ہوئی مضمحل کہ بس
بجلی بھی جس کو دیکھ کے آنکھیں چرا گئی — شب آہ سے یہ شعلہ ہوا مشتعل کہ بس
بہرِ طوافِ کعبہ نہ پھر جا سکے دریغ — عشقِ بتاں میں ایسے ہوئے پا بگل کہ بس
دق یہاں تلک کیا مرضِ سل ہوا اب مجھے — اتنا ہے اے ظہور وہ بت سنگدل کہ بس

کیا بھری تھی تری تلوار میں قاتل آتش — زخم کے لگتے ہی جو بن گیا بسمل آتش
دمبدم موج سے دریا کی دھواں نکلے ہے — کس نے سلگائی تھی جا کر لبِ ساحل آتش
نہ لگانے سے کسی کے لگی آتش تن میں — شعلہ رو جان یقیں خود ہی مرا دل آتش
سرد مہری سے تری ظلم تھا اُس پر کیا دو — عوضِ آب جو مانگے ترا گھائل آتش

رہے چمن میں ہوا کچھ نہ باغباں سے فیض — ہمارے بعد یں تو اُٹھ ہی گیا جہاں سے فیض
بچارے قیس پہ بوچھار سی برستی ہے — ہے اسقدر تو اُسے سنگِ کودکاں سے فیض
سگانِ کوئے بتاں کی تو ڈاڑھ گرم ہوئی — نہ گو ہما کو ہوا میرے استخواں سے فیض

کون لیجاوے بھلا اُس پاس مجھ مضطر کا خط — کھینچتا ہو حلق پر قاصد کے جو خنجر کا خط
سبزۂ گلزار اُس کے آگے ہوتا ہے خجل — خوشنما کتنا ہے اے یارو مرے دلبر کا خط
کس طرح اُس سنگدل کے دل سے ..... — آجتک مٹتے نہیں دیکھا کبھو پتّھر کا خط
ساقیا کچھ ایک میں نے ہی نئی مے پی نہیں — ہے پہنچے کشتاں بغداد تک ساغر کا خط

یاروں کا آہ دور گیا کارواں دریغ — اور ضعف سے یہیں رہے ہم ناتواں دریغ
بلبل کہے تھی کیونکہ میں بے بال و پر اڑوں — آتش نے گل کی پھونک دیا آشیاں دریغ

ازبسکہ ناقبولِ سگِ کوئے یار تھے — کھائے ہُمانے بھی نہ مرے استخواں دریغ
یہ کون مرگیا نہیں معلوم اے ظہورؔ — کرتا ہی جس کا ہر کوئی پیر و جواں دریغ

آیا نہ میرے پاس وہ دلبر ہزار حیف — اور آن پہنچا دم مرا سب پر ہزار حیف
چھٹ کر قفس سے مرغِ گرفتار نے کہا — تب چھوٹے جب رہا نہ کوئی پر ہزار حیف

احتیاج اب تو طبیبوں کے بلانیکی نہیں — کہ ہمیں تاب ذرا نبض دکھانے کی نہیں
ملک الموت سے کہدو ابھی پھر جا میری — جان بن دیکھے روئے یار کے جانے کی نہیں
ہر لبِ زخمِ جگر سے یہی نکلے ہے صدا — کچھ تمنا ہمیں مرہم کے لگانے کی نہیں

کردوں ہوں ٹکڑے ٹکڑے اسلیے جیب و گریباں کو — کہ مجکو کاش لیجاوے پکڑ کر کوئے زنداں کو
کرے ہی منع جو اے باغباں سیرِ گلستاں کو — تجھے گلشن مبارک ہو چلے اب ہم بیاباں کو
ذرا دریا دلی دیکھو مرے پاؤں کے چھالونکی — بیاباں میں کیا سیراب، ہر خارِ مغیلاں کو

نکلے نہ اُس کے رہتے تھی دیوانہ پن میں ہاتھ — وحشی کے تیرے اسلیئے باندھی کفن میں ہاتھ
کی جستجو جو آخرِ شب اُن کی بزم میں — کتنے پتنگ سوختہ آئے لگن میں ہاتھ
شیریں نے اُس کی زیست میں خاطر نہ کی ذرا — اب مارتی ہی سر پہ غمِ کوہکن میں ہاتھ
مصروف اپنے کام میں تھے بعدِ مرگ بھی — وحشی کے تیرے کھول کے دیکھو کفن میں ہاتھ
لیلےٰ نے لوگ بھیجے جو اس کی تلاش کو — مدت کے بعد قیس لگا ایک بن میں ہاتھ
سچ کہہ بغیرِ حسرت و حرمان و یاس و غم — کچھ بھی لگا ظہورؔ محبت کے فن میں ہاتھ

واں سے قاصد مرا با چشم پر آب آتا ہے
چشم بد دور یہ نامے کا جواب آتا ہے

کس طرح خواب میں آوے رخِ دلدار نظر
دو گھڑی بھی تو نہیں آنکھوں میں خواب آتا ہے

دور سے دیکھ مجھے یوں کہا اغیاروں سے
دیکھو کس شوق سے وہ خانہ خراب آتا ہے

موت کو یاد رکھے تاکہ ہر اک اہلِ نظر
بحر میں چشم نمائی کو حباب آتا ہے

چمن میں آنے سے اُس کے عجب بہار ہوئی
کلی ہر ایک ہمارے گلے کا ہار ہوئی

حجاب حسن نے شب اُس کو یہاں تلک گھیرا
کہ آئینے سے بھی اس کی نہ چشم چار ہوئی

غنچے کی پنکھڑی تو نسیمِ سحر کھلی
دل کی گرہ ہماری نہ تجھ سے مگر کھلی

اے آہ پھر جہان میں کیا منہ دکھاؤں گا
کُنڈی درِ اثر کی نہ تجھ سے اگر کھلی

جوشِ جنوں کا ہاتھ گریباں پہ شیر ہے
لیکن کبھو نہ یار کی اُس سے کمر کھلی

اب تو صیاد نکال اُس کو قفس سے باہر
دیکھ تو دم بھی کہیں مرغِ گرفتار میں ہے

رشک سے غنچہ کا دل خوں ہے جگر گل کا ہے چاک
رنگ مہدی کا کچھ ایسا کفِ دلدار میں ہے

دل مرا یار کے کاکل میں رہے ہے اکثر
سچ ہے یہ چور کی بن آئی شبِ تار میں ہے

شاہی ملک جنوں ملتی ہے سایہ سے ترے
استخواں کس کا ہما یہ تری منقار میں ہے

جو دوستوں سے ملاقات ہم کبھو کرتے
مغائرت کی وہ کاہے کو گفتگو کرتے

الٰہی کیا ہوا جرّاح کو نہیں معلوم
جو رو یا چاکِ جگر کو مرے رفو کرتے

کبھو نہ ہم کو میسر ہوا یہ اے مہ رو
لپٹ کے باتیں جو شب کو ہم اور تو کرتے

سیاہ بختی نے پہنچایا زلف تک نہ ہمیں
کہ شرحِ حالِ دلِ خستہ مو بہ مو کرتے

کرے گا کوئی نمازی نہ ہم سری ہم سے
کہ آب زر سے ہیں دن رات ہم وضو کرتے

ظہور گوشۂ عزلت میں بیٹھ رہ اب تو
کہ لوگ پھرتے ہیں سب تیری جستجو کرتے

زخمی نگاہِ بتِ محجوب ہوں جرّاح
ٹانکا نہ مرے زخمِ جگر کا نظر آوے

اے جوشِ جنوں چاہئے یہ اکبرس میں
ثابت نہ کہیں دامنِ صحرا نظر آوے

اُٹھ جائے ظہور آنکھ سے غفلت کا جو پردہ
اس پردۂ ہستی ہی میں کیا کیا نظر آوے

نظر آئی جو مجکو خواب میں شکل اپنے قاتل کی
خوشی سے کیا کہوں اُس دم جو حالت تھی مرے دل کی

نہ جاتی جانِ شیریں کوہکن کی ایک تیشے سے
حقیقت میں نہ ہوتی اُسکو بیماری اگر سل کی

نہ پائی طاقتِ رفتار تب ناچار ہو آخر
نکل کر ہم نے گھر سے اپنے دروازہ پہ منزل کی

میں اک نازک بدن گلرو کا دیوانہ ہوں اے یارو
پنہاؤ پاؤں میں زنجیر میرے پھول سی ہلکی

ملایم ہو گئے ریشم سے وہ جس وقت ہم اینٹھے
حقیقت کھل گئی ہم پر تمہارے زلف کے بل کی

مٹی ہرگز نہ اُس مہ کی کدورت اک ذرا ہم سے
بہت آئینۂ خاطر پہ اُس کے گرچہ صیقل کی

ظہور اُس مہ کے توسن کی یہی حالت ہے کاوے میں
اشارہ کرنے سے پھرتی ہے تپلی جس طرح کل کی

ظریف

لالہ بینی پرشاد ظریف تخلص برادرِ خورد لالہ چنی لال حریف از عمر دوازدہ سالگی موزوں طبع افتاد و در ابتدا بزبانِ ریختہ چیزے کم کم موزوں می کرد حالا کہ طبیعتِ او وسعت و ترقی بسیار کردہ شعر بمتانت و فصاحت می گوید و مسدس و مخمسِ عاشقانہ و آب دار کہ بسلکِ نظم کشیدہ ناخن بدل می زنند و با وجودِ فرطِ میلانِ طبیعت بہ طرفِ ریختہ چند غزلِ فارسی

ہم کہ از خامۂ فکرش ریختہ درست بستہ بہ نظر در آمد عمرش تا الی الیوم بست و یک سالہ خواہد بود، ہرچہ گفتہ و می گوید بہ فقیر نمودہ و می نماید، از وست :-

غارت گرِ صبرِ من سرگرم فغانے ‏ شد عشوہ گری کم سخنے آفتِ جانے
نازک کمرے فتنہ گرے ہوش ربائے ‏ شمشاد قدے گلبدنے غنچہ دہانے
رنگیں چمنے سبز خطے تازہ بہارے ‏ گلبرگ ترے لالہ رخے سروِ روانے
خنجر مژۂ سخت دلے تند مزاجے ‏ عشاق کشے کینہ ورے گرم عنانے
خوش چشم بتے سیم تنے زہرہ فریبے ‏ جادو نگہے حور وشے برقِ جہانے
داریم ظریف از غم و اندوہِ فراقش ‏ ہر لحظہ بلب نعرۂ و آہے و فغانے

اے آنکہ نبود در جہاں مثلِ تو رعنائے دگر ‏ حاشا اگر جز دیدنت دارم تمنائے دگر
بہرِ خدا اے کج کلہ برحالِ زارم کن نظر ‏ کامشب بود افزوں تبہ حالم ز شبہائے دگر
بر حسنِ رویت مائلم از تیغِ نازت بسملم ‏ ہرگز نمی گردد دلم محوِ دل آرائے دگر
لطفے بحالم می کن و مپسند در رنج و عنا ‏ نبود کہ چشم افتد مرا بر ماہ سیمائے دگر
عیشی ظریفِ خستہ را بیخود نمود ایں مصرعہ ‏ بنگر کہ ملکِ بیخودی دارد تماشائے دگر

اے کہ در حسن و صفا رشکِ زلیخا گشتۂ ‏ باعثِ رسوائی ہر پیر و برنا گشتۂ
کشتگانِ تیغ خود را از دمِ جاں بخشِ خویش ‏ زندہ سازِ رسم و اعجازِ مسیحا گشتۂ
بر جمالِ خود تو اے غارت گرِ صبر و شکیب ‏ پردہ را وا کردۂ محوِ تماشا گشتۂ
چوں تو ہم رسوا گدائے نیست در عالم ظریف ‏ گردِ صد میخانہ بہرِ جامِ صہبا گشتۂ

اشعارِ ہندی

کس کی طاقت سدِّ رہ ہو وقتِ رفتن آپ کا ‏ آپ شعلہ اور رشکِ برق توسن آپ کا

سامنے ہر ایک کے بیجا ہے مجھ سے اختلاط ۔ کیا کہوں صاحب نہیں جاتا لڑکپن آپ کا
پاس سونے میں بھی حاصل مدعا ہوتا نہیں ۔ سیم تن ہو لیک ہے دل مثلِ آہن آپ کا
سرکشی ہے اُن کی صاحب کیوں کشیدہ جی میں ہے ۔ بندۂ آزاد ہے ہر سروِ گلشن آپ کا
کر کے ملنا ترک غم سے سخت کی حالت تباہ ۔ سوچئے جی میں ذرا کیا تھا یہ دشمن آپ کا
اب نہیں اُٹھنے کی طاقت لیک روزِ بعث و نشر ۔ ہاتھ اس رنجور کا ہے اور دامن آپ کا
کیوں نہ پھر پروانہ آسا ہو فدا جی سے ظریفؔ ۔ روئے نورانی ہے رشکِ شمعِ روشن آپ کا

نہ ہووے کس طرح دونی بہارِ سبزۂ صحرا ۔ کہ دھویا اشکِ مجنوں نے غبارِ سبزۂ صحرا
مقیمانِ چمن تم خوش رہو واں اپنی نظروں میں ۔ رگِ گل سے بھی نازک تر ہیں خارِ سبزۂ صحرا
ظریفؔ اِکدن خزاں دونوں کو آبرباد کر دے گی ۔ بھروسا گل کا ہے نے اعتبارِ سبزۂ صحرا

باغ سے گھر کو جو ہو تیری سواری تیار ۔ کیوں نہ گل ہو دیں ہے سینہ فگاری تیار
مہرِ رخشاں سے فلک تارِ شعاعی لے کر ۔ کر رہا ہے ترے دامن کی کناری تیار
جس طرف جائے تو گلشن سے ہے لے توسنِ ناز ۔ ساتھ چلنے کو ترے بادِ بہاری تیار
سیرِ دریا کو مرا گوہرِ تر آدے گا ۔ رکھیو تو آج حباب اپنی عماری تیار
نذر کو کس مہ شمشیر نگہ کی یارب ۔ چرخ نے کی ہے مہِ نو سے کٹاری تیار
کر تو اے زہرہ جبیں کوٹھے پہ آ اپنا بناؤ ۔ ماہِ تاباں ہے پئے آئینہ داری تیار

ترے واسطے اے بتِ رشکِ قمر کوئی آیا ہے اپنے وطن سے نکل
کبھی تو بھی تو اُس کے لئے صنما ذرا خانۂ رشکِ چمن سے نکل
جو ہے لطف وہاں سو نہیں ہے کہیں ترے دل کو تو اُسکا ہے خوب یقیں

جو اٹھائے گا اُسکے مزے کے تئیں وہ چمن کو نہ آوے گا بن سے نکل

ترے عشق میں لے بت ماہ لقا گئی مفت ہی ساری شگفت دل
رہا مورد رنج و الم ہی سدا ہوئی شاد کبھی نہ طبیعت دل
یہ فریفتہ چشم سیاہ کا ہے اسے عشق بتاں ہی کی چاہ کا ہے
یہ شہید تمھاری نگاہ کا ہے کبھی آئیے بہر زیارت دل
نہیں شاد کیا کسی دل کو کبھو نہ کیا سوے مہر و کرم کبھی رو
تو ہی ایسا ہے ظالم عربدہ جو تجھے بھاتی ہے دل سے اذیت دل
کوئی پھر سے بٹھا نہ پاس کبھو ہوئے جمع نہ اپنے حواس کبھو
گئی جی سے ہمارے نہ یاس کبھو مٹی دل سے ہمارے نہ حسرت دل
وہی ہجر کا دن وہی ہجر کی شب وہی درد و الم وہی رنج و تعب
وہی آہ فغاں وہی شور شغب غم و غصہ وہی، وہی حالت دل
ہے ظریف تجھ سے ہی چشم وفا کوئی اور بھی اُس کا ہے تیرے سوا
مری جان جو تو نہ سنے تو بھلا کہے جاکے وہ کس سے مصیبت دل

ذرا آپ کو آپ کے گھر میں اگر کبھی جاتے ہیں اور نہیں پاتے ہیں ہم
تو یہ ہوئے ہے حال ہمارا کہ پھر نہیں پہروں ہی آپ میں آتے ہیں ہم
نہیں لوگوں کو اس سے ہی بھاتے ہیں ہم کبھی نالوں سے آگ لگاتے ہیں ہم
کوئی کچھ کہے دم ہی بتاتے ہو تم کوئی کچھ کہے صاف سناتے ہیں ہم
مجھے غیروں کے آگے بہر وفا نہ پکارو کہ اس میں خلل ہی بڑا
نہ فریب میں غیروں کے آتے ہو تم نہ رقیب کی بات پہ جاتے ہیں ہم

لبِ یار کا ہم نے جو بوسہ لیا سو یہ شوق نے کام خراب کیا
ابھی لڑکے ہو تم تو سمجھتے ہو کیا یہ سمجھ کے یہ تم کو سجھاتے ہیں ہم
ترے ہجر میں اے بتِ رشکِ قمر یونہی جائیگا جی سے وہ اپنی گذر
وہ تھا فتنہ کہ سوتے سے چونک اٹھا یہ نہ سمجھے کہ کس کو جگاتے ہیں ہم

. . . .

اسے دیکھ کے رحم تو کر کہ نہ کر ترے آگے ظریف کو لاتے ہیں ہم

دمِ عرضِ حالِ دلِ حزیں وہ زباں پہ میری نہ آئیاں
ترے عشق میں بتِ سنگدل جو مصیبتیں ہیں اٹھائیاں
ذرا اپنے سینہ فگار سے کبھی ہنس کے بولیے پیارے
نہیں خوب عاشقِ زار سے مری جان اتنی کھائیاں
کوئی فکرِ موت و حیات میں ہیں لگا ہوں ایسی گھات میں
نہیں آتیں ہیں مرے ہاتھ میں تری پیاری پیاری کلائیاں
رخِ ماہ پر نہ نگاہ کی صنما ستاروں نے آہ کی
ترے روئے غیرتِ ماہ کی شبِ مہ میں دیکھ صفائیاں

اے جنوں نالہ و فریاد کروں یا نہ کروں
خانۂ عشق کو آباد کروں یا نہ کروں
جا پھنسوں دام میں یا دام سے بھاگوں اے دل
تو ہی کہہ خاطرِ صیاد کروں یا نہ کروں
حالتِ وصل کا اک شب جو سماں دیکھا تھا
کیوں شبِ ہجر اُسے یاد کروں یا نہ کروں

اُس کے حالِ زار پر ہر گل ہے خنداں باغ میں
لائے آبِ اشکِ بلبل کیوں نہ طوفاں باغ میں
روئے گل پر قطرۂ شبنم نہ ہے خجلت بنی
صبحدم آیا جو وہ رشکِ گلستاں باغ میں
ہو گلِ بے بو میں پیدا بو بہ تحریکِ صبا
گر پریشاں ہو تری زلفِ پریشاں باغ میں
کس طرح تجھ بن میں اں جاؤں کہ نظروں میں مری
ہے رگِ گل صورتِ خارِ مغیلاں باغ میں
کل ہے یومِ جمعہ فرصت ہے تجھے بھی میرے ساتھ
صبح کو اٹھ کر چل اے طفلِ دبستاں باغ میں

دیکھ شبنم نے کیا ہے طفلِ غنچہ کے لئے
صفحہ اوراقِ گل پر کیا ہی افشاں باغ میں

کھلے ہیں گل گھرا ہی ابر مے سے پر گلابی ہی
نہ کرائے گل حجاب اس دم کہ وقت بیحجابی ہی

جو تو ہی ثانیٔ لیلیٰ تو میں ہمتائے مجنوں ہوں
ترا چہرہ جو مہ ہے تو مرا رنگ آفتابی ہی

میں اک دن سوؤں گا ایسا جو پھر اٹھوں گا محشر کو
ہی اے بخت خوابیدہ جو تیری دیر خوابی ہی

ظریف اس سی ہمیشہ شعر تر سننے میں آتے ہیں
ترا دیوانہ بھی گویا کہ دیوانِ سحابی ہی

گو قید سے تھی ناخوش ہنگامِ گرفتاری
یاد آتے ہیں اب لیکن ایامِ گرفتاری

جو چوبِ قفس ہے وہ محراب عبادت ہی
جس دن سے میں لایا ہوں اسلامِ گرفتاری

آزاد رہوں کیونکر دیتے ہیں ظریف اب پھر
بیتابیٔ دل مجکو پیغامِ گرفتاری

ردیف (ع)

عاشق

شیخ مظفر علی عاشق تخلص برادرِ خورد منشی ظہور محمد ظہور۔ جوانیست مہذب الاخلاق از چندے بمقتضائے موزونیٔ طبع بطورِ خود موزون میکند و از آنجا کہ در بنارس کسے از استادانِ ایں فن نیست ہنوز در حلقۂ شاگردیٔ کسے نیامدہ کلامش شستہ و رفتہ می نماید عمرش بست و چہار سالہ خواہد بود از دست :-

کب تلک آنکھوں سے یا رب خوں فشانی کیجئے
وہ نہیں ہی پاس کیونکر زندگانی کیجئے

آتشِ ہجراں سی جس کی دل جگر سب جل گیا
اُس پہ ظاہر کس طرح سوزِ نہانی کیجئے

ہم نے گر چاہا تمھیں تو کون سی تقصیر کی — مہربانی کی عوض مت ظلم رانی کیجیے

لکھیے گر احوال خوں ہونے کا دل کے یار کو — کاغذ مکتوب زور و ار غوانی کیجیے

اِک بسنتی پوش کی الفت میں ہم جی سو گئے — چادرِ تربت ہماری زعفرانی کیجیے

دوستو گر ہو سکے تو حسبتاً للہ یوں — جا[1] کے اُس سے عرض اب میری زبانی کیجیے

جاں بلب ہے آپ کا عاشق غم فرقت سے آہ — چل کے اُس کے حال پر ٹک مہربانی کیجیے

درد نے فرقت کی یہ صورت بنائی ہے کہ آہ — بے کلی سے دم ہے آنکھوں میں ترے بیمار کا

گرچہ تیغ اصفہاں میں جوہر برش ہیں پر — سامنا کب کر سکے اُس ابروئے خمدار کا

آخر اک دن ہووے گا ہنگامہ محشر بپا — گر یہی انداز ہے اُس شوخ کی رفتار کا

دیکھ کر آ کر ہمارے سینۂ پر داغ کی — دیکھنا منظور ہے تجکو اگر گلزار کا

سن کے اے عاشق ہمارے دیدۂ گریاں کا شور — سر و ہنگامہ ہوا ہے ابرِ دریا بار کا

عاشق

خواجہ اعظم خاں عاشق تخلص از قدماست :-

کوئی بیدرد ظالم ہم کو اس دم یاد کرتا ہے — کلیجہ ہچکیاں لیتا ہے دل فریاد کرتا ہے

عاشق

سید ہدایت علی خاں عاشق تخلص از سابقین است۔

روتی ہیں ترے ہجر میں نت متصل آنکھیں — کس دکھ میں گرفتار ہوئیں تجھ سے مل آنکھیں

---

(۱) جا کے اس کے حال پر ٹک مہربانی کیجیے (ن)

بیمارِ عشق کو ترے ہرگز شفا نہیں
ہو جس کو یہ مرض کہیں اس کی دوا نہیں

عاشق

سعد اللہ خاں عاشقؔ از قدما ست شعرے از وہم رسیدہ :-

نہ من قامت آں صنم دیدہ ام
قیامت بیک حرف کم دیدہ ام

عاشق

سید غیاث الدین عاشق تخلص خلف سید قطب الدین رضوی ساکن رامپور عمرش پنجاہ سالہ خواہد بود ، از وست :-

جگر میں زخم نگہ کے لگے جو کاری رات
کٹی تڑپتے ہی بسمل کی طرح ساری رات

بہ رنگِ شمع سر اس نے قلم کیا سو بار
ہوئی نہ تسپہ بھی کم آہ اشکباری رات

گلی میں سنگ دلوں کے قدم نہ رکھیو دلا
وگرنہ ہجر کی گذرے گی تجھ پہ بھاری رات

ہوا جو عاشقؔ بیدل ترے فراق میں یار
تو اس کے بالیں پہ کی سب نے آہ و زاری رات

ہمارے ملنے سے تم نے قسم جو کھائی رات
یہ بے کلی رہی جو ٹک بھی کل نہ آئی رات

ہاتھ میں جام لئے یار نظر آتا ہے
آج کیا بیخود و سرشار نظر آتا ہے

سینے میں درد جدائی سے ترے اے پیارے
دل تڑپتا مجھے ہر بار نظر آتا ہے

یہاں تلک روئے ترے غم میں کہ دامن کا پاٹ
خون سے تختۂ گلزار نظر آتا ہے

رنگ ہو جائے ہے فق رشک سے ہر اک گل کا
باغ میں جب وہ طرحدار نظر آتا ہے

کیا رقیبوں نے کہیں جا کے کہا کچھ اس سے
آج ہم سے جو وہ بیزار نظر آتا ہے

یونہی گر آنکھوں سے سیلاب رہے گا جاری — ڈوبتا بس مجھے گھر بار نظر آتا ہے
مت لگا اُس سے تو زنہار دل اپنا عاشقؔ — سخت وہ شوخ دل آزار نظر آتا ہے

عاشق

آغا محمد عاشقؔ تخلص کہ در صفاہان بہ پیشۂ خیاطی بسر می برد خیلے خوش فکر گذشتہ مطلعے ازو در تذکرۂ فارسی نوشتہ ام - غزلے دریں روز ہا ہم بہم رسیدہ بنوکِ قلم دادم اینست:۔

یا رب آمد اے عاشق دین و دل مہیا کن — تن بعشوہ مرہون ساز جاں بہ بوسہ سودا کن
سیلِ گریہ اے عاشق شہری کند ویراں — وقتِ رشک ریزیہا رو بکوہ و صحرا کن
غنچۂ دہانِ یار آبِ زندگی دارد — گر حیاتِ جان خواہی بوسۂ تمنا کن
چوں بکاوی از مژگاں خانۂ دلِ ما را — جز خیالِ تو جاناں ہر چہ ہست یغما کن
اَینَمَا تُوَلُّوا را اگر تو خواندۂ زاہد ! — کعبہ را چہ در بستند سجدہ بر کلیسا کن
شوخِ عیسوی مذہب ماہِ ارمنی ملت — یا خود ت مسلماں شو یا مرا نصارا کن
با ذبیحِ خود جاناں جور و کیں مبر از حد — تازہ عاشق است آخر با دلش مدارا کن

عشاق

شاہ مظہر حق کہ عشاقؔ تخلص می کند با وصفِ درویشی سرے بجسنان[۱] دارد ازیں جہت بحلقۂ شاگردیٔ فقیر بے ترغیبِ غیرے در آمدہ آموختنِ شعرِ ہندی را انچہ می دانست زیادہ براں قصد کردہ قریب سہ چہار سال گذشتہ باشد کہ شعر گفتنِ ریختہ را بمرتبۂ غزلیت رسانیدہ از حسب و نسبش اطلاع نہ دارم مگر ایں قدر دانم کہ از ملازمانِ قدیم آصف الدولہ

---

(۱) سرے بحسن پرستی دارد (ن)

بہادر مرحوم برادرِ کلانش بود و ہست۔ مشارٌالیہ تغیرِ لباس کردہ عزلت اختیار نمودہ عمرش تخمیناً سی سالہ خواہد بود۔ از وست :-

شکوے کی زباں سے جو میں تقریر نکالی — ناداں نے مرے قتل پہ شمشیر نکالی
یوسف کے مرقع پہ جو حیراں ہوا مانی — تب میں نے بغل سے تری تصویر نکالی
آتا تھا کبھی خواب میں سو بھی ہوا موقوف — اُلٹی یہ مری آہ نے تاثیر نکالی
جب فصلِ گل آخر ہوئی کیا فائدہ صیاد — پھر پائے اسیراں سے جو زنجیر نکالی
قاتل نے مجھے جرمِ محبت پہ کیا قتل — عشاق نئی اُس نے یہ تعزیر نکالی

جان غم میں قدِ موزوں کے جو برباد نہ ہو — سبزہ تربت کا مری روکشِ شمشاد نہ ہو
ادبِ عشق سے تڑپا نہ میں خنجر کے تلے — تر لہو سے مرے تا دامنِ جلاد نہ ہو
دفترِ عشق میں اے بادشہِ کشورِ حسن — فردِ باطل ہے وہ جس پر کہ ترا صاد نہ ہو
بے ستوں مرتبہ میرا ابھی ذرا سمجھے رہ — بازوئے ضعف ہے یہ بازوئے فرہاد نہ ہو
صفحۂ دل پہ میں کھینچوں ہوں تری آپ شبیہ — روبروئے قلمِ صنعتِ بہزاد نہ ہو
میں کبھی منزلِ معنی کو نہ پہنچوں عشاق — رہنما میری اگر شفقتِ استاد نہ ہو

فیضِ مستی ہے سدا ساقیٔ کوثر سے مجھے — کام ہرگز نہیں کچھ بادۂ احمر سے مجھے
پیچ کاکل سے نہ نکلا تھا کہ پھر زلف نے ہائے — پابہ زنجیر کیا جعدِ معنبر سے مجھے
طالعِ بد نے دکھایا نہ کبھی وصل کا دن — چین اک شب نہ ملا گردشِ اختر سے مجھے
گر رہا وصل میں محروم گلا کیا اس کا — دیکھنا تھا یہ ستم اپنے مقدر سے مجھے
کھینچتا اس کا میں دامن تو شبِ وصل ٹلے — ناتوانی نے نہ اٹھنے دیا بستر سے مجھے
نیم جاں کرکے مجھے پھینک دیا خاک پہ ہائے — شکوہ قاتل کی ہے یہ ریشِ خنجر سے مجھے

رات دربان نہ اٹھا دیوے جو اُس در سے مجھ میں تو پہنچا ہی تھا واں بھیس بدل کر عشاق

عاشق

میرزا حجری عاشق تخلص برادر آغا تقی صاحب جوانِ موزوں طبع و خوش گفتار است غزلے کہ در اجماعِ مشاعرۂ مرزا تقی ہوس خوانده شده بود او ہم درآں فکر کرده بیشتر طبعش مائل مرثیہ وسلام است۔ تر وتش معروف۔ عمرش تخمیناً چہل سالہ خواہد بود، از وست:۔

نہ کھولو سنبلِ مشکیں کو روئے رشکِ گلشن پر شبِ دیجور کو ترجیح ہوگی روزِ روشن پر
ہے جب سے کسوتِ خاکستری آراستہ تن پر نہ منت کش ہوں دامن کا نہ بارِ جیب گردن پر
گلو لب تشنۂ آبِ دمِ شمشیرِ قاتل ہے ہے تسکینِ عطش موقوف اپنے آبِ آہن پر
ہیں کب معشوق سنتے عاشقوں کی نالہ و زاری نہ دیکھا گوشِ گل ہووے کبھی بلبل کے شیون پر
کہاں بھرتا ہے نظارے سے دل عاشق مزاجوں کا نہیں بلبل کو سیری گو بٹھا دیں گل کے خرمن پر

عشق

میر زین الدین عشق تخلص از وست:۔

منظور گر خرابیٔ دل ہے تو ایک بار ایسا خراب کر کہ نہ تعمیر کر سکیں

عیش

مرزا علی عیش تخلص

بات اب امتحان پر آئی قصہ کوتاہ جان پر آئی

عیاش

میر محمد یعقوب عیاش تخلص ولد میر محمد انور جوانِ مہذب الاخلاق و صلاحیت شعار است

خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ، بزرگانش متوطن شاہجہاں آباد و ہمیشہ نوکری خانۂ بادشاہ کردہ اند چوں از ابتدائے جوانی بحکم موزونی طبع شوقِ شعر گفتن در سر داشت و ملاقات اساتذہ و صحبتِ ایشاں غنیمت می شمرد چنانچہ اکثر بخدمت میر محمد تقی صاحب فائدۂ صحبت برداشتہ و شعرِ خود را در اوائل بمیر سوز مرحوم و در اواسط بمیر قمر الدین منت مغفور مبر در نمودہ و دریں ایام اواخر مشق بہ فقیر رجوع مشورہ آوردہ است۔ غزل درست بستہ می گوید در کلامش چنداں جائے اصلاح یافتہ نمی شود، مگر گاہے کم کم عمرش از چہل متجاوز خواہد بود، ازوست۔

اللہ ری تیرہ بختی کہ مرنے کے بعد یار — سوسن کے پھول قبر پہ میری چڑھا گیا
قدرت خدا کی دیکھو مرے دل کے زخم کو — چھڑکے تھا جو نمک وہی مرہم لگا گیا
تھا شہرہ بدگمانی کا عیاش جس کی کل — دو چار گالیاں وہ مجھے بھی سنا گیا

دل بھر آئے ہے جوں جوں اسے خالی کیجے — فکر اس درد کی کیا اے مرے والی کیجے
ایک پرواز بھی گلشن میں نہ کرنے پائے — کیا ترے ہاتھ سے اے بے پروبالی کیجے
ہوں سیہ بختِ ازل میں تو عزیزاں میرے — بعد مرنے کے تک اک قبر بھی کالی کیجے
عشق دیکھو تو ٹپکتا ہے لہو بلبل کا — گر قلم باغ میں گل کی کوئی ڈالی کیجے
آئے مدفن پہ تو اس شوخ کے نظارے کو — کھود کر پلکوں سے اک قبر میں جالی کیجے
گولی بھر کر وہ طپنچہ میں کہے ہے اس کو — دل میں آتا ہے کہ عیاش پہ خالی کیجے

سایہ کرے گرما میں کسی خاک نشیں پر — وہ نخل کہاں ہے ترے کوچے کی زمیں پر
گھوڑے پہ چڑھا وہ تو ہر اک کو نظر آیا — بتخانۂ چیں کا سا سماں خانۂ زیں پر
سجدہ کروں ہر بت کو میں اے کاتبِ قدرت — لکھا یہی تھا تو نے مگر میرے جبیں پر
وہ سوختہ دل ہوں کہ مری آہ کی بجلی — گرتی ہے سدا کنگرۂ عرش بریں پر

پڑھتا ہوں دل اپنے کا جہاں مرثیہ عیاشؔ   روتی ہے سب ہی خلق مری موتِ حزیں پر

نہ کہئے دردِ دل ہرگز کسی سے   اگر کہئے تو کہئے اپنے جی سے
کٹے گی کیونکہ ساری رات اُس بن   کرے ہے دل تو بیتابی ابھی سے
جدائی میں جیوں کبتک میں عیاشؔ   بھلی ہے موت ایسی زندگی سے

عیشی

میاں طالب علی عیشیؔ تخلص خلف الرشید میاں علی بخش از متوسلانِ الماس علی خاں مرحوم کہ کشتِ امیدِ عالمے را از اقطارِ امطارِ سحابِ مکرمت و فیضِ خویش سرسبز و شاداب می داشت جوانِ صلاحیت شعار است شعرِ فارسی و ہندی را بمتانت و رزانتِ تمام میگوید و در نثر نویسی ہم بطورِ منشیانِ سابق دستے تمام دارد بہ فقیر از ابتدائے ملاقات تا الی الآن نیک وضع اتحاد بودہ آمدہ خوشہ چینی از فیضِ صحبتِ انشاء اللہ خاں و مرزا قتیل وغیرہ ہمہ کردہ اقرار بشاگردی یک کس نمی کند بالفعل خود استادِ وقتِ خود است عمرش تخمیناً از سی متجاوز خواہد بود از وست:-

خود ببادِ نیستی دادم غبارِ خویش را   ہمتِ من بر فلک نگذاشت کارِ خویش را
بسکہ از دل نالہائے آتش افشاں می کنم   صبحِ محشر کردہ ام شبہائے تارِ خویش را
جلوۂ صبح از افق جوشِ بہارِ عنبر است   دادہ بر بادہ زلفِ مشکبارِ خویش را
چرخِ گرداں جلوہ گاہے گردبادِ فتنہ است   تا کجا یارب برم مشتِ غبارِ خویش را
آرزوئے بوسہ ہا بر خویش می بالد ز شوق   تا تو برافروختی از مئے عذارِ خویش را
از رگِ تارِ نفس نتواں تنم را فرق کرد   بسکہ کردم وقفِ کاہش جسمِ زارِ خویش را
عیشیا چوں نیکِ خود نتوانی از بد فرق کرد   در کفش بسپر عنانِ اختیارِ خویش را

دل تہ خاکِ سرِ طرۂ جاناں دارد — سبزۂ تربتِ من خوابِ پریشاں دارد

مائلِ گشتِ چمن مردمِ چشمم نہ شود — گر خیالِ رُخِ او گل بہ گریباں دارد

وقفِ تاراجِ نگہ جلوۂ رنگین کہ شد — کہ تماشاگلِ خورشید بداماں دارد

رُخ ز آشفتنِ زلف..... بے خبر است — صبحِ عشرت چہ غمِ شامِ غریباں دارد

اندراں بزم کہ از شوخیِ او حرف زنند — شمع نورِ نگہِ چشمِ غزالاں دارد

پائے شوقم گردِ حلقۂ گرداب مباد — کشتیم چشمِ طلب بر رہِ طوفاں دارد

عیشِ کامل نہ شود روزیِ کس زیرِ فلک — حسرتِ آب برو دہر اگر ناں دارد

سرسری از سرِ ما خاک نشیناں مگذر — شبنمِ ما بہ بغل ترکِ گلستاں دارد

بس کہ در عہدِ خمِ زلفِ تو سودا عام است — عقلِ کل جامہ سیہ خانۂ زنداں دارد

نے ہمیں ناز و ادا حلقہ بگوشِ ابروست — فتنہ ہم چشم بآں جنبشِ مژگاں دارد

خالِ مشکینِ تو در بندِ کمندِ گیسوست — نظرِ چشمِ سیاہِ تو بمژگاں دارد

بلبلِ ما بہ قفس بال و پرش بشکستند — کے سرِ و برگِ تماشائے گلستاں دارد

نصیبِ من بجز اندوہِ جاودانی نیست — بکشورِ یکہ منم رسمِ شادمانی نیست

حبابِ بحرِ فنائیست عقدۂ کارم — رہینِ ناخنِ تائیدِ آسمانی نیست

تلخ کامی مردن کہ در دمِ تیغت — حلاوتیست کہ در آبِ زندگانی نیست

کدام چشم براہِ نظارہ ات باز است — کہ برقِ حاصلِ او شورِ لن ترانی نیست

پائے جنوں زدامنِ صحرا گذشتہ است — سیلابِ جوشِ گریہ ز دریا گذشتہ است

ہر نقشِ پا نمودۂ خورشیدِ محشر است — یارب کہ گرم صید ز صحرا گذشتہ است

تا ریخت چشمِ ساقیِ ما رنگِ وحشتے — مستی ز نشہ نشہ ز صہبا گذشتہ است

دریا گریست حسرتِ حرماں بخوں طپید — در خاطر یکہ حرفِ تمنا گذشتہ است
می گرد آب رحم بہ چشمِ طبیب من — دردا کہ وردِ دل ز مداوا گذشتہ است
خود باش محوِ جلوۂ عالم فریب خویش — کار ز تماشا گذشتہ است
ناصح ز عقل و صبر و شکیبائیم مگوے — بگذر ز من کہ کارم ازیں ہا گذشتہ است
عیشیؔ کہ در دلت زدہ خنجر کہ نالہ ات — چوں برقِ خاطف از دلِ خارا گذشتہ است

سوختن گرمیِ ہنگامۂ آوازِ من است — رقصِ بسمل اثر از مزمۂ سازِ من است

خورشید رُخ از پردۂ نیرنگ بر آورد — ہر ذرہ برنگِ دگرے رنگ بر آورد
روشن دیم در گردِ جلوۂ او بود — عکسِ رخش آئینہ ام از زنگ بر آورد
راز دلِ من مایۂ آشوبِ جہاں است — آساں نتواں آتشم از سنگ بر آورد
آں نغمہ کہ در پردۂ قانونِ ازل بود — مطرب بچہ بے پردہ اش از چنگ بر آورد
شوق است کہ آذر شد و صدبت بتراشید — عشق است کہ مانی شد و ارژنگ بر آورد
اغیارم اگر سینہ بہ خنجر بشگافند — رازش نتوانم ز دلِ تنگ بر آورد
تا برقِ اثر زد بہ چمن نالۂ عیشیؔ — شور از دلِ مرغانِ خوش آہنگ بر آورد

تلخ کامانِ وفا درد بدرماں نہ دہند — کاسۂ زہر بسر چشمۂ حیواں نہ دہند
ابر می بارد و گل تازہ بہارے دارد — آہ امروز اگر رہ بہ گلستاں نہ دہند
نوح در بحرِ محبت نہ رساند بہ کنار — کشتیؔ را کہ عناں در کفِ طوفاں نہ دہند
عیشیؔ از یار بناکامیِ دل خورسندم — کاش جز من بہ کسے حسرتِ حرماں نہ دہند

جهان بر خوبیت ای لعبت طناز می نازد — ز حسنت حسن می بالد ز نازت ناز می نازد
تو آن نقشی که تا بر لوحهٔ ایجاد بستندت — بکلک صنعت خود دست صورت ساز می نازد
کدامی صید در خون می طپد یا رب نمی دانم — که بر گیرائی خود پنجهٔ شهباز می نازد

داغهای تن زارم بنگر — بی تو گل کرد بهارم بنگر
سرمه کش روز سیاهم را بین — زلف بکشا شب تارم بنگر
وعده را جان جهان طول مده — دل بی صبر و قرارم بنگر
رحم ای بادیه پیمای شوق — قدم آبله دارم بنگر
همه شب بی تو نفس می شمرم — شب چون روز شمارم بنگر

مرا آتش زدی در جان چه کردی — بدشمن ساختی جانان چه کردی
وقار خانمان برباد دادی — چه کردی خانه آبادان چه کردی
نمودی خاطر جمعی پریشان — شمیم زلف مشک افشان چه کردی
دل بی طاقتم را بردی از جا — نوای مرغ خوش الحان چه کردی
سخن از زلف و خط راندی بگلشن — صبا با سنبل و ریحان چه کردی
سپردی دل به آن بیباک عشقی — چه کردی آه ای نادان چه کردی

همه افسانه ام از گوش شنیدن داری — همه آئینه ام از دیدهٔ دیدن داری
در خور ظرف نگاهت نبود جلوهٔ دوست — چشم بر بند اگر حسرت دیدن داری
تهمت آلودهٔ تلخی مکن از حرف ترش — لب شیرین که سزاوار گزیدن داری
کوکب سوخته داری به شب تیره بساز — چشم بیچاره صبح دمیدن داری

ہمت از دستِ جنوں خواہ کہ در فصلِ بہار
جامہ در بر چو گل از بہرِ دریدن داری

در فضائے کہ زمیں دام و سپہرش قفس است
وائے بر جانت اگر میلِ پریدن داری

اے خوش آندم کہ زنی تکیہ بدوشم از ناز
بر سرم منتِ خمیازہ کشیدن داری

ذوقِ پروازِ سرِ سدرہ چہ دانی عرشیؔ
تو کہ در کنجِ قفس مشقِ طپیدن داری

جفا پیشہ بے مہر جور آفریں
سرت گردم از بہرِ من ایں چنینی

ستمگار نا آشنا بیوفائی
بلائے شکیب آفتِ صبر و دینی

نہ دیدم کسے را بدیں دلفریبی
بگردِ تو گردم مگر حور عینی

ز گل دلرباتر ز مہ جاں فزاتر
عجب دل فریبی عجب نازنینی

نہ زیبد سخن ہائے تلخِ دہانت
تو اے جانِ عرشیؔ بلب انگبینی

بے نورِ رخت بسکہ سیہ شد سحرِ ما
خور چو کرۂ دود بود در نظرِ ما

ہر قطرۂ خوں در رگِ ما آبحیات است
پیکانِ خدنگِ کہ گذشت از جگرِ ما

دادم بہ برق کشتِ تمنائے خویش را
یک سو نمودہ ام غمِ فردائے خویش را

یک گام طے نہ کرد ز صحرائے وحشتم
تا زانو از چہ سود فلک پائے خویش را

نالۂ درد و غم ترانۂ ما
قصۂ سوزِ دل فسانۂ ما

چوں گہر از متاعِ دنیا نیست
بارِ ما غیر آب و دانۂ ما

بے سر و برگِ کشورِ عشقیم
بے متاعی متاعِ خانۂ ما

نہ کشیدیم منتِ برقے
رنگِ گل سوخت آشیانۂ ما

دلم چہ قبلہ نما فارغ از طپیدن نیست　　بعالمے کہ منم بخت آرمیدن نیست
برنگِ آئینہ سرتا بپائے من چشم است　　ولے ز حیرتِ حسنش مجالِ دیدن نیست
ادب نگاہِ مرا دوخت بر قدم ورنہ　　کدام جلوۂ رنگیں کہ وقفِ دیدن نیست
زمینِ مزرعِ ما برق زارِ حرماں است　　نصیبِ سبزۂ امید ما دمیدن نیست
تو خود ز لذتِ درد آشنائۂ ورنہ　　کدام خار کہ آمادۂ خلیدن نیست
بریدہ باد زبانِ تو سوختم عیشیؔ　　فسانۂ تو باندازۂ شنیدن نیست

سرمایۂ پابندئ من خلق تمام است　　مذ نگہ لطفِ مرا رشتۂ دام است
از ہمتِ عالی تر ود تیرہ گئ بخت　　روشن نہ شود خانہ ز شمعے کہ ببام است
از بسکہ سیہ کرد غمِ ہجرِ تو روزم　　نورِ سحرم سرمہ کشِ دیدۂ شام است
از بادہ نگوئید کہ در مشربِ عشاق　　گر آب حیات است کہ بے یار حرام است
از دردِ فراقِ تو نہ نالم کہ خیالت　　سرمایۂ عیش و سببِ وصلِ دوام است
باز آئی کہ بے روئے دل افروزِ تو مارا　　آتش بہ جگر می زند آبے کہ بجام است
عیشیؔ ز نظیری دل ما نالہ بیاموخت　　امروز بما منزلتِ عشق تمام است

بہارِ صد چمن دارد ہوائے بزمِ رنگینش　　چکد آبِ گل افشارند گر گلہائے قالینش
فلک صد خار اگر بشکست در چشمم چہ غم دارد　　گراں خوابی کہ باشد از رگِ گل تار بالینش
امیدِ زندگی نبود مریضِ دردِ دوری را　　اگر صد مردہ را عیشیؔ دہد جاں بہر تسکینش

اشعار ہندی

کون پابند جنوں فصلِ بہاراں میں نہ تھا　　اس برس تنگ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا
بس کہ ہیں درد کا جویا ہوں مرے تلووں کا　　آبلہ کب طلبِ خارِ مغیلاں میں نہ تھا

چشم پوشی ہی عبث مجھ سے کہ مانند سرشک | دیکھنا مجکو کہ اک جنبش مژگاں میں نہ تھا
تہمت جیب عبث مثل سحر ہے مجھ پر | نام کو تار کبھی میرے گریباں میں نہ تھا
لے چلے ہم کف پا آبلہ وار آخر کار | خار بھی اپنے نصیبوں کا بیاباں میں نہ تھا

دل گرفتہ ہوں کروں گا ہو کے میں آزاد کیا | مجکو یکساں ہے چمن کیا خانہ کیا صیاد کیا
زخم کاری جسم پر کشتوں کے جانِ تازہ ہی | آب حیواں میں بجھا تھا خنجر فولاد کیا
نقش حیرت ہوں مرا مشق خموشی کام ہے | بلبل تصویر جانے نالۂ و فریاد کیا

دشمن و دوست سے الفت ہی زبس کام اپنا | محتسب تھامے جو ساقی سے گرے جام اپنا
بس کہ گمنام کیا ہم کو سیہ بختی نے | گر کریں مہر، یقیں ہے نہ کھلے نام اپنا
شعلہ رویوں کا رہا بس کہ تصور ہم کو | جل گیا سینے میں خونِ دل ناکام اپنا
نگہ چشم تصور ہے مرا شوق درست | لاکھ پردوں میں ہو دلبر تو کروں کام اپنا
دیکھ کر عیشیؔ آوارہ کی سرگردانی | بھول جاوے یہ چلن گردش ایام اپنا

وفورِ کاہشِ غم سے مرا یہ حال ہوا | کہ چشم مور میں میں پیکرِ خیال ہوا
ہوئی ہدایتِ وحشت سی میری منزل طی | چراغِ راہ مرا دیدۂ غزال ہوا
بنا نہ کاسۂ دریوزہ نے سبوئے شراب | ہزار بار میں خاکِ درِ کلال ہوا
دوا پذیر نہ ہو درد طبع نازک کا | نصیب زخم کو گل کے کب اندمال ہوا
میں وہ شہیدِ وفا ہوں کہ خوں مرا عیشیؔ | برنگِ خونِ حنا بے دیت حلال ہوا

بے بقا ہیں کہ بہارِ چمنستاں سمجھا | زلفِ سنبل کو میں اک خوابِ پریشاں سمجھا

آبِ آئینہ یہاں طینت دل کا ہے خمیر میں صفا پیشہ بد و نیک کو یکساں سمجھا
ہوں وہ دیوانۂ وحشی کہ مرا جوشِ جنوں آسماں کو بھی سیہ خانۂ زنداں سمجھا

حالِ دل مجھ سخت جاں کا ہر نفس بدتر ہوا آخرش احباب کے سینے کا میں پتھر ہوا
وحشت پیمائی مری عہدِ جنوں میں دیکھئے موئے سر سے ہر سر خار قدم ہمسر ہوا
غیر نے صندل لگایا واں جبینِ یار میں رشک سے بیساختہ پیدا یہ دردِ سر ہوا

کس آگ سے مرا دلِ اندوہ گیں جلا جو شمع ساں ہیں تا نفسِ واپسیں جلا
ہے آگ میرے دل میں نہاں داغِ عشق کی گر اُف کروں تو دوں ابھی چرخِ بریں جلا

پھر کیا چشم نے شوقِ لبِ جاناں پیدا پھر ہوئے اشک کی جا لعلِ بدخشاں پیدا
بیڑیاں کاٹنے کی میری خبر ہے یارب ہو وے حداد کا زنہار نہ سوہاں پیدا
کشتۂ حسن ملیحاں ہوں مرے سینے کو چیریں تو دل کی جگہ ہووے نمکداں پیدا
تب ملے آبلہ پائی کا مزا جب ہووے ساتھ ہر آبلہ کے خارِ مغیلاں پیدا

تنہا میں اس جہان کی منزل میں رہ گیا اور داغِ ہمرہانِ سفر دل میں رہ گیا
دعوائے خوں میں اُس سے کرونگا بروزِ حشر گر کچھ بھی رنگ دامنِ قاتل میں رہ گیا

داغِ حسرت نے تماشائے چمن دکھلایا رنجِ فرقت نے ہمیں لطفِ وطن دکھلایا
سرو کی بے ثمری کا جو ہیں لکھا مضموں ایک خوش قد نے مجھے سیبِ ذقن دکھلایا

سیرِ گلشن گر دلِ پرجوشِ وحشت مانگتا
پہلے میں درد آشنا بلبل سے رخصت مانگتا

خوں یہ رویا ہوں کہ ہے ہر شاخِ مرجاں سے مرا
پنجۂ مژگانِ خون آلود بیعت مانگتا

جستجو لائی ہے اُس صحرا میں مجکو تشنہ کام
غول سے ہے خضر جس وادی میں شربت مانگتا

رنج کا مجکو مزا تھا گر کھلی ہوتی زباں
نزع میں جامِ ہلاہل جائے شربت مانگتا

توڑتا صیادِ قدرت پر مرے گر میں اسیر
تا بدیوارِ قفس اڑنے کی طاقت مانگتا

ہوا رشکِ رگِ گل آستیں کا تار تار آخر
دکھائی دیدۂ خونبار نے میری بہار آخر

یہ قسمت دیکھئے صیاد جب آزاد کرنے کو
لگا پر کھولنے میرے ہوئی فصلِ بہار آخر

کیا ہوئی بہرِ سفر تن سے مری جاں تیار
ہم نشیں کرتے ہیں جو اور ہی ساماں تیار

دیکھئے جرمِ محبت کسے مقتل میں لائے
پھر وہ کرتا ہے دمِ خنجرِ براں تیار

کیا گناہ آبلہ پایانِ جنوں کا کہ ہوا
پے کاوش سرِ ہر خارِ مغیلاں تیار

پاسِ جاناں ہے فقط مانعِ گریہ ورنہ
اپنی ہر چشم میں ہے نوح کا طوفاں تیار

میں غزل خواں سوئے گلزار جو گذرا عشی
زہر کھانیکو ہوئے مرغِ خوش الحاں تیار

ہیں زلفِ تابدار کے زندانیوں میں ہم
رہتے ہیں اُلجھے سخت پریشانیوں میں ہم

نے سر بزیرِ تیغ ہلایا نہ دست و پا
تھے کتنے باادب تری قربانیوں میں ہم

خوں اُس کے ہاتھ میں دمِ تکبیر بھر گیا
محشر تلک رہیں گے پریشانیوں میں ہم

میں بہلاتا تھا اگلی وحشتوں میں دل گلستاں میں
ہوا اب کی ٹھہرنا ایک دم مشکل گلستاں میں

نسیمِ صبح ٹھنڈی سانس بھرتی جو نہی آنکلی
لگا یک بار غنچوں کا دھڑکنے دل گلستاں میں

رات نہاتا تھا وہ لعبتِ سنگ آب میں　　کش مکش ہو جسے ماہ تھا سنگ آب میں
طینتِ بد کو نہیں مرشدِ کامل سے سود　　چل نہ سکے خضر سے کشتیٔ سنگ آب میں

بہکا کدھر کدھر کو پھرا میں کہاں کہاں　　افسوس مجکو چھوڑ گیا کارواں کہاں
جو تنگ دل ہیں فیض کا اُن میں اثر کہاں　　پایا گدا نے غنچہ کی مٹھی سے زر کہاں

یہ بھی رونا ہے کہ جس میں سرِ مژگاں تر ہو　　شکلِ گل خوں سے نہ جبتک کہ گریباں تر ہو

عاصی

حافظ قاسم علی متوطن قصبہ ردولی ولایتِ شاہ احمد عبد الحق عاصی تخلص جوانِ غریب و نابینا است بمقتضائے موزونیٔ طبع چیزے شکستہ بستہ موزوں می کند دو سہ غزل ریختہ خود را بہ نظرِ فقیر گذرانیدہ اگرچہ زبانش درست است اما از محاورۂ ریختہ بلد نیست حسبِ اتفاق قلیلے از کلامِ او ہم بہ تحریر آمد عمرش از سی متجاوز خواہد بود، از وست :-

شب پاس جو ہم اُس مہ تاباں کے سوئے　　بولا کہ پھرے سر کو کہاں آن کے سوئے
وہ رشکِ پری خواب میں شاید نظر آوے　　کل رات کو ہم جی میں یہی ٹھان کے سوئے
پہلے تو عجب طرح سے بگڑے کہ نہ پوچھو　　جو میں نے کہا پھر تو اُسے مان کے سوئے

ہر چند کہ ہر شوخ کا اک ناز جدا ہے　　پر نامِ خدا آپ کا انداز جدا ہے

شاید کوئی بے درد مجھے یاد کرے ہے　　جو مثلِ جرس دل مرا فریاد کرے ہے

خواب میں بھی نہ اگر صورتِ یار آئی نظر | دلِ بیتاب کو کب شکل قرار آئے نظر
خواہشِ سیرِ چمن کب اُسے ہووے جس کو | آپ سینے ہی میں داغونکی بہار آئے نظر
چین پڑتا ہی نہیں اُس کے بغیر اے عاصی | کاش یک بار تصور ہی میں یار آئے نظر

تو ہی نہ اگر پاس مرے آن رہے گا | کس طرح سے پھر جان مرا جان رہے گا
واقف وہ ابھی گرچہ نہیں نام سے میرے | پھر دل کو تسلی ہے کہ پہچان رہے گا

عدل

شیخ فضلِ رحمٰن عدل تخلص ساکن بداؤں جوانِ غریب و طالب علم بود کلامِ خود را بنظرِ حقیری گذرانید در روز ہائیکہ فقیر بر مکانِ میاں غلام اشرف مشاعرہ می نمود و غزلِ طرح می کرد شریکِ مجلس می شد از مدتے مفقود الاحوال است شعرے ازو در غزلِ طرح بیاد ماندہ اینست :-

دل میں آتا ہے کہ اب محتسب و قاضی کو | جمعہ کے روز لڑا دیجئے پالی کیجے

عاجز

عارف علی خاں عاجز تخلص

بھلا جی بے وفائی یاد رکھیو | یہی ہے آشنائی یاد رکھیو

عزیز

رائے بھکاری داس عزیز تخلص

کرے نہ یار اگر صاف دل کو کینے سے | عزیز موت بھلی پھر تو ایسے جینے سے

عسکر

عسکر علی خاں عسکر تخلص

روتے روتے نہ رہا نام کو نم چشموں میں — آبرو کیونکہ رہے گی مری ہم چشموں میں

عارف

میر عارف علی عارف تخلص متوطنِ قصبۂ امروہہ جوانِ غریب وضع و مسکین مزاج دیدمش معرفتِ بینی پر شاد ظریف بحلقۂ شاگردیٔ فقیر در آمدہ عرایسِ افکارِ خود را بزیورِ اصلاح محلے ساخت و در عرصۂ قلیل ہم سلکِ تلامذۂ عالی طبیعتِ ایں خاکسار گردید و ذوالفقار زبان را بجوہرِ نظمِ ہندی و فارسی ببار است عمرش تخمیناً سی و پنج سالہ خواہد بود، اینست:-

ناوکِ نازِ تو تا بر جگرِ من بہ نشست — شد جگر روزن و دل در پسِ روزن بنشست

نعرہ زد بلبل و در ماتمِ گلشن بنشست

شد رواں فوجِ قضا و قدر او را در پیش — آں جفاکیش و فاکُش چو بتوسن بہ نشست

سوخت صد طور ز آہِ دلِ سودائے او — تا طلبگارِ تو در وادیٔ ایمن بہ نشست

خاست چوں از کمرِ کوہ غبارِ فرہاد — ہیچ گہہ جائے بنودش سر از من بہ نشست

منہزم در صفِ مژگاں چو شدم در چشم — سرِ نوکِ مژۂ چوں سرِ سوزن بہ نشست

رتبہ ام . . کہ پس از من مجنوں — ماتمی گرشت مرا بر سرِ مدفن بہ نشست

چوں نگہ دارد از و آہوئے دل را عاشق — شیر گیری بہ نگس برزدہ دامن بہ نشست

بہ یکے ضربتِ خود کرد سکا ہن او را — تیرِ بیدادِ تو در دلِ آہن بہ نشست

نازِ او بیں کہ چو مالید مسی بر لبِ خویش — رفتہ در باغ و بہ پیشِ گلِ سوسن بہ نشست

کرد دلِ شوریدۂ من در شبِ ہجر — آنقدر شور کہ ہمسایہ بہ شیون بہ نشست

آنکہ یک غمزہ بہ کفِ تیغِ ستم رانی داشت
دیدۂ بسمل او صورتِ حیرانی داشت

از نگاہِ غضبت منتظرِ زخمِ دگر
شد سبک دوش کہ او بارِ گرانجانی داشت

عاقبت دشمنِ جانی شدہ خوش الحانی
بلبلے راکہ بہ گلزار غزل خوانی داشت

دوش در سینہ نیاسود دلِ حیرانم
بہ خیالِ سرِ زلفِ کہ پریشانی داشت

شمع شاں شب چو بر دگریۂ من شد ظاہر
بارقیباں تہِ لب خندۂ پنہانی داشت

بتہہ سبزِ خطش دردِ دلم گشت ہماں
زیر لب خالِ سیاہی کہ نگہبانی داشت

دلِ دیوانہ بہ ملبوسِ شہاں میں نہ کرد
بسکہ چسپاں بہ بغل جامۂ عریانی داشت

پاچو در بادیۂ عشق نہادم پیشم
خارِ صحرا ہمہ نشترپئے مہمانی داشت

عسکر امروز بکوبت چو گدا افتاد است
گرچہ دے بر سرِ خود افسرِ سلطانی داشت

کدامی کشتۂ شمشیرِ ابروئے تو می آید
کہ بانگِ شورِ محشر از سرِ کوئے تو می آید

بہ افغاں دست بر دل از درت محروم میگردد
دل اُفگارے بامیدے اگر سوئے تو می آید

بہ گلشن باکہ پیوندم کرا گویم کجا جویم
نسیمے را نمی یابم کز و بوئے تو می آید

فتد بر چشم و ابروئے تو موئے عنبرینِ تو
کمند از آسماں بر شاخِ آہوئے تو می آید

اشعارِ ہندی

گلِ رخسار سے پھولا ہی چمن آئینہ میں
عکس نے اس کے کیا جیب بے وطن آئینہ میں

ابرِ سادہ میں نظر آئے ہی بجلی کی سی کوند
یہ تری موجِ تبسم کی شکن آئینہ میں

آج پھنستی ہے جو ہو گردنِ اسکندرِ واں
عکس نے زلف کے ڈالی ہی رسن آئینہ میں

ہو جو تیرے خط و عارض کے مقابل طوطی
عکس سے اپنے کرے پھر نہ سخن آئینہ میں

رہ گیا آئینہ جوں دیدۂ عاشق حیراں
ہنس پڑا دیکھ جو وہ غنچہ دہن آئینہ میں

شرم یہاں تک ہی جو ہر لحظہ چُراتا ہے نظر
اپنے ہی عکس سے وہ سیم بدن آئینہ میں.

چپکے چپکے میں کھڑا ہوتا ہوں پیچھے جا کر
دیکھے شاید وہ مرے زخم بدن آئینہ میں

عکس آتا ہے نظر سبزۂ جوہر سیراب
منعکس ہووے ہی جب جلوہ ذقن آئینہ میں

عالم

شاہ عالم خاں عالم تخلص خلف الرشید نواب محبت خاں کہ ذکر ایشاں در تذکرہ ہندی گذشت، جوان نورسیدہ قریب بہ فضیلت است بمقتضاے موزونی طبع کہ موروثی است رخش طبیعت را بمیدانِ فکرِ اشعارِ فارسی گاہ گاہے جولاں می دہد از براقیِ دہنش معلوم شود کہ رفتہ رفتہ بجائے خواہد رسید، عمرش نوزدہ سالہ خواہد بود مشورۂ سخنش بہ پدرِ بزرگوارِ خود است، از وست :-

نیست خود کامی کہ کامِ خود بہ تیغِ کیں دہد
آتشِ مارا آبِ تیغِ کیں تسکیں دہد

جاں بناکامی سپردم تا بود خود کامِ من
از لبِ جاں پرورش کامِ منِ مسکیں دہد

گر دہم جاں از غمِ جانانِ خود عیبم مکن
جانِ شیریں کوہکن از حسرتِ شیریں دہد

عالما آسودہ از دنیا و مافیہا شدیم
طالبِ دیدارِ او کے دل بآن و ایں دہد

نہاد لالہ عذارے بہ سینہ داغ مرا
ز لالہ زارِ جہاں زیں بود فراغ مرا

نہ سوخت تا شبِ غم خانہ ام ز آتشِ آہ
ز شمع روئے تو روشن نہ شد چراغ مرا

نہ شویم از دو نفسے جدا بر ہش اگر سرِ ما رود
سرِ ما و خاکِ درش کسے زجفائے او بہ کجا رود

کشم آہ اگر منِ ناتواں نہ منِ لقدرِ جفائے تو
نہ بود عجب کہ بیک نفس دو جہاں بباد فنا رود

نہ رود بآں سرِ کوئے کس کہ بود عنانِ دلش بکف
برضائے خود مبری گماں کہ کسی بکوے بلا رود

بجفائے کوئے تو کے روم کہ دم از وفائے تو میزنم
بمرادِ دل نہ رسد کسے کہ ز کوئے تو بجفا رود

در خواب دیده ام رخِ آں آفتاب را | دانستہ ام عبادتِ سہ روزہ خواب را
گفتم زجاں غلامِ توام گفت عالما | ما بہ نگریم بندۂ حاضر جواب را

عشرت

میر غلام علی عشرت تخلص ساکنِ صوبۂ بریلی[1] جوانِ کثیر الکلام است دیوان ہا و ثنوی ہائے متعددہ دارد عمرش تخمیناً قریب چہل سالہ خواہد بود ازدیہم رسیدہ اینست:-

تمہارے زعم میں خادم جو ہم یہیں کے نہیں | تو سمجھو بندۂ درگاہ پھر کہیں کے نہیں
کئے ہیں سجدے ترے در پہ یہاں تلک ہم نے | کہ داغ مٹتے قیامت تلک جبیں کے نہیں

عاصم

عاصم تخلص جوانے کہ از فیض آباد آمدہ و یک غزلِ خود بمن دادہ شعرے[2] ازو انتخاب افتادہ :-

عاشق ہوئے ہیں جب سے ہم اُس گلعذار کے | لاکھوں ہی زخم کھائے ہر اک نوکِ خار کے

عظمت

میر علی اکبر رضوی عظمت تخلص متوطنِ مرادآباد وطنِ بزرگانش مشہدِ مقدس خودش در مرادآباد تولد و نشو و نما یافتہ قریب چہل سال شدہ کہ بہ لکھنؤ استقامت دارد از موزونی

---

(۱) ساکن بریلی (ن)
(۲) دو شعر ازاں انتخاب کردہ شد۔ (ن)
دوسرا شعر یہ ہے :-
کر قتل مجکو بول اٹھا وہ پکار کے | کیا خوش ہوا ہے جی میرا عاصم کو مار کے

طبع انچہ موزوں کردہ بہ نظرِ اصلاحِ جعفر علی حسرت آوردہ عمرش کم از شصت سال نخواہد بود از وست :-

اُس نے عالم جدا نکالا ہے　　ایک عالم کو مار ڈالا ہے

اُسے پھر دیکھ لوں یکبار مرنا تو مسلّم ہے　　اجل یہ آرزو بر آئے جبتک تن میں دم رکھنا
قدم بوسی کی تیری آرزو میں جی چلا بارے　　کبھی تربت پہ تو آ کر مرے ظالم قدم رکھنا
جوابِ خط لکھا ہر اک کو اُس نے اپنے ہاتھوں سے　　مرے خط کے ہی پڑھتے ہاتھ سے کیا تھا قلم رکھنا
نصیبوں سے ترے آوے جو عظمتؔ وہ کبھو گھر میں　　نہ جانے دیجیو ہر گز اسے دے کر قسم رکھنا

مار ڈالا غم میں تیری آہ و زاری نے مجھے　　سخت گھبرایا ہے دل کی بیقراری نے مجھے
اب تو اپنا تو سمجھ ظالم کہ سارے خلق کا　　کر دیا دشمن تری اس دوستداری نے مجھے
کچھ میں کہہ سکتا نہیں اسکو دلا اب کیا کہوں　　کھو دیا ہے آہ اُس کی پاسداری نے مجھے

پوچھو مت میرا حال کیا کچھ ہے　　دل نپٹ بیقرار سا کچھ ہے
تو جو کرتا ہے بے مزہ مجکو　　اس میں بھی یار کیا مزا کچھ ہے
ہجر میں کیا جئیں گے اے عظمتؔ　　باقی اب ہم میں کیا رہا کچھ ہے

تصویر تری آنکھوں کی اپنے حضور ہے　　نزدیک ہی تو دل سے مرے گو کہ دور ہے

جا کے کل بیٹھے جو اُس در پہ سرِ شام سے ہم　　تا دمِ صبح نہ واقف ہوئے آرام سے ہم

نا آشنا ہوئے ہیں دل لے کے آشنا کا   کیا کہیئے ان بتوں کو کچھ ڈر نہیں خدا کا

عشرتی و مضطرب

میرزا علی اکبر بیگ کہ پیش ازیں مضطرب تخلص و حالا کہ بخدمتِ نواب معتمد الدولہ بہادر مستفید گشتہ بارشادِ نواب ندبور عشرتی تخلص گذاشتہ و ہر دو تخلص می کند از ابتدائے عمر بمقتضائے موزونیٔ طبع چیزے کہ موزوں می کرد مشورۂ آں تا حینِ حیاتِ او بہ قلندر بخش جرأت داشت و حالا ہم بہ فیضِ طبیعت شاہدِ سخن را بخوبی آرائش می دہد عمرش تخمیناً سی سال خواہد بود، از وست :-

اس میں ہونی ہو سو ہو اُس شعرو کو دیکھ کر   عشرتی[1] اب میں لپٹ جاؤں نگا پروانے کی طرح

ہم سری ابروئے دلدار سے کیا کرتا ہے   خود ہلال آپ کو انگشت نما کرتا ہے

کچھ دلِ صد پارہ شکوہ یار کا کرتا نہیں   ٹوٹ کر بھی یہ مرا شیشہ صدا کرتا نہیں

وصالِ یار سے دونا ہوا عشق   مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

لے کے قاصد عوضِ نامہ عتاب آتا ہے   جب جواب آتا ہے تب صاف جواب آتا ہے
زخمیٔ تیغ نگاہِ بتِ محجوب جو ہوں   میرے زخموں کو بھی ملنے سے حجاب آتا ہے

منزلِ دنیا میں خطرہ رہزنوں کا ہے بہت   عشرتی یہاں سے قدم جلدی اٹھایا چاہیئے

---

(۱) مضطرب۔

حسن اور عشق ازل میں ہوئے جس دم پیدا — جان دینے کے لئے تم پہ ہوئے ہم پیدا

قطرۂ اشک دکھاویں گے اثر اب اپنا — گل کیا چاہتے ہیں دانۂ شبنم پیدا

لذتِ خنجرِ قاتل سے یہ جی چاہے ہے — تازہ سر شمع کے مانند ہو ہر دم پیدا

دے کے دل رحم کی رکھتا ہوں توقع اس سے — اُس کا جویا ہوں کہ جو شے ہی بہت کم پیدا

ہر دم اُس بادشۂ حسن سے سرگوشی ہے — اور دل کیوں نہ کرے گیسوئے پرخم پیدا

عشرتی کو غمِ کونین نہ ہووے یارب — اور جو ہو بھی تو ترے عشق کا ہو غم پیدا

جلد آ اے مرگ تو آوارہ پھرتی ہے کدھر — یار مجھ سے پھر گیا برگشتہ دوراں ہو گیا

سادگی سے اُس نے تو بندِ قبا وا کر دئے — صبر کا یہاں چاک دامن تا گریباں ہو گیا

مار ڈالا یار کی شیریں زبانی نے مجھے — عشرتی سم میرے حق میں آبِ حیواں ہو گیا

گر دکھاتے کو مرے غیر سے بیزاری ہے — ترکِ الفت، جو یہی رسم و رہِ یاری ہے

ذوقِ آرائشِ دلدار خرابی لایا — رات دن دیدۂ آئینہ میں بیداری ہے

اس لئے ذوق نہیں پان و مسی سے اُس کو — رنگ ان کا لبِ نازک پہ بہت بھاری ہے

رخصتِ ہستی دمِ مرگ اس لئے کرتا ہوں دور — کوچ کا عزم ہے سامانِ سبک باری ہے

عشرتی شام سے کیوں مضطرب اتنے ہو آج — کاٹنی تم کو شبِ ہجر ابھی ساری ہے

درد کی شدت میں فرصت ہو گئی — ہم کو غش آتے ہی راحت ہو گئی

گر مرا اُس کا ہو محشر میں عدل — دیکھنا مجھ پر قیامت ہو گئی

خاک میں میں مل گیا تو کیا ہوا — اُس کی تو رفعِ کدورت ہو گئی

جاں بلب تھا غم کے میں ہاتھوں تمیں آہ — جان کیا نکلی فراغت ہو گئی

پرتوِ مہ سے پسینا آگیا / ختم بس اُس پر نزاکت ہوگئی
واہ نقاشِ ازل کی صنعتیں / جس نے دیکھا اُسکو حیرت ہوگئی
بزم میں آیا جو ذکرِ حسنِ یار / شمع انگشتِ شہادت ہوگئی
اُسکے جاتے ہی سحر اے عشرتی / صبح جوں صبحِ قیامت ہوگئی

بہارِ حسنِ مہ رویاں جہاں ہے / یہ شعلہ شمع کا برگِ خزاں ہے
نہیں بیگانگی کچھ زلف و خط میں / کہ ان دونوں کا اک ہی دودماں ہے
ہدف دل ہے کماں ابرو نگہ تیر / مرے جینے سے اب خاطر نشاں ہے
خدا کرتا ہے خود کارِ غریباں / مرے مرقد پہ گنبد آسماں ہے
بوقتِ گریہ مجھ سے کر نہ پردا / کہ منہ پر چادرِ آبِ رواں ہے
بہار حسن کھو دے گا خطِ یار / نمود سبزہ پیغامِ خزاں ہے
نہ کیونکر عشرتی سے شعرِ تر ہوں / کہ وہ رطب اللساں عذب البیاں ہے

خوف اِک پردہ نشیں کی ہے جو رسوائی کا / ہوں نگہبان میں ناموسِ شکیبائی کا
چشمِ شوخِ بتِ پرفن پہ ہوا ہوں مائل / ہے مجھے ذوقِ شکارِ آہوئے صحرائی کا
گھر یہ گھر اب مری رسوائی کے افسانے ہیں / خانہ آباد ہو عشقِ بتِ ہرجائی کا
ہجر میں موت کے آنے سے تو ہوں شادیٔ مرگ / غم ہے لیکن غمِ دلدار کی تنہائی کا
یہ تمنا ہے کہ ہوں دفن درِ جاناں پر / تا ارادہ نہ کرے کوئی جبیں سائی کا
شبِ ہجراں کی سیاہی ہے ترا پرتوِ زلف / حشر سایہ تری قامت کی ہے رعنائی کا
دیکھ لے آپ کو آئینہ میں باتیں کرتی / جو کہ قایل نہ ہو تصویر کی گویائی کا
عشرتی لشکرِ غم آتے ہی یہاں کوچ ہوا / صبر و ہوش و خرد و تاب و توانائی کا

عقدۂ زیست اجل سے جو مرا وا ہووے
مرگ بیمار جدائی کا مداوا ہووے

اُس گھڑی خلعتِ وحشت مجھے زیبا ہووے
جامہ وار اپنا اگر دامن صحرا ہووے

اُس کے گر چہرۂ پر نور کی کھینچے تصویر
دستِ نقاش یقیں ہے یدِ بیضا ہووے

چشمِ محبوب کے پردے میں جو فتنہ ہے یہاں
وہ ہی دیکھے جو تری چشم کا بینا ہووے

ذلتیں عشق میں جتنی ہوں وہی ہے عزت
ہے وہ رسوا کنِ الفت جو نہ رسوا ہووے

اس لئے پہنی ہے زنجیرِ طلائی اُس نے
کہ جنوں کا مرے یہ سلسلہ برپا ہووے

عریاں

بابا طاہر عریاںؔ تخلص قوم گبر ہمیشہ عریاں می ماند و در زبانِ گبری خود اکثر رباعیات را موزوں می کرد، از وست :-

الالا کوہ ساراں ہفتہ بے
بنوشہ جو کناراں ہفتہ بے
مناوی میں کروں شہر و بہ شہرو
وفائے گلعذاراں ہفتہ بے

بُود ایم بجنگی اے دل لے دل
مگر شیر و پلنگی اے دل لے دل
اگر دستم فتے خونت بریزم
بہ بینم تا چہ رنگی اے دل لے دل

ردیف (غ)

غافل

منور خاں غافلؔ تخلص ولد صلابت خاں افغان یوسف زئی بزرگانش سکنۂ فیض آباد بودند و بہ سرکارِ فیض آباد نواب شجاع الدولہ بہادر بہ فرقہ سواران عزِ امتیاز

داشتند خوش در لکھنؤ تولد یافتہ نشو و نمائے پیدا کردہ جوانِ صلاحیت شعار و مہذب الاخلاق است از ابتدائے موزونیٔ طبع در عالمِ مکتب نشینی چیزے بجائے موزوں می کرد و آخر شاہ مظہر حق عشاق تخلص کہ ذکر ایشاں در حرف العین است تحریر یافتہ بہ حلقۂ شاگردانِ جدید در آمد چندے رنگِ طرحِ مجلس مشاعرہ ہم ریختہ بود شعر بطور سادہ و پُرکار می گوید و معنیٔ تازہ نیز اگر می خواہدٔ می یابد و در غزل سلامتِ کلامش مثلِ سلکِ گوہر است و ہر روز برائے استفادہ دریافتِ اصلاحِ شعر از حضارانِ مجلسِ فقیر می باشد و بہ فقیر نسبتِ دیگر شاگردان بسیار اعتقاد داشتہ بودہ است عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود، از دست:۔

جب آیا رحم عریانی پہ مرے دیدۂ تر کو — پنہایا پیرہن آبِ رواں کا جسمِ لاغر کو
درِ دنداں کا تیرے وصف جب تحریر کرتا ہوں — بنادیتا ہوں موتی کی لڑی ہر نقشِ مسطر کو
پیا کتنوں کا خون اور تشنگی اسکی نہیں جاتی — بجھایا تھا مگر آبِ نمک میں تونے خنجر کو
بہانے میں گذر جاتے ہیں جی سے بسملِ الفت — کہ صدمہ ہاتھ کا بھی تیغ ہے لوٹن کبوتر کو

دل کو بوسے کی طلب گیسوئے دلدار میں ہے — ہر یہ وہ دزد کہ محرم شبِ تار میں ہے
کیا زیاں ہے ترے گلشن کا بنالے گلچیں — آشیاں اپنا تو اک رخنۂ دیوار میں ہے
طوفِ کعبہ کو جو دل کھینچے ہے گا ہے گا ہے — کوئی تسبیح کا رشتہ مری زنار میں ہے
برگِ گل کیا کوئی لائی تھی صبا گلشن سے — اک قیامت قفسِ مرغِ گرفتار میں ہے

نہیں درکار زیبِ ظاہری خوش چہرہ انساں کو — کہ ہووے احتیاجِ سرمہ کب چشمِ غزالاں کو
شکوہِ سلطنت کے آگے کیا ہے حسن کا رتبہ — لئے پھرتی ہیں پریاں دوش پر تختِ سلیماں کو
بہانے عاشقِ بیتاب کے لاشے کو دریا میں — تہِ و بالا کرے گا ورنہ یہ گورِ غریباں کو
سبک ساروں کو خطرہ کچھ نہیں قہرِ الٰہی سے — خس و خاشاک کشتی جانتے ہیں موجِ طوفاں کو

نہیں ڈرتا ضعیفوں کی توانائی سے اے ظالم
کہ کھا جاتا ہے اکثر مورچہ شمشیرِ براں کو
وہ نخلِ یاس ہوں اس مزرعۂ ہستی میں اے غافل
نہیں ہے پھولنے پھلنے کی جس کی فکر دہقاں کو

صدمۂ ہجر مری جان اٹھانے کی نہیں
تو نہ آوے گا تو کیا موت بھی آنے کی نہیں
گو ہوئے عاشق و معشوق مقابل تو کیا
آنکھ تصویر سے تصویر ملانے کی نہیں
تیری پازیب کی جھنکار یہی کہتی ہے
بختِ خوابیدۂ عاشق میں جگانے کی نہیں
اپنے مجنوں کی ذرا دیکھ تو بے پروائی
پیرہن چاک ہے اور فکر سلانے کی نہیں

بسملِ تیغِ خونچکاں ہوں میں
یعنی اک دم کا مہماں ہوں میں
مجھ میں اور یار میں ہے اتنا فرق
بے دہن وہ ہے بے زباں ہوں میں
مثلِ تصویرِ لیلیٰ و مجنوں
یار بھی ساتھ ہے جہاں ہوں میں
ساتھ والوں نے ساتھ چھوڑ دیا
کس قدر ننگِ کارواں ہوں میں
جو بلا ہے مجھی پہ آتی ہے
تیرِ بیداد کا نشاں ہوں میں
کون یہاں ہم صفیر ہے میرا
طائرِ عرش آشیاں ہوں میں
ابھی کاہیدہ اور کر غمِ ہجر
خاطرِ یار پر گراں ہوں میں

پھر صدمہ ہوا کوئی دلِ زار کے اوپر
آنسو جو ڈھلے آتے ہیں رخسار کے اوپر
اللہ ری یوسف کی مرے گرمیِ بازار
گرتا ہے خریدار خریدار کے اوپر
گر خامۂ بہزاد مرے ہاتھ میں ہوتا
سراپا بناتا قدمِ یار کے اوپر
یک زخم کی بھی جا نہیں یہاں تن پہ ہمارے
واں سان دھری جاتی ہے تلوار کے اوپر
کیا بول اٹھی تھی کہیں قمری بھی "انا الحق"
جو سرو نے کھینچا ہے اسے دار کے اوپر

یہ کون سا پروانہ موا جل کے لگن میں
حیرت سی جو ہے شمع کی انگشت دہن میں

کہتے ہیں اُسے چاہِ زنخداں غلطی سے
بوسے کا نشاں ہے یہ ترے سیبِ ذقن میں

وہ آئینہ تن، آئینہ، پھر کس لئے دیکھے
جو دیکھ لے منہ اپنا ہر اک عضوِ بدن میں

وہ صبح کو اس ڈر سے نہیں بام پہ آتا
نامہ نہ کوئی باندھ دے سورج کی کرن میں

مضمون نہیں لکھتے ہم اُسے داغِ جگر کا
رکھ دیتے ہیں لالے کی کلی خطِ شکن میں

یہ گردِ کدورت سے پس از مرگ تھا دل صاف
دھبّا نہ لگا خاک کا بھی میرے کفن میں

گو لگی ہی ہچکی اور ہے آنکھ پتھرائی ہوئی
تم جو یاں آؤ تو پھر جاوے قضا آئی ہوئی

عالمِ وحشت میں بھی اتنا تصور تھا ہمیں
وہ نہ رسوا ہو بلا سے اپنی رسوائی ہوئی

پائے مجنوں میں پڑے ہونگے چھالے ایک دو
پشتِ پا تک یہاں تو صرفِ آبلہ پائی ہوئی

آب ہو جاتا ہے تیرے روبرو پتھر کا دل
آرسی کیونکر ترے رُخ کی تماشائی ہوئی

دعوئے باطل کیا تھا ساقِ سیمیں سے ترے
شمع اب تک ہے سر بازار لٹکائی ہوئی

وصلِ شیریں تو رہا موقوف روزِ حشر پہ
گور میں فرہاد کو کیونکر شکیبائی ہوئی

وہ کون سی شب تھی جو نہ گردوں نے سحر کی
پر زلفِ سیہ چہرۂ جاناں سے نہ سر کی

دامن کا بھلا بوجھ کہاں یار سے سنبھلا
اُٹھتی نہیں اس سے تو نزاکت بھی کمر کی

میں وہ ہوں سیہ بخت کہ مرقد پہ بھی جسکے
بتی عوضِ شمع جلاتے ہیں اگر کی

کس طرح نالے کرے بلبل چمن کی یاد میں
گھس گئی اُس کی زباں تو شکوۂ صیاد میں

دادخواہوں کی اگر پرسش ہوئی روزِ جزا
سب سے پہلے آئیں گے ہم عرصۂ فریاد میں

دامنِ دل اے نسیمِ گلشنِ جنت نہ کھینچ
لگ گیا ہے جی ہمارا اس خراب آباد میں

شعر کہنا آپ سے غافل کبھی آتا نہیں — عمر اک جبتک نہ کھوئے خدمتِ استاد میں

جذبِ دل ہی ہیں کیا خونِ دلِ بسمل کو — تا لہو دیکھ کے آ جائے نہ غش قاتل کو
سیرِ دریا کی خوش آتی ہی کسے یار بغیر — ہم لبِ گور سمجھتے ہیں لبِ ساحل کو
سارباں جی کی طرف کھینچے ہی مجنوں سوئے نجد — ناقہ حیراں ہی کہ لے جاؤں کدھر محمل کو

قتلِ عاشق سے کجی ابرو میں تیرے آگئی — کیا نہ تھی یہ تیغ فولادی جو یوں بل کھا گئی
انتظارِ یار میں تن سے نہ نکلی جان اور — موت بیٹھے بیٹھے بالیں پر مرے اکتا گئی
ابتدا ہی میں دکھائی عشق نے کیا انتہا — مُردنی منہ پر ہمارے جو ابھی سی چھا گئی
کون دریائے محبت سے اتر سکتا ہی پار — کشتیٔ فرہاد آخر کوہ سے ٹکرا گئی
لگ گئے جیتے ہی جی ہم تو کنارے گور کے — ناتوانی تا سرِ منزل ہمیں پہنچا گئی

فرقتِ قاتل نے از بس کر دیا لاغر مجھے — ڈھونڈتے ہیں زیرِ خنجر دیدۂ جوہر مجھے
گلشنِ دنیا میں ہوں میں طائرِ آفت نصیب — حلقہ ہائے دام ہیں نقشِ نگارِ پر مجھے
اے فرشتو دفترِ عصیاں ابھی رکھیو پرے — کھولتے دو پہلے اپنے خون کا محضر مجھے
میرے تن میں اور ہی دو چار داغوں کی جگہ — اپنے بھی تو داغ دے اے لالۂ احمر مجھے
چاہیے اب ہجر کے صدموں سے خوگر ہو رہوں — دیکھنا ہے ایک دن ہنگامۂ محشر مجھے

دور سے جھکنے سے مثلِ ماہِ نو دکھلا گئے — کشتۂ دیدار کو تم اور بھی تڑپا گئے
زیرِ خنجر جب ترے مذبوح نے نالہ کیا — کانپ کانپ اٹھیں زمینیں آسماں تھرا گئے
گلشنِ ہستی تماشا گاہ سے کچھ کم نہ تھا — ہم بھی یاں ملکِ عدم سے آکے جی بہلا گئے

قصۂ گیسو کو اتنا طول لے غافل نہ دے
مختصر کر تو کہ سننے والے بھی اکتا گئے

کاٹھ میں پاؤں کبھی تھا کبھی زنجیر میں تھا
کس قدر رنج اسیری مری تقدیر میں تھا

خوبیٔ عضوِ بدن کون سی ہے جو کہ نہ تھی
بول اُٹھنا ہی تو باقی تری تصویر میں تھا

تو اماں خط کا مرے وصل کی ہو ایک حرف
بسکہ مضمونِ جدائی مری تحریر میں تھا

رکھ دیا میں نے گلا آپ ہی خنجر کے تلے
ورنہ جلاد کو تو شک مری تقصیر میں تھا

شہیدِ ناز کسی دن جو لالہ رو کرتے
ملک بھی سر کے کٹانے کی آرزو کرتے

ہمیں تو کعبہ سے کچھ کم نہ تھا ترا کوچہ
بجا تھا اس میں اگر سجدہ چار سو کرتے

پس از فنا بھی نہ اک جا ہمیں تو چین آیا
فرشتے خاک میں پھرتے ہیں جستجو کرتے

زباں اگرچہ دمِ نزع بند تھی اپنی
جو آتے وہ تو اشاروں میں گفتگو کرتے

مثالِ غنچہ رہا چاک پیرہن اپنا
ہزاروں چاک تھے کس کس کو ہم رفو کرتے

وہ میرا دردِ دل کیا جانتے ہیں
تڑپنے کو تماشا جانتے ہیں

بہارِ گل ہے خار آنکھوں میں تجھ بن
چمن کو ہم تو صحرا جانتے ہیں

کہیں کیا حالِ دل اپنا بتوں سے
جو ہے دل میں تمنا جانتے ہیں

ستانا قتل کرنا پھر جلانا
وہ بے تعلیم کیا کیا جانتے ہیں

ابھی سے ذکر مرے آگے صبا نہ کر تو گل و سمن کا
چھٹوں گا قیدِ قفس سے جس دن نظارہ کر لوں گا میں چمن کا

نحیف اُس گل بدن کے غم میں ز بسکہ مثلِ صبا ہوا ہوں

دکھائی دیتا نہیں کسی کو زمیں پہ سایہ مرے بدن کا
یہ ماہِ تاباں ہی ہے کہ اُس سے ہر ایک آنکھیں ملا سکے ہی
اٹھائے چہرے سے گر وہ پردہ تو دم الٹ جائے انجمن کا
رہائی میں بھی اسیر ہوں میں عجب طرح کا یہ ماجرا ہے
گلے سے مٹتا نہیں ہے میرے نشان اُس زلف کی رسن کا
خبر لے شیریں تو جلد اُس کی کہیں نہ کر بیٹھے خون اپنا
کہ سنگِ خارا پہ آج تیشہ بہکتا پھرتا ہے کوہ کن کا

شب ہوئی یہ محوِ دید اس سیم بر کی چاندنی
ہو گیا دن اور آگے سے نہ سرکی چاندنی
کیوں نہ بھٹکے زلف میں دل وہ فروغِ حسن دیکھ
دیتی ہے دھوکا مسافر کو سحر کی چاندنی
شمع کو روتے جو دیکھا اپنے بھی بھر آئے اشک
رات محلس میں یہ ہم روئے کہ تر کی چاندنی
کیوں نہ چمکے رنگِ روئے مہ خاں پیری میں اور
صاف اکثر ہوتی ہے پچھلے پہر کی چاندنی

تہِ شمشیر اس حسرت سے یہ جانِ حزیں نکلی
کہ زخمِ تن کے بھی لب سے صدائے آفریں نکلی
دمِ آخر عیادت کو مری آیا وہ بالیں پر
جو حسرت دل کی نکلی بھی تو وقتِ واپسیں نکلی
پڑی غنچے کے دل میں یہ گرہ بلبل کی جانب سے
ہنسا یا بھی صبا نے پر نہ پیشانی سے چیں نکلی
کیا تھا ذکر کس نے باغ میں اُس قدِ نازک کا
زمیں سے سرنگوں جو شاخِ نخلِ یاسمیں نکلی
فلک دیتا تو ہے تکلیف نالوں کی ہمیں لیکن
جلا دے گی اُسے گر لب سے آہِ آتشیں نکلی

ڈوبنا بحرِ محبت میں گوارا کرتے
ورنہ تھے ہم کہ جو مرنے سے کنارا کرتے
درمیاں شرم کا پردہ جو نہ حائل ہوتا
وہ ہمیں دیکھتے ہم ان کا نظارا کرتے

نقشِ تصویر کوئی ہاتھ نہ آیا ایسا   دل کے شیشے میں پری جس سے اُتارا کرتے
نہ تو نام اس نے بتایا تھا نہ کچھ گھر اپنا   ہم کہاں ڈھونڈتے کیا کہہ کے پکارا کرتے
مذہبِ اہلِ تصوف بھی عجب ہے جس میں   دشمن و دوست کا یکساں ہیں مدارا کرتے
تیغ اوروں ہی پہ کھینچا کیے وہ اے غافل   امتحاں آکے کسی دن تو ہمارا کرتے

کس کے جی کا تیغِ ابرو سے زیاں ہوتا نہیں   کان دھر کر سن تو تو شیون کہاں ہوتا نہیں
حسن وہ شے ہے اگر کوئی زرِ گل کی طرح   لاکھ پردے میں چھپاوے پر نہاں ہوتا نہیں
کیا سرائے پر خطر ہے اپنا یہ جسمِ گلی   جو فرو کش اس میں دم کا کارواں ہوتا نہیں

دل کی دل ہی میں رہی اپنی تمنا کیا کیا   وقفۂ عمر دمِ چند تھا کرتا کیا کیا
غم نہ کھا آبلہ پائی کا مری اے مجنوں   طے کروں گا میں انھیں پانوں سے صحرا کیا کیا
کیونکہ قالین بنے سطحۂ صحرائے جنوں   گل کھلاتے ہیں مرے آبلۂ پا کیا کیا
اس خموشی پہ تو سو باتیں سنائیں اُس نے   بولتا میں تو وہ کیا جانیے کہتا کیا کیا

غیور

میر بہر اللہ غیور تخلص جوانِ صلاحیت شعار است بزرگانش ہمیشہ عمدۂ[1] معاش بودہ اند بہ میر قمر الدین منت از تہِ دل دوستی داشتہ و حالا ہم خود را از مستفیدان او می شمارد اگرچہ پیش ازیں بخانہ خود دو سہ بار مشاعرہ کردہ اما چنداں بہ گفتنِ شعر خیال نہ داشتے چیزے کم کم موزوں می کرد دریں عرصہ پا در عرصۂ سخن سنجی گذاشتہ غزل درست بستہ بسر انجام میرساند با فقیر ہم از مدتے آشنائی دارد، از وست :-

---

(۱) عمایدِ روزگار بودہ اند (ن)،

تحسیں بھی نہ کی شیریں نے کچھ تیشہ زنی پر ۔۔۔ پتھر پڑیو فرہاد کی اس کوہ کنی پر

اُن زلفوں کا عنبر کے تئیں دیکھ ہوا خوار ۔۔۔ سرپوش دھرا نافے نے مشکِ ختنی پر

کیوں غنچے کے مانند گریباں نہ کروں چاک ۔۔۔ گل کھائے جو ہاتھوں پہ وہ اس گلبدنی پر

شاباش غیورؔ آفریں صد آفریں تم کو ۔۔۔ کیا خوب غزل کہتے ہو اس کم سخنی پر

کیا کیا نزاکتیں غرض اس سیم بر میں ہیں ۔۔۔ دامن کو ہاتھ لگتے ہی سو بل کمر میں ہیں

جو غیر سے کچھ اس کو سروکار نہ ہوتا ۔۔۔ رسوائے سر کوچہ و بازار نہ ہوتا

وہ کثرتِ عشاق سے بیزار ہی یہاں تک ۔۔۔ کہتا ہے الٰہی میں طرحدار نہ ہوتا

گر مصر کے بازار کی ٹک سیر وہ کرتا ۔۔۔ یوسف کا وہاں کوئی خریدار نہ ہوتا

اس دامن سے چلتا نہ کبھی قافلۂ اشک ۔۔۔ گر لختِ جگر قافلہ سالار نہ ہوتا

چھپ چھپ کے نہ جاتا جو غیورؔ اُس کی گلی میں ۔۔۔ تو قتل کے قابل وہ گنہگار نہ ہوتا

غنی

محمد غنی کہ غنی تخلص می کند خلفِ خواجہ محمد حسن المتخلص بتائب بن خواجہ عبد الوہاب ناصر است وطنِ بزرگانش خطۂ کشمیر و خودش در فرخ آباد تولد یافتہ، جوانِ مہذب الاخلاق و شیریں گفتار دیدمش بہ تجارتِ پشمینہ کہ پیشۂ قدیم آبائی اوست بسر می برد و بہ حکم موزونیٔ طبع کہ دولتِ ایرانی است فکرِ شعرِ ہندی بیشتر می کند۔ چوں پدرش در شعر فارسی مہارتے داشت استفادۂ فیضِ سخن از والدِ خود حاصل نمود۔ عمرش سی و ہفت سالہ خواہد بود بحساب یقینی در آمدہ از کلام اوست :-

ملے اسی کو عزیزو سراغِ راہِ عدم ۔۔۔ جو چشمِ غول کو جانے چراغِ راہِ عدم

حصول کر تو غنی رتبۂ فنا فی اللہ — کہ تا ہو زیست میں حاصل فراغِ راہِ عدم

شب نشے میں وہ جو کھولے رخ پہ زلف قہر تھا — چشم بد دور الغرض اک عالم تصویر تھا

سیر کی شہرِ جنوں کی پایا ویرانہ تمام — ہاں مگر آباد واں اک خانۂ زنجیر تھا

ناتوانی چشم کو گو دن بدن تھی ہجر میں — زور پر لیکن ہمارا نالۂ شبگیر تھا

خط کے آنے سے ہوا رتبہ زیادہ یعنی تب — خط سوادِ رخ تو مصحف تھا پہ بے تفسیر تھا

بے گناہی میری ٹھہرا کر گنہگار اب مجھے — واقعی ایسا ہی بندہ واجب التعذیر تھا

بعد مرنے کے ہوا معلوم یہ سیماب وار — کشتہ ہونا ہی غنیؔ حق میں ترے اکسیر تھا

مسی سے یوں درِ دندانِ مہ پیکر چمکتے ہیں — شب تاریک میں جس طرح سے اختر چمکتے ہیں

نہیں قطرے عرق کے جلوہ گر ابروئے جاناں سے — میاں شمشیر فولادی کی یہ جوہر چمکتے ہیں

رگ گل سے تعجب کچھ نہیں گر خون جاری ہو — شب مہ خارِ گلبن صورتِ نشتر چمکتے ہیں

ہم بغل ہو کے جو دلدار نے سونے نہ دیا — وصل کی شب اسی تکرار نے سونے نہ دیا

آگ لگ جائیو اس عشق کو یارب کہ ہمیں — ایک شب آہِ شرربار نے سونے نہ دیا

شرح جب نالے کی ہم اپنے رقم کرتے ہیں — نیزۂ نے کو ضرورت سے قلم کرتے ہیں

کیا[1] غنیؔ نیک و بدِ خلق سے ہم کو یعنی — مدح ہم کرتے کسی کی ہیں نہ ذم کرتے ہیں

غفلت

احمد خاں غفلتؔ تخلص قوم افغانِ یوسف زئی ساکن رام پور شاگردِ مولوی

---

(۱) اے زن؟

قدرت اللہ شوق مصنفِ تذکرۂ ریختہ گویانِ قدیم جوانِ مہذب الاخلاق است از اں شہر خود محض برائے ملاقاتِ فقیر در لکھنؤ آمدہ بود در قصائد و مثنوی داد معنی بندی می دہد دو طرحی مشاعرہ اینجا کہ گفتہ بود انتخاب آں بنوکِ قلم می دہد، از وست :-

رہتی تھی زیست میں ہی نہ شام و سحر کھلی
ہے گور[۲] میں بھی جوں خمِ مے چشمِ تر کھلی

سے بہرِ جود باز ہوئے نے پئے طلب
جوں غنچہ اپنی مشت دکھانے کو زر کھلی

گریہ نے اپنے عقدۂ مشکل کو حل کیا
یہ طرفہ تر گرہ تھی کہ ہوتے ہی تر کھلی

بست و کشودِ کار میں اپنے رہا مدام
ایدھر دھوئیں کی طرح پڑی گانٹھ اُدھر کھلی

باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر کی طرح
غفلت یہ غافل آنکھ نہ آئی نظر کھلی

زخم بویا روشِ گل دلِ دلگیر میں تھا
عطر کیا آب کی جاگہ تری شمشیر میں تھا

ساتھ ہی اس کے کھنچا ماہی نمط دل اپنا
سست تھی شوخ کہ پیکان تری تیر میں تھا

آہ کیا کیجے زبردستیٔ گردوں کا بیاں
درد پہنچایا وہ ہم کو جو نہ تقدیر میں تھا

گور اپنی یہ سدا مکڑی کا جالا ہی رہا
موئے پر دام میں ہوں جیتے جی زنجیر میں تھا

سرِ فرہاد جو خسرو نے منگایا غفلت
کیا کوئی کنگرہ کم شیریں کی تعمیر میں تھا

ردیف (ف)

فرحت

اکبر شاہ خاں فرحت تخلص ولد ملا ملوک متوطنِ رامپور عمرش چہل و پنج سالہ

---

(۱) دیوان مع قصاید و مثنوی دارد، دو غزل طرح اینجا کہ گفتہ بود نزدم برآمدہ انتخاب آں قلمی گردید (ن)

(۲) اس واسطے نہ گور میں بھی چشمِ تر کھلی (ن)

خواہد بود، از وست :۔

دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا — اس کا جینا ہمیں دشوار نظر آتا ہے
بسکہ خوں روئے ہیں غم میں ترے اے رشکِ چمن — دامن اک تختۂ گلزار نظر آتا ہے
شکلِ[1] آئینہ میں حیران ہی دیکھا اس کو — جو ترا طالبِ دیدار نظر آتا ہے
کس کو اب حالِ دلِ زار سنادیں اپنا — نہ کوئی یار نہ غمخوار نظر آتا ہے
گرچہ سب کہتے ہیں فرحت کے تئیں دیوانہ — کام میں اپنے وہ ہشیار نظر آتا ہے

فرحت

شیخ فرحت اللہ فرحت تخلص از حالِ او خبر ندارم، از وست :۔

جوں اشک گرا ہوں میں گو یار کی آنکھوں سے — لیکن مجھے دیکھے ہے وہ پیار کی آنکھوں سے

عالم میں رسم عشق و محبت ہے ہر کہیں — پر اب تلک سنا نہیں جور اس قدر کہیں
اتنی ہی آرزو کہ میں چھپ کر کے ایک رات — رو لوں تری گلی میں ذرا بیٹھ کر کہیں

فرصت

میرزا ہاتف بیگ فرصت تخلص۔

عجب طرح سے شبِ ہجرِ یار گذرے ہے — کہ اپنی زیست بھی خاطر پہ بار گذرے ہے
تری گلی میں جسے گرد باد کہتے ہیں — کبھی کبھی وہ ہمارا غبار گذرے ہے

فراق

میرزا تقی قلی خاں فراق تخلص، از وست :۔

---

(۱) شکل آئینہ کے حیراں اسے دیکھا ہم نے (ن)

تماشا اس چمن کا کس کے دل کو شاد کرتا ہے
کہ یہاں یک لب تبسم غنچہ کو برباد کرتا ہے
اسیروں کی قسم تجکو صبا سچ کہہ کہ گلشن میں
کوئی ہم نوایوں میں ہمیں بھی یاد کرتا ہے

فرّخ

شیخ فتح علی فرخ تخلص از قدما معلوم می شود و شعرے از و بہم رسیدہ اینست :-

اس قدر کیوں مجھ سے ہوا اے مہوشاں نا آشنا
میں بھی تو آخر کسی دن تھا تمھارا آشنا

فرّخ(۱)

فرخ تخلص جوانیست الکن در ابتدا بمقتضائے موزونی چیزمی گفت آخر بشاگردی شیخ امام بخش ناسخ سر اتیاز افراختہ در چندے کلام خود را بپایۂ پختگی رسانیدہ غرورے پیدا کرد و غزل را بر ویۂ مخترعۂ استاد خود برابرِ قصیدہ گفتن و در مجالسِ مشاعرہ خواندن فخرِ خود دانست عمرش سی سالہ خواہد بود ، از وست :-

مرے آگے نہ لے قاتل علم کر تیغ دشمن پر
مجھی کو قتل کر تو خون میرا میری گردن پر
عجب کیا ہی برنگ سرمہ ہوں گر استخواں پس کر
زبس بارِ گنہ ہے ہم سیہ کاروں کی گردن پر
کوئی سرو رِ رواں شاید پئے گلگشت آتا ہے
سحر سے بیٹھے ہیں مرغِ چمن دیوارِ گلشن پر
یہ جلوہ رات کو تھا میری آہِ شعلہ افگن پر
نظر آتی تھی اک بجلی چمکتی مہ کی خرمن پر

---

(۱) کرامت علی خاں فرخ تخلص تلامذہ شیخ امام بخش ناسخ کتب متداولۂ فارسی درست خواندہ است و قصائد اکثر گفتہ است و در غزل گوئی مشقے خوب دارد و والد و جدا و فکرِ شعر فارسی می نمودند والدش حفیظ تخلص و جدش علیم تخلص می کرد و برادرِ جدش سلام اللہ خاں سلیم تخلص می کرد و ہمہ ہا از مشائخ کبار بودند۔ (ن ر)

نہ ہو گی طے رہِ الفت یہ سر ہے جب تلک تن پر — کہ ہیں ہم ناتواں منزل ہے دور اور بوجھ گردن پر
ترشح بحر و بر ہر ایک سے ہے ابر و باراں کی — کرم یکساں ہے عالی ہمتوں کا دوست دشمن پر
ہوا تھا قیس شاید دھیان میں لیلیٰ کی آنکھوں کے — ہجومِ آہوانِ نجد ہے جو اُس کے مدفن پر
نظر یوں میکدے میں شب کو آیا فرخِ مے کش — کہ زیرِ سر رکھے ایک خشتِ خُم سوتا ہے گلخن پر

فدا

میر امام الدین فداؔ تخلص، بہ فقیر اطلاعِ حال شاں نیست، از وست :-

یہی تو کچھ نہیں اے بے وفا تری باتیں — تو بات بات میں ہوتا ہے مجھ سے آزردہ

فرد

خدا بخش خاں فردؔ تخلص ساکنِ غازی پور زمانیہ، جوان طالب علم است بہ قدر تحصیلِ علمِ عربی نمودہ ہمیں قدر در فارسی چیزے دیدہ بمقتضائے موزونیٔ طبع چیزے کہ موزوں می کند بہ نظرِ فقیر می گذارند عمرش تخمیناً از بست متجاوز خواہد بود شوقِ ملاقاتِ من او را از دیارِ خود بہ لکھنؤ افگندہ محض برائے ہمیں کار رنجِ غربت را بر خود روا داشت، از وست :-

کیا کیا نہ حظ اٹھائے ہیں غیروں نے یار سے — محروم اک ہمیں رہے بوس و کنار سے
پہنچاتی ایک دن وہ درِ یار تک اُسے — الفت صبا کو ہوتی جو میرے غبار سے
سوز و گداز مجھ پہ جو گذرے ہیں زیرِ خاک — سب آکے پوچھ لو مری شمعِ مزار سے
عشقِ بتاں میں میں بھی جو کچھ بت سا بن گیا — گردن کٹی نہ تیغچۂ آب دار سے
کیونکر نہ آئے حال گلوں کو چمن میں فردؔ — پیدا ہو صوتِ زمزمہ جب شاخسار سے

فغاں

احوالش معلوم نیست مگر ایں قدر کہ ایں ہم شریکِ آں مشاعرۂ عظیم الشان مرزا تقی ہوسؔ

بوده، از وست :-

کمر باندھی ہے کس گل چہرہ نے تاراجِ گلشن پہ | کہ فق ہو رنگِ گل بلبل طپاں ہو اپنے مدفن پہ
سبک روح اس جہاں سے ہے چلی عریاں تنی ہم کو | غبارِ معصیت ہرگز نہ بیٹھا اپنے دامن پہ
نگہ سفاکِ عالم کیوں نہ ہو اُس شوخ پرفن کی | تفوق جس کے ابرو کو فغاں ہو تیغِ آہن پہ

فائق

مولوی غلام محمد فائق تخلص ولد مولوی غلام حسین بزرگانش بہ اکبرآباد توطن داشتند وخودش ہمیں جا تولد ونشو ونما یافتہ واز پدر بزرگوارِ خود کتابہائے درسی فارسی را بلد شدہ و دریں کار سرآمدہ خصوصاً در تدریس انوری وخاقانی وشرح سکندر نامہ نظامی علیہ الرحمتہ شہرت می افراز دو اکثر امیرزادہائے ایں دیار از تلمذش فیض یافتہ اند چوں مزاج قانع وارد بہ طلب بدرِ کس نرفتہ نظم شعر ومعلومات ایں فن را ماہر یافتمش عمرش از ہفتاد تجاوز کردہ باشد فقیر باو دو سہ ملاقات کردہ در تہذیبِ اخلاق بے نظیر دیدہ انچہ از کلامش بہم رسیدہ این ست :-

پروردۂ غم است تنِ ناتوانِ ما | زنہار لب ہما نہ خوری استخوانِ ما

بکشا گرۂ زلف دل زار فروشم | ایں دانۂ تسبیح بہ زنار فروشم
حق گویم وحق دانم و در راہِ اناالحق | منصور صفت سر بسرِ دار فروشم
آگاہ نمایند زلیخاں نشاں را | من یوسفِ کنعاں سرِ بازار فروشم
بیعانۂ آسودہ دلاں نیست قبولم | من جنسِ غم و درد بہ بازار فروشم
کس مشتریٔ گوہرِ من نیست دریں شہر | ہر چند کہ ارزاں بہ خریدار فروشم
جز دامنِ فائق نہ کند میلِ خریدن | یاقوت کہ از دیدۂ خوں بار فروشم

فارغ

فارغ تخلص کہ از نامش خبر ندارم، از وست :-

اشک آنکھوں سے جو نکلا سو وہ گوہر نکلا　　　بعد مدت کے مری چشم کا جوہر نکلا

فریاد[1]

تخلص فریاد

دل کو امید رہائی سے اٹھایا ہم نے　　　عشق کے دام میں جب پانوں پھنسایا ہم نے

فریاد

میرزا مغل فریاد تخلص ابن مرزا علی نقی بن آغا رضائی[2] کرمانی بزرگانش از ولایت[3] در شاہجہاں آباد آمدہ توطن گزیدہ خود وش در لکھنؤ تولد و نشو و نما یافتہ پیش ازیں بمقتضائے موزونی طبع فکر مرثیہ و سلام می کرد و آنرا از نظر میاں افسردہ می گذرانید از یک دو سال بگفتہ فقیر عمل نمودہ بنظم کردن غزل ریختہ متوجہ شدہ عشوۂ آں بفقیر آوردہ عمرش بست و دو سالہ است از رسائی ذہنش معلوم می شود کہ اگر زمانہ فرصت داد آخر کار بجائے خواہد رسید

از وست :-

دن رات آتش غم ہجر کے ہے تن کے اندر　　　شعلے سے بھڑکے ہیں کچھ میرے بدن کے اندر

کیا احتیاج ہم کو شمع مزار کی ہے　　　داغ جگر ہے اپنا روشن بدن کے اندر

---

(۱) ن - لالہ رائے صاحب فارغ تخلص

(۲) ن - آغا رضی۔

(۳) ن - از ولایت اول در شاہجہاں آباد آمدہ بعدہ در لکھنؤ مقیم گردیدند او در لکھنو۔

کس کے بدن کی نکہت لائی صبا چمن میں
پھولے نہیں سماتے گل پیرہن کے اندر

مہدی لگے جو اپنے اُس گل نے پاؤں دھوئے
پانی ہوا گلابی سارا لگن کے اندر

بیمار کی ترے شب حالت یہ تھی کہ آنسو
پانی چوا رہے تھے اُس کے دہن کے اندر

کیونکر نہ گوشِ دل سے سامع ہوں اہلِ مجلس
فریاد اک اثر ہے تیرے سخن کے اندر

دودِ جگری سے شبِ دیجور نہ ہو جائے
پھر آہ کہیں اپنی بدستور نہ ہو جائے

آئینہ دکھاؤ نہ اُسے آئینہ سازو
وہ طفلِ حسیں حسن پہ مغرور نہ ہو جائے

مرنے کا مجھے غم نہیں غم ہے تو یہ غم ہے
الفت تو تری دل سے کہیں دور نہ ہو جائے

پھینکے ہے سدا سنگِ ستم چرخِ ستمگر
فریاد کہیں شیشۂ دل چور نہ ہو جائے

دل یہ بھرا کہ جوش سے آنسو ٹپک گئے
ساغر ہماری چشم کے آخر چھلک گئے

جاتے تھے سوئے کعبہ گئے دیر کی طرف
مستِ مئے جنون تھے ہم آخر بہک گئے

آیا نہ دیکھنے کو تو در تک ہزار حیف
ہم گرتے پڑتے گرچہ ترے گھر تلک گئے

مارا اٹھا کے سر پہ ثریا نے اپنا ہاتھ
بازو پہ نورِ تن جو ترے شب چمک گئے

تاثیر اُس کے دل میں نہ کی غم یہی رہا
گو نالہائے نیم شبی تا فلک گئے

فریاد کیا کریں نہ رہا ایک بھی رفیق
اور اپنے پاؤں پہلی ہی منزل میں تھک گئے

دل بھی مرے احوال کا پرساں نہیں ہوتا
افسوس کہ کوئی مرا خواہاں نہیں ہوتا

رسوائیاں کیا کیا ہوئیں گھر جانے سے اُس کے
اس پر بھی تو اے دل تو پشیماں نہیں ہوتا

عیسیٰ نے یہ کہہ کر کے وہیں ہاتھ اٹھایا
مجھ سے تو ترے درد کا درماں نہیں ہوتا

سو بار بہایا فلکِ نیلوفری کو
کب اشک کا قطرہ مرے طوفاں نہیں ہوتا

نہ جیتے جی تو غمِ عشق سے فراغ ملا | گر ایک داغ ہوا یہ تو اور داغ ملا
مزے میں بوسۂ لب کے جو مست تھی شبِ وصل | لگایا منہ سے نہ ہم نے اگر ایاغ ملا
وہاں بھی مشتعل اک شعلۂ جدائی تھا | لحد میں بھی نہ ہمیں رنج سے فراغ ملا
جو شمعِ بزمِ حریفاں ہوا زمانے میں | اُسی کو سب نے جلایا اُسی کو داغ ملا
چلے ہیں داغِ جدائی جگر پہ لے کر ہم | فروغِ قبر کی خاطر عجب چراغ ملا
کہیں گے حالِ دلِ غمزدہ ہم اے فریاد | کبھی جو اُس ستم ایجاد کا دماغ ملا

فانی

شیخ مغل فانی تخلص بانیٔ مجلس مناثرہ دریں شہر او شدہ اول جماعتے از ہنودان وغیرہ بتقریب نثر نویسی چہ در زبان اردوئے ریختہ وچہ در زبانِ فارسی دراں مجلس حاضر می شدند چوں حسب اتفاق روزے گذرِ فقیر دراں مقام افتاد برائے شریک شدن منشیان انشا پردازان روز ہا شرکیہ در وصف دکانِ تنبولی بہ تتبعِ ظہوری بر مشتری گفتہ بودم بعرض بیان آوردم چوں چوں خار خارِ مشاعرہ از قدیم درویش جا داشت پیشِ فقیر ہم گاہ گاہ رفت و آمدی می کرد القصہ رفتہ رفتہ مجلسِ مناثرہ اش بمشاعرہ تبدیل یافت و ورقِ مرقعِ تصویرِ نثر نویسان را بر طاق گذاشتہ زمانہ بازیٔ گنجیفہ دیگر در پیش آورد یعنی از رفتنِ عاصی دراں مجلس بہ کثرت مجمعِ کثیر شاگرداں شود، غزل خوانی از سامعِ سبحان ملاءِ اعلیٰ در گذشت۔ دراں وقت منشیانِ سحر بیان زبانِ سکوت بکام کشیدہ جز سماعتِ اشعار کارے دراں انجمن نہ داشتند ہر گاہ دریں نزدیکی روزگارِ شیخ موصوف بہ سرکارِ نواب کلب علیخاں بہادر رونقِ شرف گرفت آں رقعہ شوریدہ مضمون زبانِ اردو خواندہ شد واجب رفتنِ مشاعرہ بر من فرض گردید برائے آنکہ فقیر ہم در سرکارِ ایشاں بصیغۂ شاعری پیشتر از مغل عزِ امتیاز داشت چند سال گذشتہ باشد کہ حالا با ضعف نہ رفتنِ فقیر بہ سبب روزگارِ نواب

فلک جناب مہدی علی خاں بہادر شاگردانِ من آں مجلس بدستورِ اول قائم می دارند والا اکثر بہ تجربہ درآمدہ کہ این مجلس از یک سال طول نمی کشد و تفرقہ و خللے بروبالضرور واقع می شود عجز و نیازِ شیخ مغل با ہر کدام ضرب المثلِ روزگار است تخمیناً عمرش از سی در گذشتہ باشد، از وست :۔

سحر زلفوں میں ہے اور معجزہ گفتار میں ہے
فتنہ آنکھوں میں ہی محشر تری رفتار میں ہی

ہم یہاں ہیں در و دیوار سے سر ٹکراتے
رونق افزا دہ وہاں خانۂ اغیار میں ہی

سچ ہے یہ ہوتا ہی اقرار میں اک لطف عجیب
پر مزا کیا کہوں جیسا ترے انکار میں ہی

فانی مے پینے کو آیا نہیں شاید یا رد
شور کم آج بہت خانۂ خمار میں ہی

فاطر

پیر بخش فاطر تخلص شاگردِ مذنب بیشتر خیالش بطور استادِ خود متوجہ سلام گوئی است کم کم ریختہ ہم می گوید عمرش سی سالہ خواہد بود از وست :۔

ہم یہ سمجھے تھے محبت میں بہل جائیگا دل
یہ نہ معلوم تھا رنگ اور ہی دکھلائیگا دل

اب تو محظوظ ملاقات سے ہی دل بر کی
دیکھنا آگے کو پچھتائے گا گھبرائے گا دل

ٹھوکریں جیسی کھلاتا ہے ہمیں گلیوں میں
ویسا کم بخت ہمارا یہ سزا پائے گا دل

رحم کر جان پہ فاطر کی یہ مضطر ہے مدام
مہربانی سے تری اُسکا سنبھل جائیگا دل

فروغی

میرزا محمد علی صفاہانی واحد العین فروغی تخلص شخص جامع الکمالات ندیم و ہم صحبتِ

---

(۱) ن ۔ حالا در سرکار نواب مہدی علیخاں بہادر ملازم ہستم رفتن فقیر نمی شود لیکن منور خاں غافل وغیرہ شاگردانم شریک محفل می شوند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در خانۂ شیخ موصوف چند سال صحبت بلا ناغہ گردید ۔ (حاشیہ صفحہ ۲۵۰)

تیمور شاہ بود عمرش از شصت متجاوز خواہد بود حسن را بہ شدت دوست می داشت، از وست د،

توکہ ہر لحظہ بہ ہر گوشہ بروں می آئی من یک چشم کدا میں سر راہت گیرم

بر سرو ماہِ تاباں دیدم نہ دیدہ بودم مہ طالع از گریباں دیدم نہ دیدہ بودم

فجر

فتح علی شاہ قوم قجر شہنشاہ ایران کہ در شہر طہران بود و باش وارد جوان بلند بالاو صاحب جمال و قوی الجثہ و ہولناک شجاع و بہادر طبعے نہایت رنگین حریفانہ وظریفانہ دارد عمرش قریب پنجاہ و سہ سال خواہد بود. گویند کہ انگریزے از طرفِ کمپنی برسم رسالت بخدمت شہنشاہ موصوف حاضر شدہ بود عمرش چہاردہ پانزدہ سالہ و نامش استرجی بادشاہ جمجاہ حسن و جمالش را دیدہ دل باختہ شدہ بود. اکثر در غزل وصفِ اعتدالِ حسن او موزوں می کرد از آنجا شعرے از زبان مرزا جواد علی بیگ کربلائی بہ سمعِ فقیر رسیدہ مع دو شعر دیگر حوالۂ کاغذ کردہ شد و اینست :-

خبر برید باہل فرنگ کاسترجی بہ تیغ غمزہ مسخر نمود ایراں را

کہ گفت منظرِ چشم من آشیانۂ تست تو بادشاہی و عالم تمام خانۂ تست

سجعہ کہ برائے مادرِ خود گفتہ و بر نگینِ انگشتری مادرش کندہ بود، اینست :-

بروز بیدۂ و بلقیس حسرت جاہم کنیزِ فاطمۂ و مادرِ شہنشاہم

فرہاد

میر ببر علی فرہاد تخلص بیش ازیں متوطنِ فیض آباد بود حالا بہ لکھنؤ سکونت دارد

مردمان شاگردِ میر حسنش می گویند[1] اما خود کمتر اقرار می کند غالباً در ابتدا شاگرد باشد حالا بقوتِ خود می گوید و پیشۂ معلمی اکثر بسر بردہ وگاہے بہ صیغۂ شاعری ہم اوقات گذرانیدہ از علم فارسی و کتب ہائے درسی بہ قدرِ حاجت آگاہی دارد با فقیر از مدتے بہ لکھنؤ قدم گذاشتہ آشناست، از وست :-

یہ کس نے تجھے کافر[2] تعلیم جفا کی ہے
نالاں ترے ہاتھوں سر ایک خلق خدا کی ہے

غیروں کو تو کہہ ہم پر پھینکے نہ پھر آوازہ
اس بات پہ نت ان سے تلوار چلا کی ہے

پھر نام وفا کا تو لیسنا نہ مرے آگے
کہہ تو نے کسی سے بھی دل لیکے وفا کی ہے

کس بات پہ تو ہم سے اتنا ہے خفا پیارے
گالی بھی جو دی تو نے تو ہم نے دعا کی ہے

چنگا نہ ہوا کوئی بیمار محبت کا
بہتوں کی مسیحا نے اک عمر دوا کی ہے

یا آہ ہے یا گریہ اس عشق کے عالم میں
تاثیر عجب یہاں کی کچھ آب وہوا کی ہے

گلشن میں جو بو پھوٹی اس طرۂ مشکیں کی
غمازی و جاسوسی ساری یہ صبا کی ہے

نقشہ جو ترا دیکھا تو کہنے لگا مانی
اللہ یہ نقاشی کیا دستِ قضا کی ہے

ہوں سایہ فگن سر پر جس کے یہ ترے کاکل
کب اس کو طمع پیارے پرِ بال ہما کی ہے

کس کس کا جگر خوں ہے تجھ دستِ نگاریں سے
اے شوخ یہ عیاری سب رنگِ حنا کی ہے

مت شہر بدر ظالم فرہاد کو کر ناحق
بتلا تو بھلا اس نے کیا ایسی خطا کی ہے

فصیح[3]

میرزا جعفر علی فصیح تخلص مولدش در فیض آباد در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و شصت

---

(۱) ن۔ اما او اقرار نمی نماید۔ (۲) ن۔ ظالم

(۳) نسخہ رامپور میں ردیف (ف) کے ضمن میں دو شاعر فصیح اور فصاحت کا ذکر زیادہ ہے جو اس نسخہ میں نہیں۔

ہجری واقع شدہ در سنِ ہفدہ سالگی مع والدین داقربا بہ شاہجہاں آباد کہ وطنِ بزرگانش بود رفتہ بعد چند سال باز بہ لکھنؤ آمدہ۔ قوم قریش از اولاد عقیل ابن ابی طالب علیہ السلام است چوں بزرگانش در بلاد ایران متوطن بودند لہٰذا مرزا مشہور گردید و مادرش سیدہ بود و ہرچہ گفتہ از نظرِ شیخ امام بخش ناسخ گزرانیدہ بلکہ سر حلقۂ تلامذۂ اوست در مرثیہ گوئی نامے حاصل ساختہ از علمِ عروض و قافیہ دستگاہے دارد۔ وحدیث وکتب دینیہ از جناب مستطاب میر دلدار علی ولد مولٰنا سید محمد دام ظلہ استفادہ نمودہ، یکبار برائے زیارتِ آئمہ معصومین رفتہ بود حالا باہمیں قصد بہ طرفِ کلکتہ رفتہ است۔

فصاحت

میر بندہ علی فصاحت تخلص ولد میر علی بزرگانش باشندۂ اسلام آباد خودش در لکھنؤ نشو ونما یافتہ عمرش ہفدہ سالہ است از فقیر استفادہ می نماید طبعِ موزوں دارد واللہ بجائے خواہد رسید:-

آپ بیٹھے چین سے زلفیں بنایا کیجئے
آپ کو حالِ پریشاں سے مرے کیا کام ہے

جب چمن سے پھول گلچیں جھولیاں بھرنے لگے
تب ہمیں صیاد نے چھوڑا قفس سو یا نصیب

کیا بھول گیا ہاتھ مرا جامہ دری کو
اگلی سی نہ وحشت ہے نہ اب شورِ جنوں ہے

ردیف (ق)

قربان

میر جیون قربانؔ تخلص، آگاہی از حالش نہ دارم شعرے از وہم رسیدہ اینست:۔

یوں بندِ قبا کھل گئے جو آن میں گل کے
کیا پھونک دیا تو نے صبا کان میں گل کے

قلندر

قلندر تخلص علیٰ ہذا القیاس است، از وست:۔

زاہد ہوا ہے طالبِ غلماں قصور سے
ورنہ مراد وہ شوخ بھی کیا کم ہے حور سے

قلاش

حکیم حیات اللہ قلاشؔ تخلص متوطن قصبہ کاکوری پدر شیخ پیر بخش مسرور با وجودِ مہارت درفنِ طبابت اکثر بہ تجارت اشتغال می داشت عمرش بہ چہل سال رسیدہ بود کہ ناگاہ بمرضِ سل مبتلا شدہ سنگِ مجبوری بر سینہ نہاد و درگذشت خیالِ شعرِ فارسی اکثر بنمود بہ شاگردی شاہ ملول زباں اقرار می کشاد، از وست:۔

مانیِ چشمم مگر صورت کشِ تصویر اوست
خامۂ مو در کفش از موئے مژگاں یافتم

نشانہ ساں دل مو بمو در کاکلش تسخیر شد
آہ یک دیوانہ پابندِ دو صد زنجیر شد

دیدہ بودم دوش چشمِ سرمہ آلودش بخواب
تا بہ فردائے قیامت خاموشی تعبیر شد

ذبح کردد دادِ صد دشنام گفتم مرحبا
بر منِ مذبوح قاتل بس ہمیں تکبیر شد

دل گرفت و رفت ناید باز از راہِ وفا　　حیرتے دارم کہ یار از من چرا دلگیر شد

اے وائے بلبلے کہ بہ گلشن رسید و مرد　　در فصلِ نو بہار رخ گل بدید و مرد
صد حیف زیر دیکہ بہ باغ نشاطِ وصل　　خارِ غمِ فراق بپایش خلید و مرد
قلاش بود بسمل تیغ جفائے دوست　　در خاک و خونِ درد دل اشتبا طپید مرد

دیوانہ وش ز شوق نہ ہر سو شتافتم　　گم کردہ راہ مست دراں کو شتافتم
پُر گوہر است از صدف چشم دامنم　　تا حق بجستن در و لولو شتافتم

جائے سختی نیست بجائے سخنِ من　　پہاں بہ پذیر است سرائے سخنِ من
مشاطۂ اندیشہ ز رنگینئ مضمون　　صد گونہ حنا بست بپائے سخنِ من

در دل غم جانان دغم جاں چہ کنم حیف　　باشند بیک خانہ دو مہماں چہ کنم حیف

دل ز زلف و کاکلِ او کام حاصل میکند　　درمیانِ صد بلا دیوانہ منزل می کند

اینک بجنوں رازِ دلم فاش بر آمد　　در کاسۂ من بود ہمیں آش بر آمد

قاصر

میرزا ببر علی بیگ قاصر تخلص ولد مرزا رستم بیگ مولد و موطنش شاہجہاں آباد و اصلِ بزرگانش سمرقند جدِ باجداو در عہدِ فرخ سیر وارِدِ دہلی شدہ بہ منصبِ لائقہ و بخطاب

مغل خاں سرفرازی یافتہ چوں مشارالیہ از ابتدائے سن بلوغ موزونیٔ طبع داشت دراں ایام چیزے کہ موزوں می کرد آنرا بہ ثناء اللہ خاں فراق می گذرانید۔ درہنگامیکہ از دہلی بہ لکھنؤ رسیدہ واو را فراقِ استاد بمیان آمد بہ سببِ سابقۂ معرفت واتحادیکہ میانِ من وایشاں بود حزم راکار کردہ خواہشِ مشورۂ کلامش بہ فقیر آورد واعتقادیکہ بہ استادِ خویش داشت آنرا بہ پلۂ دوم نہادہ غایب وحاضر مداحِ عاصی است۔ معاش گاہے بہ تجارت وگاہے بہ فنونِ سپہ گری کردہ عمرش بست وپنجسالہ خواہد بود از نتائجِ طبع اوست:-

خوب لگ چھاتی سے ملنا پھر ہمارا ہو نہ ہو — ہے شبِ وصل آج کیا جانے دوبارا ہو نہ ہو
اس لئے کرتا نہیں میں تم سے گستاخانہ ربط — آپ کے دل کو خدا جانے گوارا ہو نہ ہو

فلک کے ہاتھ ہوتے ہیں بناچاری جدا ہم تم — خدا جانے ملیں گے کب گلے لگ لیں ذرا ہم تم

دل سیرِ مسیحا سے ہے بیمار تمہارا — وارستۂ عالم ہے گرفتار تمہارا

جب موجدِ صد شکوۂ انداز ہوئے تم — صد حیف کہ جا غیر کے دم ساز ہوئے تم

دیدۂ جاناں سے تا اُٹھے حجابِ نرگسی — ساغرِ گل میں پلا ساقی شرابِ نرگسی
کیوں گلِ نرگس سے آنکھیں مل کے روتا ہے دلا — کس کی یاد آئی ہے چشمِ نیم خوابِ نرگسی

بہزاد سے جب اس کی ابرو کا نون اترا — تب چشمِ ماہِ نو میں حسرت سے خون اترا

دیکھ کر آبلہ ہائے دلِ بیتابِ سپید — ہو گیا ہے رخِ قاصر . . . سیماب پلید

ہے سپیدی ہی یہ نیرنگیٔ گلشن کا ظہور — اصل رکھتا ہے یہاں ہر گلِ شاداب سپید

مہ وشوں اس کو دکھاؤ ایک نظارا دور سے — دیکھنے آیا ہے یہ عاشق تمھارا دور سے

ان دنوں جوش پہ ہے دیدۂ گریاں اپنا — اے صبا کہیو ٹھکانا کرے طوفاں اپنا

جائے نظارہ سمجھ رشکِ چمن آئینہ میں — شکلِ تصویر کیا ہم نے وطن آئینہ میں

یہ تیغِ یار نے صورت بنائی سینے کی — کہ میں نے ٹانکے کی جا گہ نہ پائی سینے کی

یوں نہاں ہیں مرے ہر داغِ جگر میں سوراخ — زیرِ گل جیسے کہ ہوتے ہیں سپر میں سوراخ

بھلا جو گل ہو لکے پیرہن کو یار تن جانے — نہ کیوں جانِ نزاکت اسکو ہر اک مرد و زن جانے
نگاہِ آرزو سے ہم کناری سمجھ مر جائے — خوشی کیا قاصرِ گستاخ کی وہ گل بدن جانے
نوائے بلبلِ بیدل ہی میں اک درد نکلے ہے — یہ ممکن ہے کہ طرزِ نالہ ہر مرغِ چمن جانے
غزل ایسے کے آگے عرض کرنا لطف ہے قاصرؔ — جو مغزِ شعر سمجھے اور اندازِ سخن جانے

نسیم پر نہ کھلا آج تک کلی کا بھید — کسی ہی پر نہیں کھلتا میاں کسی کا بھید

قادر

سرفراز علی بیگ قادر تخلص شاگردِ عیشی[1] جوانِ مہذب الاخلاق است طبعے رسا و ذہنِ

---

(۱) ن۔ شاگرد طالب علیخاں عیشی۔

ذکا دارد عمرش قریب سی خواہد بود، از وست :-

شراب جلد دے اب پاسِ ننگ و نام نہیں ۔۔۔ یہ ماہِ عید ہے ساقی! مہِ صیام نہیں
مریضِ روزِ ازل کو شفا سے کام نہیں ۔۔۔ کہ زخمِ دیدۂ سوزن کو التیام نہیں
بسانِ کوزۂ دولاب چرخ کے ہاتھوں ۔۔۔ مئے نشاط سے پھرتا ہمارا جام نہیں
کبھی ہوں نالۂ بلبل کبھی ہوں خندۂ گل ۔۔۔ صدا کی طرح مجھے ایک جا قیام نہیں
کسی کے دل میں بنا گھر کہ نام رہ جاوے ۔۔۔ بنائے منزلِ ہستی کو کچھ قیام نہیں
کھنچی ہی رہتی ہے جو تیغِ ابروئے قاتل ۔۔۔ بسانِ تیغِ قضا اس کا بھی نیام نہیں
مجھی کو کر تو تمام اے امیدِ روزِ وصال ۔۔۔ شبِ فراق یہ ہوتی اگر تمام نہیں
سند ہے قصۂ محمود کی کہ الفت میں ۔۔۔ تمیزِ مرتبۂ خواجہ و غلام نہیں
جنوں کا جوش جوانی کے ساتھ تھا قمر ۔۔۔ وہ زور شور نہیں اب نہ دھوم دھام نہیں

قمر

برادرِ کلانِ بندہ علی بطورِ خود نظمِ شعر در زبانِ ہندی و فارسی ہر دو می کند آنچہ از و بہم رسیدہ اینست :-

ہنسا ترا بجا ہے مجھے بے قرار دیکھ ۔۔۔ واقف نہیں تو دل کے مگر اضطراب سے
افتادگانِ کوئے محبت سے پوچھئے ۔۔۔ بہتر ہیں خار و خس انھیں مخمل کی خواب سے
کیونکر نہ رشک سے کفِ حسرت ملوں کہ دل ۔۔۔ مربوط دستِ پیکِ صبا ہے رکاب سے

قمر

قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی ولد فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر مرحوم و مغفور جوانیست گرم خوں و شیریں زبان با شعرا او را از تہِ دل دوستی بود بمقتضائے موزونی

طبع در روزہائے کہ طبعِ لطیفش مائل بہ نظمِ اشعارِ ہندی گردید قمر تخلص گذاشت و برہبری
و بمشورۂ مرزا قتیل کہ او ہم باوصفِ فارسی گوئی دعوئ اردو دانی ریختہ داشت قدم دریں
بیابانِ پُرخار گذاشت و کلامِ خود را بہ تقریبِ مشاعرہ بگوشِ والدِ ماجدِ خود رسانید چوں عاصی
دریں کار زیادہ رسوا ست زیادہ تر دست بدل نزدیکِ ایشاں گردید عمدگی و عمدہ معاشی
خاندانِ علیا از کثرتِ اشتہار محتاجِ قلم و وقائع نویساں نیست از ہر کہ خواہد دریابد سِنِ عمر
شریفش از چہل متجاوز خواہد بود، ازوست :-

کر رحم مرے حال پہ اے یار سمجھ کر — آیا ہوں میں اپنا تجھے غمخوار سمجھ کر
ہے اُس کا ستم عین کرم حال پہ میرے — دیتا ہے مجھے کچھ تو وہ آزار سمجھ کر
قسمت کی یہ خوبی ہے کہ نکلا وہ ستمگر — دل ہم نے دیا تھا جسے دلدار سمجھ کر
یہ کوچۂ جاناں ہے قمر سوچ کے جانا — رکھیو تو قدم اس میں خبردار سمجھ کر

آمد شدِ نفس دمِ خنجر ہے تجھ بغیر — جینا جہاں میں مرگ سے بدتر ہے تجھ بغیر

جلوہ جا جا کے تو ہر دم بلبِ بام نہ کر — اپنے دیدار کو اتنا تو میاں عام نہ کر
گردشِ چشمِ بتاں نے مجھے پامال کیا — عبث اے دل گلۂ گردشِ ایام نہ کر
بال و پر اس کے جلا دے یہی رکھتا ہے مراد — رحم پروانے پہ اے شمعِ گل اندام نہ کر
ہو گئے دیکھ تجھے سارے مسلماں کافر — ڈھانپ لے منہ کو ذرا غارتِ اسلام نہ کر
دمِ آخر ہی اٹھا منہ سے نقاب اے بے رحم — اب تو دیدار سے اپنے مجھے ناکام نہ کر
مجھے توقیر سے کیا کام کہا کس نے کہ تو — قسمتِ عاشقِ حسرت زدہ دشنام نہ کر
آب دیدہ نہ ہو تو نام کو سے لے اس کے — یار کو اپنے قمر خلق میں بدنام نہ کر

ترے وصل کی جا بجا جستجو ہے — جہاں بیٹھتا ہوں تری گفتگو ہے
مروں تو کہیں درد فرقت سے چھوٹوں — مجھے زندگی میں یہی آرزو ہے
دلا گر رہے گی یہی بیقراری — تو پھر دیکھ لیجو نہ میں ہوں نہ تو ہے
مریض غم ہجر مرتا ہے تیرا — اُسے دیکھنے کی ترے آرزو ہے
تڑپتا زمیں پر ہو جس طرح بسمل — وہ نقشہ مرے دل کا اب ہو بہو ہے

اب رات کے آنے کا جو اقرار ہوا ہے — کیا دن یہ ہمیں کاٹنا دشوار ہوا ہے
حالت ترے بیمار کی پہنچی ہے یہانتک — اب سانس بھی لینا اُسے دشوار ہوا ہے
ٹک جا کے ذرا دیکھ تو اے عیسیٰ دوراں — بے طرح قمر ان دنوں بیمار ہوا ہے

سوزن لے مسیحا سے اگر بخیہ گر آوے — سینے سے مرے زخم جگر کے حذر آوے
معلوم نہیں کچھ مرے قاصد کو ہوا کیا — اب دل کو تسلی نہیں جبتک خبر آوے
گنتے میں ستاروں کے کٹیں ہجر کی راتیں — وہ ماہ ہمیں دیکھئے کب تک نظر آوے

ہے سوا کام تمہیں غیروں کی سرگوشی سے — نہ کیا یاد کبھی ہم کو فراموشی سے

حال پر میرے تری یہ مہربانی ہے — کچھ بھی اصل ہے اس کی یا فقط زبانی ہے
اپنا قصہ پر سوز پھر قمر کبھو کہنا — آگ لگ اٹھی تن میں کیسی یہ کہانی ہے

اک بار وہ ہنسا تھا کہیں دیکھ کر مجھے — رونا اُسی ادا کا رہا عمر بھر مجھے
ساقی جھجک نہ جام کو دے کر کے عشق نے — مخمور آنکھ دی ہے تجھے چشم تر مجھے

تیرِ غمِ فراق میں ہو چین کس طرح ۔۔۔ ہمدم ملا سو ایک یہ دل نوحہ گر مجھے
واں گرمِ ناز وہ رہا یاں دل جلا کیا ۔۔۔ دل سوز اس پہ بھی وہ نہ سمجھا قمرؔ مجھے

خط پہ بھی وہ عتاب باقی ہے ۔۔۔ میرے خط کا جواب باقی ہے
مر گئے لیک نبض میں اپنی ۔۔۔ حالتِ اضطراب باقی ہے
مر گئے پیاسے دیکھ تو ساقی ۔۔۔ کچھ بھی خم میں شراب باقی ہے

عشق کی اپنے عبث اس کو خبر میں نے کی ۔۔۔ صاف نادانی کی یہ بات قمرؔ میں نے کی
دن قیامت کا سا درپیش ہے دیکھوں کیا ہو ۔۔۔ شامِ ہجر آج تو رو رو کے بسر میں نے کی

مجھ سے بڑھتا ہی گیا اُس کا غبارِ خاطر ۔۔۔ جوں جوں اُس کو میں قمرؔ خاک بسر میں نے کیا

قوت

میاں احمد علی قوتؔ تخلص خلف الرشید قلندر بخش جرأتؔ جوانِ مہذب الاخلاق است ذہنِ ذکا و طبعِ رسا دارد الحال طبعش بطرفِ سلام گوئی بسیار مصروف گاہ گاہے فکرِ شعر ہم می کند عمرش سی سالہ خواہد بود، از وست :-

کیا جانے کس اچپل کا ہے مائل کئی دن سے ۔۔۔ جوں دانہ ملا خاک میں بس دل کئی دن سے
الفت نے کیا ایک اب اپنا لہو پانی ۔۔۔ ہے خونِ دل اشکوں کے جو شامل کئی دن سے
خوں ریزیِ قاتل کا جو رہتا ہے خیال آہ ۔۔۔ آتے ہیں نظر خواب میں بسمل کئی دن سے
یہ مجنوں کی حالت ہے کہ پی جیسے ہو ناقہ ۔۔۔ دیکھا جو نہیں لیلیٰ کا محمل کئی دن سے
اب جائیں کہاں جوششِ گریہ کی بدولت ۔۔۔ دریا ہے ہر اک سمت سے حائل کئی دن سے

ہر کام پہ جس جا نظر آتی ہے صد آفت — در پیش ہے وہ عشق کی منزل کئی دن سے
بے وصل میاں زیست ہو کیونکر بخدا آہ — ہے مرگ و قضا اپنے مقابل کئی دن سے
کہہ اس پہ غزل اور بدل قافیہ اور بحر — قوت مرا دل جس پہ ہے مائل کئی دن سے

بندھتے ہیں وہاں ہم پر بہتاں کئی دن سے — ہے اور طرف اُن کا اب دھیان کئی دن سے
لیتے جو نہیں دل میں تم جان کئی دن سے — بستی مجھے لگتی ہے ویران کئی دن سے
لو جلد خبر پیارے اس بے سر و ساماں کی — ہے جی میں گذرنے کا سامان کئی دن سے
بیمار تمہارا اب مرتا ہے نہ جیتا ہے — ہونٹوں پہ تو ہے اُس کی اب جان کئی دن سے
اے کاش کہ وعدے پر وہ کافر آ کر دے — قوت مجھے جس کا ہے اب دھیان کئی دن سے

قربت

غلام نبی خاں قربت تخلص ولد عمران خاں حافظ قرآن عموزادہ و شاگرد مستقیم خاں وسعت است در رام پور مولد و مسکن اوست عمرش بست و ہفت سالہ خواہد بود منتخب اشعار اوست:۔

کیوں دینے میں بوسے کے یہ انکار نیا ہے — کچھ میں ہوں نیا آج کہ تو یار نیا ہے

آفت وہ ہنسی ہے لب خنداں ہے قیامت — ہر بات میں اک اُس کی نمایاں ہے قیامت
قربت ہمیں کیا کام رہا روز جزا سے — ہم پر تو ابھی یہ شب ہجراں ہے قیامت

بن لئے بوسہ دیا دل نہ اُسے قربت نے — کام میں اپنے یہ ہشیار نظر آتا ہے

غیر کو بوسہ کرو امداد یونہی چاہیئے
داد یونہی چاہیئے بیداد یونہی چاہیے

قید کرنا فصلِ گل میں اور خزاں میں چھوڑنا
واہ وا رحمت تجھے صیاد یونہی چاہیے

کس دن ہمارے چشم سے دامانِ تر نہیں
کس(۱) روز آہ و نالہ سے ٹکڑے جگر نہیں

بحرِ جہاں میں ہم تھے مثالِ حباب آہ
اک دم کی زیست اپنی ہوئی پھر خبر نہیں

ردیف (ک)

کرم

کریم اللہ خاں کرم تخلص ساکنِ رامپور، شاگردِ مولوی قدرت اللہ شوق ماموئے احمد خاں غفلت است، عمرش چہل سالہ خواہد بود۔ از وست:۔

لبوں پر اپنے ذکرِ منحرفیں یار بہتر ہے
اسی ہائے دو چشمی کا سبق ہر بار بہتر ہے

کسی یاقوت لب کے ہاتھ سے بہتر ہے مرجانا
گلے پر اس کے خوں گردن پہ یاں تلوار بہتر ہے

بندگی لیجئے صاحب میں اب رخصت ہوں
پھر جو آؤں تو بڑا ہی کوئی بے غیرت ہوں

ہاتھ سے میرے وہ دامن کو جھٹک کر بولا
یہی مرضی ہے تمہاری کہ میں بے حرمت ہوں

عزو تکریم مری یوں تو ہے غیروں میں بہت
پر یہی ڈر ہے کہ لوگو نہیں نہ بے عزت ہوں

حرفتیں آپ کی ساری مرے ناخن میں ہیں
چھوٹی سی عمر میں میں بھی تو بڑا آفت ہوں

---

(۱) ن۔ کس رات آہ و نالہ الخ

کرامت

میر خیرات علی کرامت تخلص شاگردِ میاں حسرت وجرأت جوانِ مہذب الاخلاق است ازیں پیش در ابتدائے ریعانِ جوانی چیزے موزوں می کرد، بزرگانش ساداتِ موسوی بودند و توطن در شاہجہاں آباد داشتند خودش در لکھنؤ تولد ونشو ونما یافتہ بسبب لکنتِ زبان از خواندنِ شعر معذور اگر می خواند مردم می خندند عمرش قریب بچہل و پنج سال خواہد بود، از وست:۔

وہ شب اپنی زلفیں سنوارا کیا میں ہر پیچ پر جان وارا کیا
ہوئی حشر برپا مری خاک پر میاں تو نے جس دم گذارا کیا
خبر پوچھنے سے ترے جی اٹھا مجھے زندہ تو نے دوبارا کیا

وصل میں گل ہی کے یاروئے مرجاناتھا لائق اس عشق کے بلبل نہیں پروانا تھا
خال وخط ہی میں گرفتار رہے جیتے جی اپنی قسمت میں یہی دام یہی دانا تھا

دل مرا جی ہی لینے والا ہے میں نے دشمن بغل میں پالا ہے

جو قول وقرار تھے آپس کے وہ دونوں طرف موقوف ہوئے
تم اور طرف مصروف ہوئے ہم اور طرف مالوف ہوئے

کوثر

میرزا مہدی کوثر تخلص شاگردِ شیخ[1] امام بخش ناسخ نوجوان است پیش ازیں بہ ترغیب

---
(۱) ن پسر مرزا قطبی۔

میاں ہاتف کہ یکے از دوستاں بودند در حویلیٔ راجہ جھاولال مشاعرہ ہم میکرد فقیر نیز یک دو بار دراں مجلس رفتہ، عمرش بست سالہ خواہد بود ، از وست :-

بے گناہوں پہ تو جیسا کہ ستم کرتا ہے ظلم ایسا نہ کرے کوئی گنہ گاروں پر

جب نہ ہو اُن کو ترا شربتِ دیدار نصیب خاک جینے کا گماں ہو ترے بیماروں پر

دردِ فرقت سے نہ رویا کبھی نالہ نہ کیا نہ کھلا راز مرے دل کا کبھی یاروں پر

جبکہ ہو ساقیٔ کوثر سا شفیع اے کوثر بخشے جانے کا یقیں کیوں نہ ہو مےخواروں پر

تیغ مجھ پر لگا نہیں جب آ میرا جھگڑا چکا نہیں جاتا

دم مرا آ رہا ہے آنکھوں میں اب بھی صورت دکھا نہیں جاتا

ابر کی طرح اُس کے کوچے سے کون روتا ہوا نہیں جاتا

نہ اٹھا ہم کو اُس کے کوچے سے ناتواں ہیں اٹھا نہیں جاتا

بدلے مرہم کے میرے زخموں پر تیغ بھی وہ لگا نہیں جاتا

کیا مجھے ہو گیا خدا جانے اب بن اکدم رہا نہیں جاتا

ہر گھڑی غیر کا نہ کر ند کور یہ تو ہم سے سنا نہیں جاتا

آپ کھاتا ہے روز غیر . . . زہر مجکو کھلا نہیں جاتا

گو بتوں کے ہیں معتقد لیکن دل سے خوفِ خدا نہیں جاتا

گلشنِ کوے یار میں کوثر کون مثلِ صبا نہیں جاتا

ان کی کب مجھ پر مہربانی ہے مہربانی یہ سب زبانی ہے

کیا خوش اسلوب خم ہے ابرو میں تیغ شاید یہ اصفہانی ہے

تجکو کیونکر کہوں نہ لاثانی کون عالم میں تیرا ثانی ہے

ہم سے رہتا ہے وہ خفا کوثر — اور غیروں پہ مہربانی ہے

ہماری کوئی نہیں سنتا اے بتان فریاد — تمھارے ہاتھ سے جاکر کریں کہاں فریاد
جو یاد میں تری زلفوں کی میں تڑپتا ہوں — تو کرتی ہیں مرے پاؤں کی بیڑیاں فریاد
یقیں ہے پہنچے نہ آواز اپنی کانوں تک — کریں فراق میں گر ہم سے ناتواں فریاد

کافر

میر علی نقی کافر تخلص
کون اس سے مرے درد کی یا رو خبر کرے — شاید کہ آہِ نیم شبی کچھ اثر کرے

کیوانؔ (۱)

میرزا مغل کیواںؔ تخلص ساکن لکھنؤ تازہ خیال است، شاگردِ شیخ محمد واجد است بست سالہ عمرش خواہد بود:۔

شعلہ رو کو گلے لگاؤں گا — شمع کو اشک سے جلاؤں گا
تیغ ابرو ہے صورتِ محراب — سجدہ کرنے کو سر جھکاؤں گا

صبح وہ مہ بام پر سے منہ دکھا کر رہ گیا — آفتابِ حشر ایک نیزہ پہ آکر رہ گیا

---

(۱) نسخۂ رامپور میں ردیف کاف کے ضمن میں کیوانؔ کا ذکر زیادہ ہے جو اس نسخہ میں نہیں۔

ردیف (گ)

گلشن

جیالال کائتھ گلشن تخلص شاگرد تازہ خواجہ حیدر علی آتش غریب و صلاحیت شعار است عمرش تخمیناً بست سالہ خواہد بود وطنش لکھنؤ است، از وست:۔

سودائے گیسوئے سیہ یار ہو گیا
آزاد تھا جو دل سو گرفتار ہو گیا

آواز پائے یار اگر خواب میں سنی
سویا تھا صبح تک جو میں بیدار ہو گیا

مجلس میں جس طرف تری ترچھی نظر پڑی
اک تیر تھا کہ توڑ کے صف پار ہو گیا

سیر چمن کو یار جو آوے تو دیکھنا
آنکھوں میں عندلیب کے گل خار ہو گیا

ابنائے جنس سے جو اٹھائیں اذیتیں
صورت سے آدمی کی میں بیزار ہو گیا

دل پھنستے ہی گھبرا کے لگی جان نکلنے
الفت کے مرض نے نہ دیا ہم کو سنبھلنے

آزاد کرے تو جو گرفتار ازل کو
قمری کے گلے میں سے لگے طوق نکلنے

دونوں طرف اک آگ لگاتی ہے محبت
پروانہ تو جلنے لگے اور شمع پگھلنے

حال دل بیتاب جو کہئے تو کہے یار
بیچین کیا ہے مجھے گلشنؔ کی غزل نے

بہار آئی شگوفہ پھولا کھلا ہے تختہ ہر اک چمن کا
کہیں تماشائے یاسمیں ہے کہیں تماشا ہے نسترن کا

کوئی ہے مانند شمع گھلتا کوئی ہے پروانہ وار جلتا
نہیں جو وہ روشنی محفل عجب ہے احوال انجمن کا

یہ چشم و ابرو جو گل کے ہوتے رہا تھا رخ سے یہ فرق باقی
جو بو نہ ہوتی تو سے جکا تھا یہ غنچہ دھوکا ترے دہن کا

جو یاد آیا وہ رنگے رنگیں ہے یہ آنکھوں سے اشک خونیں
کہ ہو گیا ہے رگ گل تر ہر ایک تار اپنے پیرہن کا

قدم دھرا ہی جو عاشقی میں تو نیستی کو سمجھ لے ہستی
عزیز کرتا جو جان شیریں تو نام ہوتا نہ کوہکن کا

یہ عالم کاہشِ غم سے ہی اپنی ناتوانی کا
کہ یاروں کو تعجب ہی ہماری زندگانی کا

قدِ رعنا صنوبر زلف سنبل چہرہ لالہ ہے
بہارِ باغ ہے عالم ترے جوشِ جوانی کا

جلا دیتا ہے مثلِ برق خرمن دل رقیبوں کے
اثر ہے اپنے نالہ میں بلائے آسمانی کا

زبس حالِ زبوں نے یار کو اکثر ہنسایا ہی
رقیبوں کو حسد ہے میرے رنگِ زعفرانی کا

ضرر پہنچا سکے کب صاحبِ اقبال کو دشمن
نہ ہووے آتشِ یاقوت کو اندیشہ پانی کا

دلِ شیدا کی حالت پوچھیے گلشن تو کہتا ہی
گلہ کس منہ سے کیجے یار کی نامہربانی کا

الفت جو ہم کو تجھ سے اے مہرباں نہ ہووے
دل لے کے تو ہمارا خواہانِ جاں نہ ہووے

مرنے سے جو ڈرے گا الفت وہ کیا کرے گا
عاشق وہی ہی جس کو کچھ خوفِ جاں نہ ہووے

ہر شعر وصفِ روئے گل رنگِ یار میں ہے
گلشن بھلا تو کیونکر رنگیں بیاں نہ ہووے

آہ و نالے نے کچھ اثر نہ کیا
ہجر کی شام کو سحر نہ کیا

یار نے گھر کیا مرے دل میں
یار کے دل میں میں نے گھر نہ کیا

یاد آئے کبھی نہ ہم تم کو
بھول کر بھی ادھر گذر نہ کیا

کانپتا ہی وہ دل غضب سے ترے
جس نے اے بت خدا کا ڈر نہ کیا

جان کا کوچ ہووے گا لیکن
غم و اندوہ نے سفر نہ کیا

تشنہ کامی سے مر گیا گلشن
دہنِ خشک میں نے تر نہ کیا

گہر

میرزا امداد علی گہر تخلص از دو جا فیض یافتہ یکے منصور خاں تہر و دوم میرزا میر ناصر مرحوم مغفور شعر را معنی بندانہ می گوید عمرش بست و دو سالہ خواہد بود انچہ ازو بہم رسیدہ اینست :-

خار ہوں میں گرچہ باغِ انتظارِ یار کا / ہو ہراک برگِ خزاں نرگس مرے گلزار کا

مثلِ تصویرِ نہالی غش میں رہتا ہے مدام / یہ ہوا ہے حال تیرے ہجر کے بیمار کا

کوئی دل ایسا نہیں جو لا سکے تابِ جمال / چشم کو کس کی ہے یارا یار کے دیدار کا

اشکِ خوں آنکھوں سے یادِ گلرخاں میں ہیں رواں / تختۂ دامن مرا اک تختہ ہے گلزار کا

کاوشِ مژگانِ دلبر یاد آتی تھی ہمیں / وادیٔ وحشت میں تھا صدمہ جو پا کو خار کا

بوئے گل کی طرح جاوے جان سوئے دشتِ وصال / وحی کی مانند نازل ہو جو نامہ یار کا

سر پہ کھینچے تیغ قاتل میرے رہتا ہے کھڑا / عشق جب سے ہو گیا ہے ابروئے خمدار کا

آفتابِ حشر تیرا کیا کرے گا اے گہر / ہے تجھے کافی وسیلہ حیدرِ کرار کا

اُٹھ سکے بارِ گراں نازک مزاجوں سے کہاں / دل مرا رنج و الم کے کوہ کا حامل نہیں

ہر گھڑی سمجھاتا ناحق ہے تو مجھ بدنام کو / ناصحا میں کیا کروں قابو میں اپنا دل نہیں

آہ سے جاوے ہوا اور شعلہ ہے سب جسمِ زار / اپنی خلقت ہی میں شاید خاکِ آب و گل نہیں

بوجھ سر کا دوش پہ کوہِ گراں سے ہے فزوں / کیا کہیں اس دہر میں اپنا کوئی قاتل نہیں

اے گہر دل آن نہ زلفِ عنبریں میں تو پھنسا / بے وفائی کے سوا خوباں سے کچھ حاصل نہیں

گوہر

میرزا شیر علی بیگ گوہر شاگرد عشقیؔ[1] خوش فکر است، در روزہائے کہ فقیر اکثر بمکان او می رفت مشارٌالیہ را می دید آخر آخر بعد چندے بمرتبہ منشی گری رسیدہ از یاران مجلس روپوش شدہ چوں سرے بنظم گہر داشت آنرا ہم فراموش نہ کرد دریں نزدیکے روزے در مشاعرہ میر صدر الدین او را از دور دیدم سرخ و سفید شدہ و ہزال بفربہی مبدل گشتہ عمرش قریب پنجاہ خواہد بود، ازوست :-

ترے خیال سوا دل کو کوئی کام نہیں
لب و زباں میں ترے نام بن کلام نہیں

تمھیں تو ایک سخن پر کبھی قیام نہیں
جب آئی صبح کہا ہاں جب آئی شام نہیں

رہِ طلب کی درازی کا کیا بیاں کیجے
تمام ہم ہوئے منزل ابھی تمام نہیں

کرو نہ مرہم تدبیر کو ابھی ضائع
جراحتِ دلِ گوہر کو التیام نہیں

گریاں

کنور بہادر گریاں تخلص

مدت سے ڈھونڈتا ہوں کروں کیا بیانِ داغ
دل ہی نہیں ملے ہی سلے کیا نشانِ داغ

گر صبر ہی ہم کو یار ہووے
جوں برق نہ اضطرار ہووے

ہرگز نہ ملیں کسی سے یہاں ہم
گر دل پہ کچھ اختیار ہووے

اب صاف ہی صاف کہدے ہمکو
گر دل میں ترے غبار ہووے

آنسو نہیں رستے روتے گریاںؔ
کیونکر کوئی اشکبار ہووے

---

(۱) ن۔ شاگرد طالب علیخاں عیشیؔ

ردیف (ل)

لکنت

محمد بشیر خاں ولد محمد معصوم خاں متوطنِ رامپور عم زادہ وشاگردِ مستقیم خاں وسعت جوانِ مجمع الاخلاق است از باعثِ لکنتِ زبان لکنت تخلص می نماید عمرش بست و هفت(۱) ساله خواهد بود، از وست :-

دل پر کچھ اس قدر ہوئی تاثیر زلف کی
رہتی ہے اپنی آنکھوں میں تصویر زلف کی

دل تو لیا نگہ نے کسے دوش دیجئے
خط کی نہ کچھ خطا ہی نہ تقصیر زلف کی

فدا حبیب سی ہوئے اس گلبدن کے
ہزاروں ہم نے کھائے گل بدن کے

خبر کسی کی کسی نے جو کچھ سنائی رات
تو اس خیال میں ہم کو نہ نیند آئی رات

رواں ہی چشم سے خوں آج اس سبب کہ ہمیں
نظر پڑا تھا کوئی پنجہ حنائی رات

خیالِ زلف و رخ اس کے کیا کہوں لکنت
کبھی دکھایا ہمیں دن کبھی دکھائی رات

تصور کر مژہ کا دل میں اس گلرو کے رُتے ہیں
عزیزو ہم یہ اپنے حق میں کانٹے آپ بوتے ہیں

میں دیوانہ ہوں اس کہنے کا جب در پر پکار آیا
تو فرمایا کوئی کہہ دو کہ اب تو آپ سوتے ہیں

نہ جانیں کس کی سمرن یاد آئے ہی کہ رو رو کر
مژہ سے آنسوؤں کے ہم جو یہ موتی پروتے ہیں

کفِ دستِ بتاں پر تم نہ سمجھو رنگ مہدی کا
سدا یہ خونِ عشاقوں سے اپنے ہاتھ دھوتے ہیں

---

(۱) ن - بست و دو -

مرا ملنا: ہرگز چھوڑیو لوگوں کے کہنے سے ‏ ‏ تجھے جو منع کرتے ہیں بھلا وہ کون ہوتے ہیں
غضب ہے وہ نہیں واقف کہ غم میں جسکی ہم اب تو[1] ‏ ‏ تڑپتے ہیں بلکتے ہیں اور اپنی جان کھوتے ہیں

گل نہ جب اُس کے کفِ پا کے برابر ہو سکے ‏ ‏ کون پھر ایسا ہی یہاں جو اُس کے ہمسر ہو سکے
ماہ کو نسبت نہیں چہرے سے اس کے پھر بھلا ‏ ‏ کب مقابل کان کے موتی سے اختر ہو سکے
خوشنما اُس ابروئے خمدار میں ایسے ہیں بال ‏ ‏ تیغ میں ایسی صفائی سے نہ جوہر ہو سکے
تیرے رونے سے یہ ڈر ہے غرق ہو جائے نہ خلق ‏ ‏ ضبطِ گریہ کیجیو گر دیدۂ تر ہو سکے
اُس لبِ شیریں کی تو زنہار کچھ پوچھو نہ بات ‏ ‏ کب برابر اُس کے یہ قندِ مکرر ہو سکے
بندگی کرنا خدا کی خوب ہے لکنت یہ بات ‏ ‏ ترک ملنا ان بتوں کا کیجئے گر ہو سکے

ردیف (م)

مفتوں

شیخ غلام مرتضیٰ چودھری رردولی مفتوں تخلص عمرش قریب سی سال خواہد بود بمقتضائے موزونی طبع چیزے موزوں می کند آشنای قاسم علی است، از وست:-
تم غیر کی لے شال کو جب تان کے سوئے ‏ ‏ ہم گورِ غریباں ہی میں بس آن کے سوئے

مہدی

مہدی علی مرادآبادی قوم شیخ سکنۂ مراد آباد، جوانِ قابل و داناست و رفارسی

(۱) ن - بجائے اب تو، لکنت

وہندی ہر دو زبان فکر می کند و بر شاعری خود غرور کمال دارد روز ہائیکہ از شہر خود در لکھنؤ گذر افگند بہ ملاقاتِ فقیر ہم آمدہ بود عمرش تخمیناً از سی متجاوز خواہد بود ، از وست :۔

اِک شور تازہ ہو تپشِ دل کو دیکھ کر　　محشر تڑپ اُٹھے ترے بسمل کو دیکھ کر

جو اشک نہ ہو خوں مرے دامن پہ نہ آوے　　جو شمع نہ ہو گل مرے مدفن پہ نہ آوے

از بسکہ شبِ وصل میں جلدی ہی سحر کی　　چوٹی پہ یہ قدغن ہی کہ گردن پہ نہ آوے

مائل

میر ہدایت علی مائل تخلص ، از وست :۔

آتا ہے دمبدم یہی رونا یہاں سبھے　　پھینکا فلک نے ہائے کہاں سی کہاں مجھے

مائل

مائل تخلص شاگرد میر غلام علی عشرت بریلوی در ایامیکہ بہ لکھنؤ گذر افگندہ احتیاطاً اکثر غزلِ خود را بہ نظرِ اصلاحِ فقیر گذرانیدہ عمرش سی سال خواہد بود ، از وست :۔

اس مہ کو دیکھ آئینہ حیران رہ گیا　　سنبل بھی دیکھ زلف پریشان رہ گیا

سب ہمصفیر منزلِ مقصود کو گئے　　میں پا شکستہ بے سر و سامان رہ گیا

وہ ایک آن میں آن کر توڑتا ہے　　تصور جو ہم سالہا باندھتے ہیں

جنوں مجکو ہے یا جنوں ہم دموں کو　　جو زنجیر سے دست و پا باندھتے ہیں

نہ مل غیر سے اس لئے ہاتھ اپنے　　ترے آگے اے دلربا باندھتے ہیں

لپٹا ہوں میں خود بہ خود پیچ کھا کھا　　جو.... وہ نام خدا باندھتے ہیں

محبت کے عقدے ہزاروں ہیں نہ کھلتے
تصور جو اس کا ذرا باندھتے ہیں
جو مائل ہیں دل سے کسی اپسکلی پر
وہ مضمون ہی اپسلا باندھتے ہیں

مائل

سید مدو علی مائل تخلص، سادات علوی ساکن امیٹھی طبع رسا و موزوں دارد چند ماہ از شاہ ملوک اصلاح شعر گرفتہ بود، ایں ابیات طبع زاد اوست :-

شدہ مرغ خوش الحاں خامش از آہ و فغان ما
لب گل غنچہ گردد بشنود گر داستان ما

خوشا عشقے کہ از ہستی رہائی می دہد مارا
بمنزل گاہ قرب حق رسائی می دہد مارا

برتبۂ برسانید عشق شان مرا
ملک بدیدہ کشد خاک آستان مرا

غمزۂ چشم بتاں آفت جانست مرا
دل ازیں دشنۂ خوں ریز طپانست مرا

بہ شوق روئے تو گل چاک زد گریباں را
چو دید رنگ تو رنگے نماند بستاں را

سوزد ز آتش غم ہجر تو داغ ما
روغن ز خون دیدہ بود در چراغ ما

ہمائے وحد تیم بخت .... آشیاں را
بریز و در ہوائے ما پر پرواز عنقا را

ز شمع روئے تو آتش بہ محفل افتادہ است
بہر طرف پر پروانۂ دل افتادہ است

گردوں خراب گردش چشم سیاہ کیست
برہم زن زمانۂ عاشق نگاہ کیست

مرا بسیر و تماشائے باغ کارے نیست
کہ بہتر از دل پر داغ لالہ زارے نیست

لعل نوشین تو دیدم مین از یادم رفت
بوئے زلف تو شنیدم ختن از یادم رفت

اجل فریاد کش بہر مبارکباد می آید
چو بہر کشتنم خنجر بہ کف جلاد می آید

بتانکہ از نگہے سنگ آب می سازند
فغاں کہ خانۂ مردم خراب می سازند

در تنم تا لب جاں بخش تو جان پیدا کرد
مردہ از سایۂ من روح رواں پیدا کرد

دارم ز اشک لخت دل ازیں چشم طوفاں در بغل
در عدن در آستیں لعل بدخشاں در بغل

زخود غافل بہ بزمِ آں پری رخسار من بودم　　بکارِ خویشتن دیوانہ ہشیار من بودم

در آغوشم شب آمد بادہ پیما کج کلاہِ من　　زمستی در ہوا رقصد برنگِ گل کلاہِ من

برقع از روئے جہاں تاب اگر باز کنی　　ماہ و خورشید ز عالم نظر انداز کنی

مجروح

منشی کشن چند مجروح تخلص پیش از آمدنِ فقیر در لکھنؤ صاحب مشاعرہ بود۔

از وست :۔

نہ سیرِ باغ نہ گلگشتِ لالہ زار کروں　　یہ آرزو ہی تماشائے روئے یار کروں

مرزا

احترام الدولہ محمد حسین خاں معروف نواب مرزا مرزا تخلص از حالش خبر نہ

دارم۔ از وست :۔

صدمۂ غم نیا ہے اے ناصح　　جی ٹھہرتے ٹھہرے گا

مرزا

آغا میرزا مرزا تخلص شاگرد میر محمد تقی میر، جوانِ مہذب الاخلاق است مولدش

لکھنؤ و طبعش در گفتنِ شعر روائی تمام دارد و در استاد پرستی بے نظیر دیدمش از ابتدائے

ملاقات بایں فقیر بنظر یک وضع دیدمش عمرش قریب بہ چہل خواہد بود، از وست :۔

بہارِ رخ اس کی ہے دیدن کے قابل　　گلِ حسن اس کا ہے چیدن کے قابل

کھنچے ہے جو معشوق عاشق سے اپنے / بغل میں وہی ہے کشیدن کے قابل
نہ پہنچے کبھو ہائے قدموں تک اُس کے / مرے ہاتھ ہیں یہ بریدن کے قابل
کہانی نہ کہواؤ ہجراں کی ہم سے / . . . نہیں ہے شنیدن کے قابل

گلی سے یار کی کیوں بوالہوس نہ ہٹ جائیں / قدم جو آگے بڑھاویں تو کونچیں کٹ جاویں
دیا نہ چرخ نے مہ کا سا بھی کمال و زوال / کہ نصف ماہ بڑھیں نصف ماہ گھٹ جاویں
وہ دانہ ہائے سرشک اپنے بے بہا دُر ہیں / کہ جن کو دیکھے تو دیدۂ صدف کے پھٹ جاویں
دلا سخن کا نہیں اعتبار خوباں کے / ادھر یہ بات کہیں اور اُدھر پلٹ جاویں
کہانی عشق کی مرزا مری پریشاں ہے / سُنے سے خلق کی نیندیں نہ کیوں اچٹ جاویں

بولا برہم ہو کے بولا میں جو اس کی بات میں / آپ بھی دینے لگے اب دخل معقولات میں
مجکو روتا چھوڑ کر اے یار جاتا ہے کدھر / گھر سے باہر کوئی بھی نکلے ہے اس برسات میں
زلف کو رُخ سے اٹھاتا گر نہ وہ خورشید رو / یک سرِ مو فرق ہو سکتا نہ دن اور رات میں
کس کمین میں اے کمینے اس قدر ہے رات دن / کچھ خبر بھی ہے قضا تیری لگی ہے گھات میں
آگے اے مرزا نہ تیری وضع رندوں کی سی تھی / گھر بنایا تو نے بھی جا کر مگر باغات میں

تدبیر بشر کی یہاں زنہار نہیں چلتی / تقدیر کے آگے کچھ اے یار نہیں چلتی
مژگاں کے بھی تیروں کے ہوتے ہیں تہی دستے / ابرو کی فقط ہم پر تلوار نہیں چلتی
مجنوں کی عیادت کو سب جاتے ہیں اے لیلیٰ / کیسی ہے تو عاشق کی غم خوار نہیں چلتی
رندوں کی زبس دھولیں کھاتا ہے تو اے زاہد / دو دن بھی ترے سر پہ دستار نہیں چلتی
دیکھ اُس کو تجھے مرزا ہو جاتی ہے خاموشی / کیوں منہ میں زباں وقتِ گفتار نہیں چلتی

سوزن جو اُس مژہ کی یاد آگئی تو ہمدم — چاکِ جگر کو اپنے ہم بھی رفو کریں گے
اے جوہری نہ ہرگز تو دُرجِ دُر کو وا کر — آنسو مرے گہر کو بے آبرو کریں گے
فرصت جو ایک دم کی پاویں گے غم کے ہاتھوں — گم گشتہ اپنے دل کی ہم جستجو کریں گے
دنیا نے پشت ادھر کر پھیرا ہے منہ کو اپنے — ہم بھی نہ اس کی جانب زنہار رو کریں گے
تو بد بر اپنے دل میں اے عندلیب مت ہو — ہرگز نہ اُس کے ہوتے ہم گل کو بو کریں گے
عاشق کی تب پڑھیں گے خوباں نمازِ میت — جب قتل کر کے اُس کے خوں سے وضو کریں گے
بے ذکرِ یار مرزا جینے کا لطف کیا ہے — جب تک کہ تن میں دم ہے یہ گفتگو کریں گے

آذر بنائے لاکھ صنم سل تراش کے — اس بت کے ایک ہو نہ مقابل تراش کے
جام بلور کی یہ چمک چاندنی میں تھی — گویا رکھا ہے لالہ کامل تراش کے

پہچانے تا نہ کوئی کہ یہ کس کی لاش تھی — سر تن سے لے گیا مرا قاتل اتار کے

مشتاق

میر حسن مشتاق تخلص ازوست :-

اپنی ہم بندگی پہ بھولے تھے — پر جو دیکھا وہاں خدائی ہے

مشتاق

میرزا ابراہیم بیگ مشتاق تخلص

موئے دامِ محبت میں تو اپنی داد کو پہنچے — نہ کر افسوس اے صیاد ہم فریاد کو پہنچے

منتظر

خواجہ منتظر تخلص از متوسطین است، از وست :-

تیرے تھے میاں خواہ برے خواہ بھلے ہم
لے یار تو خوش رہ کہ ترے در سے چلے ہم

بیخود اتنا ہے نہ کچھ ایما نہ کچھ تقریر ہے
منتظر کے ہاتھ میں شاید تری تصویر ہے

مجنوں

میر حمایت علی مجنوں تخلص

ڈرنا ہی مناسب تھا خونخوار کی آنکھوں سے
مارا نہ مجھے آخر کس پیار کی آنکھوں سے

محسن

محمد محسن محسن تخلص

مرا رنگ رو اس قدر زرد ہے
کہ یہاں زعفران زار بھی گرد ہے

مخلص

میر باقر عرف مخلص علی خاں مخلص تخلص

آئینہ رو کے دل میں کوئی آہ کیا کرے
دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کرے

مستمند

یار علی خاں مستمند تخلص

لگی ہے جس طرح میری دلِ بیتاب میں آتش — نہ دیکھی ہوگی تو نے شمع ایسی خواب میں آتش

ممتاز

حافظ علی ممتاز تخلص

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا — ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

مقبول

مقبول نبی مقبول تخلص

پھیرے خدا رقیبوں سے جی میرے یار کا — اتنا ہی مدعا ہے دلِ بے قرار کا

مذنب

میرزا محمد حسن عرف چھوٹے میرزا مذنب تخلص خلفِ میرزا حسن جوانیست خوش تحریر و خوش تقریر از ابتدائے بلوغ ہمت بہ تحصیلِ علوم گشتہ و در ہر فن بقدرِ حال استعداد پیدا کردہ خصوص در روایات خوانی جناب سید الشہدا علیہ السلام دستے تمام دارد و از عہدۂ آں خوب بر می آید کتابہائے دینیہ را اکثر دیدہ و رسیدہ در تطبیقِ عباراتِ ماتمیہ و پیوند دادنِ روایاتِ مختلفہ ذہنش بدرستی نفوذ می کند ہر چند خود را بہ نظمِ شعر ہم مصروف داشتہ اوسی و دو سالہ خواہد بود۔ از وست :-

جو کھا کے پان مری لاش پر گیا قاتل — مرے عزیزوں نے میرا وہ خوں بہا سمجھا
ہوئی جو میرے دلِ مضطرب کو کچھ تسکیں — میں اپنے نالوں کو وقتِ سحر دعا سمجھا

جب نظر آ گیا وہ شوخِ طرحدار ہمیں — رنگ دکھلانے لگا دیدۂ خونبار ہمیں

خاطرِ اغیار کی منظور ہو جس دلبر کو
خود بخود کیوں نہ وہ ٹھہرائے گنہگار ہمیں

اب جو پھر ملنے کا ہم سے نامۂ پیغام ہے
نامہ بر کہیو تمھارا یہ خیالِ خام ہے

منحرف جس وقت ہم سے یارِ پرفن ہو گیا
اپنا ہی دل آخر اپنے جی کا دشمن ہو گیا

جی میں آیا تھا یہ اک دن راہ میں ٹھہرائیے
پر ہوا اک آن میں اُس گل کا توسن ہو گیا

دیکھ اے رشکِ چمن اس کی کبھی آکر تو سیر
گلشنِ لالہ ترے کشتے کا مدفن ہو گیا

عشق کرتے اب کسی سے عار آتی ہے ہمیں
کیا کریں مستعملِ اجلاف یہ فن ہو گیا

سر رکھا یار کے قدموں پہ جھکا کر اپنا
تو بھی اس نے نہ نکالا کبھی خنجر اپنا

ہر طرح اس کی اطاعت میں رہے مصروف ہم
نہ ہوا ہائے کسی طرح وہ دلبر اپنا

نخوتِ حسن سے ہرگز نہ دیا اُس نے جواب
حالِ دل ہم نے کہا اُس سے مکرر اپنا

کوچۂ یار میں ٹھہرے تو کہا یوں اس نے
در پہ میرے نہ لگانا کہیں بستر اپنا

تا دمِ نزع نہ بر آئے امیدِ دلِ زار
شکوہ کیا کیجئے یوں ہی تھا مقدر اپنا

لاکھ اگر صدمے ہوں اِک آہِ رسا کرتی نہیں
تیرے بیمارِ غمِ ہجراں دوا کرتے نہیں

عاشقِ بیچارہ سب صورت سے حاضر تھا ولے
کیا کرے معشوق ہرجائی وفا کرتے نہیں

عاشقی میں اب یہ ہم پہنچا ہے ہم کو امتیاز
ہر کس و ناکس کو مذہب آشنا کرتے نہیں

ابتدائے ترکِ الفت میں بہت بیتاب تھا
رفتہ رفتہ اب مرے دل کو قرار آنے لگا

ہے مجکو عشق کا آزار پہچانا نہیں جاتا
ہوا ہوں اس قدر بیمار پہچانا نہیں جاتا

خراشِ ناخنِ غم اس طرح چہرے سی ظاہر ہے
کہ اس کا طالبِ دیدار پہچانا نہیں جاتا

صفائی عارضِ گلگوں کی زائل ہو گئی آخر
نمایاں خط ہوا دلدار پہچانا نہیں جاتا

گریباں میں رفوگر نے کیا ہی جو رفو مذنبؔ
تم ایسا روئے ہو ایک تار پہچانا نہیں جاتا

میں حیرت میں ہوں سوزِ عشق کیونکر ہو گیا ظاہر
وہ ایسا کونسا تھا جس نے دل کا آبلہ دیکھا

بہت سے آشنا اشفاق سی تھے مانعِ الفت
نہ سمجھے اول آخر چاہ کا ہم نے مزا دیکھا

خواب میں شب اُس گل نے پایا سی ہم آغوش تھا
تا سحر بستر سے میرے بوئے گل کا جوش تھا

حال زار افسوس مذنبؔ کا نہ پوچھا یار نے
گل کا جب دیکھا تو پیغام صبا پر گوش تھا

سرگذشتِ سینۂ سوزاں نہ پوچھی یار نے
کی نہ کچھ تاثیر میری آہِ آتش بار نے

کم ہوتی نہیں ہے کسی عنوان طپشِ دل
ہی دامنِ مژگاں سی فروزاں طپشِ دل

نظارۂ بستانِ جہاں کے نہیں مشتاق
کر دے گی دروں اپنا گلستاں طپشِ دل

مغموم

کلو خاں مغموم تخلص شاگردِ مذنب است، از وست:-

یار میرا جو گیا کل چمنستان کے بیچ
تار باقی نہ رہا گل کے گریبان کے بیچ

کہاں ہی عاشقِ بیتاب کو فغاں کا ہوش
نہیں رہا ہی اُسے اپنے جسم و جاں کا ہوش

فروغِ رنگِ رخِ گل کو دیکھ کر بلبل
یہ محو تھی کہ نہ تھا اُس کو آشیاں کا ہوش

تمام عمر تصور سے تھی ہم آغوشی
وہ مجھ سے دور رہا اس سے میں جدا نہ ہوا

مری طرف سے یہ گلر و سے کہیو بادِ صبا
جو تم نے وعدے کئے ایک بھی وفا نہ ہوا

ستایا دوستی میں ہم کو یار نے مغموم
پر اس کا شکرِ جفا ہم سے کچھ ادا نہ ہوا

ہدی

نواب جلال الدولہ ہدی علی خاں بہادر شجاعت جنگ ہدیؔ تخلص خلف الرشید نواب مرحوم مغفور سعادت علی خاں بہادر، جو انیست باغ و بہار و سر جملہ اسخیائے روزگار بفضلِ الٰہی در جمیع فنونِ دانشمندی و دانائی نظیر نہ دارد خصوصًا در علم تیراندازی چناں مشقے بہم رسانیدہ کہ استادانِ ایں فن شاگردی او را فخر خود میدانند بمقتضائے موزونیٔ طبع در زرانت رائے رزیں گاہے گاہے اشہبِ خیال را بمیدانِ فصاحت و بلاغت جولاں می دہند و دل فریبیہا از سامعین می نمایند و در سرکارِ دولت مدارِ ایشاں بعضے از صاحب کمالانِ ایں فن بصیغۂ شاعری عزِ امتیاز دارند دراں جملہ نفیر ہم داخل است و پیش ازیں در حینِ حیاتِ نوابِ مغفور ہم با شعرائے چند ملازم ایشاں ماندہ و اکثرے را از اربابِ ترنم و رقص مجلس نشاط ترانہ ریزی و زمزمہ سازی رشکِ گلستانِ ارم میدارند و توجۂ خاطرِ شریف بیشتر بایں مردم است و ہم از سادہ رویانِ گلعذار و سرو قدانِ لالہ رخسار گلدستہ بندِ مجلسِ نشاط میباشند عمرِ جناب بست و پنج سالہ خواہد بود از نتائجِ طبعِ گرامیٔ ایشانست :-

اب کیا صنم ہونے لگی ایجاد تیرے ہاتھ سے
کرتے ہیں جو خورد و کلاں فریاد تیری ہاتھ سے

نازو ادا کو دیکھ کر نرگس نمطے کرقلم
حیرت زدہ ہے سرنگوں بہزاد تیری ہاتھ سے

کچھ بھی نہ ترس آیا تجھے اے عشق ہی یہ کیا غضب — لاکھوں ہی گھر ہی ہو ہوئے برباد تیری ہاتھ سی
نے مہربانی نے کرم نے لطف ہے اے سیم بر — ہو وے گا یہ ناشاد دل کب شاد تیری ہاتھ سی
مہدی سی پیئے گا جام مل اسوقت سب بزموں کے بیچ — جس وقت ہوگا اے صنم امداد تیری ہاتھ سی

دل نے ہمارے ہجر سی جب اُس کے آہ کی — افسوس دل میں یار کے کچھ بھی نہ راہ کی
عاشق ہزار جی سے فدا ہو گئے وہیں — جب اُس نے دے کے آنکھوں میں سرمہ نگاہ کی
وہ شوخ اچپلا ہے جو مہدی تمہارا یار — صورت ہو اُس سی دیکھئے کیونکر نباہ کی

دلِ بے تاب ایسا دھڑکے ہے — جیسے بلبل قفس میں پھڑکے ہے
اُس نگہ اور دل سے اے مہدی — ڈھال تلوار روز کھڑکے ہے

مجھ سے کیونکر ہو بھلا ہمدم ہوں اُس یار سی ربط — وہ تو رکھتا ہے بہت ان دنوں اغیار سی ربط
کوئی بتلا دو مجھے بہر خدا اے یارو — کیونکہ پیدا کروں میں اس بتِ عیار سی ربط

کہتے ہو اس کو آنا ہم تک محال کیا ہے — دیکھو تو جا کے صاحب مہدی کا حال کیا ہی
مانندِ سبزہ ہوں میں پامال ہم کو مت کر — اتنا بھی سر اٹھانا تو اے نہال کیا ہی
تیغ و سپر سنبھالے ناحق اکڑ رہے ہو — سوچو تو دل میں صاحب یہ چال ڈھال کیا ہی
مارا ہوا کسی کی زلفوں کا کہہ رہا تھا — پڑتا نہیں جواب تک اپنا وبال کیا ہی
قاصد نے میرا نامہ اُس کو دیا تو لے کر — کاغذ کو پھاڑ ڈالا بولا وہ مال کیا ہی
منہ صبح اٹھ کے تم نے دیکھا تھا آج کس کا — کچھ منہ سے بولو صاحب وجہ ملال کیا ہی
مت سر پکڑ کے بیٹھو کچھ فکر کا سبب بھی — عاشق کو مار ڈالا پھر انفعال کیا ہی

ہدی کا تذکرہ جب آیا تو یوں وہ بولے | وحشی ہی خبطی ہی وہ اس میں کمال کیا ہی

کیوں نہ بیجان اُسے دیکھ کے بلبل ہووے | جس کے رخسار پہ قربان ہر اک گل ہووے
ایک دم بھی نہ مری اُس نے خبر لی ہمدم | کیا کروں آہ جو اس کا یہ تغافل ہووے

قتل کی شاید مرے تدبیر ہے | ہاتھ میں قاتل کے جو شمشیر ہے
اس کماں ابرو سے کیونکر دل بچے | ہر مژہ ناوک کا گویا تیر ہے
سنگدل وہ مجھ تلک آتا نہیں | آہ کیوں ایسی تو بے تاثیر ہے
دل پھنسا کر زلف میں کہنے لگا | عشق میں ہدی یہی زنجیر ہے

یوں رخ پہ ہے اس کے خطِ رخسار کی آمد | گلشن میں ہو جوں سبزۂ گلزار کی آمد

جہاں میں ہر طرف ہر کو بہ کو مذکور ہی تیرا | جمال و حسن کا ایسا پری رو شور ہی تیرا
ہر اک پیر و جوان و طفل سب ہیں دید کے طالب | یہ شہرہ جا بجا کچھ خود بخود مشہور ہی تیرا
ہر اک دل میں ہر اک گل میں ہر اک بو میں ہر اک شے میں | زمیں سے آسماں تک جلوہ گر اک نور ہی تیرا
مثالِ شمع ہر پروانۂ جانسوزِ شیدا کو | جلانا ہر طرح اے شعلہ رو دستور ہی تیرا
دل و دیں دے چکے اب جان بھی دینے کو حاضر ہیں | خوشی رکھنا ہمیں ہر طور سے منظور ہی تیرا
جفا کر یا وفا کر یا ستم کر اے کرم پرور | جو کچھ چاہے سو کر ہم پر سبھی مقدور ہی تیرا

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی | دل دیا غم سے آشنائی کی
حسن و خوبی نے تیرے اے دلدار | سر بسر ہم سے بیوفائی کی

عہد میں تیرے اب ہے دل شکنی　　تو نے کیسی صنم خدائی کی
دل مرا لے کے یوں خراب کیا　　واہ کیا خوب دل ربائی کی
آہ مہدی سے اے صنم تو نے　　وصل ہوتے ہی پھر جدائی کی

اس بتِ شوخ کے ہیں طالبِ دیدار کئی　　اہلِ تسبیح کئی صاحبِ زنار کئی
حسن پر اپنے اب اے جان نہ کر اتنا غرور　　اور بھی تجھ سے جہاں میں ہیں طرحدار کئی

اس شمع رو کی مجکو بھلی جو ادا لگی　　سینے میں سوزِ عشق کی اک آگ جا لگی
دل میرا خون ہو گیا اک لخت دیکھ کر　　مہدی بھی اُس کے ہاتھوں میں تھی خوشنما لگی
یوں سیکڑوں جہاں میں طرحدار ہیں ولے　　تیری بھی شکل پیاری مجھے دل ربا لگی

صحبت اس کے حضور کی ٹھہری　　غم گیا اب سرور کی ٹھہری
مجکو بیتاب دیکھ کر مہدی　　اور بھی واں غرور کی ٹھہری

صورت اُس کی سما گئی جی میں　　آہ کیا آن بھا گئی جی میں
تو جو مہدی بھلا ہوا تارک　　ایسی کیا بات آ گئی جی میں

مصحفی

من کہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی تخلص ام احوالِ حسب و نسبم از کتاب مجمع الفوائد معلوم نمائی چوں بیش ازیں تذکرہ فارسی و ہندی جمع کردہ ام سبب بریں تالیف کثرتِ موزونانِ دیارِ لکھنؤ کہ بالفعل آبادی شاہجہاں آباد بپاسنگِ او نمی رسد، شد۔ اگر از

تحصیلِ علمی من پرسی گویم تو کہ تکمیلِ فارسی و نظم و نثرِ آں بہ شاہجہاں آباد در سی سالگی
بخوبی میسر آمدہ بود در ایامیکہ جلائے وطن کردہ دریں دیارِ تازہ آمدہ قیام ورزیدم علم
عربی یعنی طبیعی و الٰہی و ریاضی از مولوی مستقیم سکنۂ گوپامؤ شاگردِ مولوی حسن خواجہ تاش
مولوی مبین عالم العلما خواندہ ام و مبتدئی صدرا را بلد شدہ و قانونچہ را از مولوی
مظہر علی کہ در صرف و نحو ثانی ایشاں کم پیدا می شود دریافتہ۔ غرض آخر عمر از فضلِ الٰہی
بہ عربیت و تفاسیرِ قرآنِ مجید مایہ بہم رسانیدم کہ تصنیفِ دیوانِ عربی را ارادہ می کردم
نیز صورت می بست بلکہ قریب یک جزو غزلیات و یک دو صد قصیدہ نعتِ رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کہ گفتہ بودم آں جزو مسودہ صاف کردہ بر طاقِ بلند افتادہ بود بہ سبب
نم زدگی باراں ارضۂ قوت خود نمودہ پارہ کاغذ کرم خوردہ و پارہ سلامت برآمد مضمون
بستۂ آں نظم از دست رفت۔ دو سہ مقاماتِ حریری کہ مع شرح داشتم و جزوے بسواد
ہم دادم از مولوی عنایت محمد شاگردِ خود کہ قصایدِ عربی از من خواندہ اند، دیدہ ام و
ازاں کتاب محاورہائے زبانِ عرب را اندکے دریافتہ اگر زمانہ فرصت داد باتمامش
می رسانم۔ معنیٔ متنِ قرآن را بے احتیاجِ تفسیر حرف بہ حرف بہ سینہ دارم۔ اکثر کتابہائے
عربی مثلِ مختصر و مطول بیک مطالعۂ من آسان می شوند و ہیچ مطلبے غامض تر از فکرِ من در
پردۂ اختفا نمی ماند۔ ایں نقص را کہ عربی داں نہ بودم دریں شہر از خود دفع نمودم۔ نقص
دوم ناآشنائی علمِ عروض و قافیہ بمطالعہ چند شبے عروضہائے استاداں گذشتہ در
عرصۂ قلیل بدور انداختم و خود ہم عروضے مختصر تالیف نمودم و نام آں خلاصۃ العروض
گذاشتم الحمد للہ کہ ہرچہ مقصودِ من بود حاصل شد و ایں ہر دو زبانِ فارسی و ہندی از ایام
شباب مثلِ غلام و کنیز شب و روز بہ پیشِ من کمر بستہ حاضر می مانند۔ اما در عربی چنانکہ دل
می خواہد مزاولت باقیست۔ در زبانِ اردوئے ریختہ قریب صد کس امیر زادہا و غریب
زادہا بحلقۂ شاگردیٔ من آمدہ باشند و فصاحت و بلاغت را از من آموختہ در محاورہ

فارسی کتاب مفید الشعرا کہ تالیف کردہ ام ازاں بر تو مرتبۂ فارسی دانی من روشن خواہد شد۔ ایں ہمہ شیرینی کہ در ریختہ دارم طفیلِ فارسی است اگرچہ الحال مرا ننگ می آید از نوشتنِ اشعارِ فارسی و ہندی خود۔ دریں جلد می خواستم کہ اشعارِ عربی بنویسم خردم بانگ بر من زد کہ چوں نامے دریں فن بر آوردہ از نوشتن شعر عربی چہ حاصل، کہ می داند و کہ می فہمد۔ چوں زبانِ فارسی از بے علمی صاحبانِ زمانہ رو در نقابِ اختفا دارد طبیعت ہا بیشتر متوجہ ریختہ اند از دامنِ قبول ایں گلہائے شگفتہ را رنگین و بد رختانِ خار دارِ عربی آویختن عقل صلاح اندیش رخصت نہ دہد، ناچار بفتوائے رائے صایب از رطب و یابسِ کلامِ فارسی و ہندی ہرچہ مناسب دیدم بہ تحریرِ خامۂ وقائع نگار در آوردم بزیورِ قبولِ سامعانِ سخن سنج محلی و آراستہ و بحصولِ پذیرائی طبائعِ معنی دوست محلے باد۔ سنہ عمرم تا الی الیوم قریب بہشتاد رسیدہ باشد اکنوں دل از دنیا برکندہ جز یادِ الٰہی و مصروف بودن بہ نماز و روزہ چیزے دیگر نمی خواہد او سبحانہ عاقبت بخیر کناد، لمولفہ

من بخود ہم نہ پسندم سخنِ نازِ ترا
کہ مبادا دگرے بشنود آوازِ ترا

در لگن بال و پرے میزنی اے پروانہ
امتحاں ساختہ ام طاقتِ پروازِ ترا

نمی دانم بسودائے کہ دریا چشمِ تر دارد
کہ درویشانہ سیاح است و کشتی بر کمر دارد

بوقتِ گریہ آید بوئے تاثیرے زہر اشکم
کہ من می گریم و ایں گریہ اختر در گذر دارد

نظرے کردہ برویت چو رسد زرہ چشم
لذتِ حسن تو از دیدۂ قاصد گیرم

وہ کہ با ضعفِ تن افتادہ کنوں کار مرا
ہم چو آئینہ بود پشت بدیوار مرا

مدتے شد کہ میانِ من و او آشتی است
کیست آنکس کہ کنوں می دہد آزار مرا

شد فراموشِ تو شاید غمِ شادی مرگم
اے کہ در خواب دہی بوسۂ رخسار مرا

یادِ عہدیکہ بہ تقریبِ گدائی گاہے
گذرے بود بکوے تو شبِ تار مرا

ہرگز نہ آسماں نہ زمیں می کشد مرا
از من تو رُخ نہفتۂ ایں می کشد مرا

باغیر گرمِ جوششی ایں می کشد مرا
داغم زخوے او کہ چنیں می کشد مرا

خوں کردہ ام ہدر کہ بتِ جنگجوئے من
از مہر می کشد نہ بکیں می کشد مرا

خوئے بہانہ جوے تو بے دردِ سر نہ بود
صندل کشیدنت بہ جبیں می کشد مرا

خواہ از زبانِ مطرب و خواہ از زبانِ یار
ہر جا کہ ہست صوتِ حزیں می کشد مرا

طفلے کہ زخمِ سینۂ من در دعائے اوست
ہر دم بخندۂ نمکیں می کشد مرا

کم خور فریبِ پردہ نشینی چو مصحفیؔ
صیاد پیشہ ام بہ کمیں می کشد مرا

مرکب اندازکہ میدانِ تگ و تازے ہست
در رہت سینہ سپر عاشقِ جاں بازے ہست

میزنی حرف ازاں نرم دردنِ خانہ
می شناسی کہ بروں گوش بر آوازے ہست

پردہ در خواہشِ دل چوں فگنم حیرانم
وہ کہ رسواکنِ من غمزۂ غمازے ہست

می کنم بال و پرش سمت بدستِ صیاد
تا ندانند کہ مرا طاقتِ پروازے ہست

نیست نومیدیم از تو کہ دگر چشمِ ترا
سوئے آئینہ نگاہِ غلط اندازے ہست

مصحفیؔ راکہ . . . .
ایں قدر بس کہ دراں انجمن اعزازے ہست

مائلِ سوختنم شعلۂ آوازے ہست
در کمینِ دلِ من زمزمہ پردازے ہست

اے کہ پاں خوردہ زعشرت کدۂ غیر آئی
باخبر باش کہ ہمراہِ تو غمازے ہست

سہل انکار ہم از خاطرِ خود دور کنی
بہ نیازِ منِ سودا زدہ ہم نازے ہست

مردگاں وقتِ خرامِ تو ہمیں می گوید
ایں طرف ہم قدم انداز اگر نازے ہست

بردلِ خویشتنم رحم ازاں می آید
کہ دو چارِ نگہ حوصلہ پردازے ہست

بالبِ لعلِ تو نے راز و نیازے دارد
چوں نہ دارد کہ... چو تو دمسازے ہست

در شبِ وصل اگر خانۂ من شد آباد
نیم ایمن چو فلک خانہ براندازے ہست

یارب ایں مجلسِ رقص است کہ گلزارِ بہشت
ہر طرف می نگرم سروِ سرافرازے ہست

مصحفیؔ تا خبرِ آمدنِ کیست بہ باغ
رنگِ رخسارۂ گل را سرِ پروازے ہست

اے مصحفیؔ فغان و گلوئیت ہماں کہ بود
ہفتاد سالہ گشتی و خوئیت ہماں کہ بود

آں سوزش و شبابِ جوانی ز سر برفت
اما ز نظمِ مے و سبوئیت ہماں کہ بود

یارب عجب گلے کہ بہ سنگِ خزانِ غم
رنگت برخ شکستہ بوئیت ہماں کہ بود

صد بحر خشک گشتہ و صد چہ بہ تہ رسید
وز ابرِ فیض آب بجوئیت ہماں کہ بود

بازارِ لفظ و معنیٔ احباب سرد شد
ہنگامہ گرم بر سرِ کوئیت ہماں کہ بود

ہر چند پیر گشتی و موئے تو شد سفید
اما صفائے بشرہ و روئیت ہماں کہ بود

شاگردِ تازہ از پسِ شاگرد می رسد
یعنی رجوعِ خلق بسوئیت ہماں کہ بود

دانند پیر اگر دگرانت ز ابلہیست
در چشمِ من سیاہیٔ موئیت ہماں کہ بود

جائے قلم بدست کنوں سبحہ بہ گیر
گر نالۂ تو خلق عدوئیت ہماں کہ بود

ہرگز بہ وقتِ ضعف کسے یاریم نہ کرد
یک آشنا خیال مددگاریم نہ کرد

من کارِ خود حوالۂ لطفِ خدا کنم
چوں چارہ گر نگاہ بہ ناچاریم نہ کرد

شکرِ خدا کہ رازِ محبت ...... ماند
در کوچۂ تو گوش کسے زاریم نہ کرد

اندیشہ گر نہ بود ز بد نامیٔ خودش
عیسیٰ چرا علاجِ دلِ افگاریم نہ کرد

صیادِ من مرا بہ قفس دید مضطرب | اما ترحمے بہ گرفتاریم نہ کرد
خوشتر کہ آشیانہ بہ باغِ دگر برم | یک گل درین چمن چو ہوا داریم نہ کرد
رسوائے خلق ساخت مرا عشقِ دلبری | کو دل ز من ربودہ و دلداریم نہ کرد
از دیگراں چہ شکوہ کنم در فراقِ او | ہمسایہ ہم عبادتِ بیماریم نہ کرد

توی کہ می نہ کنی قصدِ امتحانِ کسے | چرا ز حسنِ تو آتش فتد بجانِ کسے
غبارِ کشتۂ نازِ تو می شود بر باد | بیا ببام و بکن سیرِ آسمانِ کسے
بہ کوچۂ کہ بتاں رخشِ ناز می سازند | مجال نیست کہ گیرد تگے عنانِ کسے
ازیں حنائے سیہ رو دگر چہ می خواہی | کہ پنجہ ات زدہ آتش بدودمانِ کسے
حلاوتے کہ نہ دیدی ہنوز دریابی | اگر شوی بہ شبِ وصل میہمانِ کسے
درونِ خانۂ تو اے نازنیں چہ میدانی | کہ گفتہ شد سرِ بازار داستانِ کسے
صبا ز طرفِ چمن گرچہ دامن افشاں رفت | نہ ریخت برگِ گلے ہم در آشیانِ کسے
اگرچہ پردہ بر عنائیِ جمالِ تو نیست | ہنوز نامِ تو نہ گذشتہ بر زبانِ کسے
تو خود شکارِ شولائے دل خدائے را پسند | کہ تیرِ ناز بروں آید از کمانِ کسے
چہ حاصل است ازیں نالہ مصحفی تن زن | چو نازِ او نہ نہد گوش بر فغانِ کسے

دردا کہ دوچارم شدہ یار آفت جانے | گل چہرہ بتے کم نگہے جانِ جہانے
صاحب نظرے آئینۂ ناز بدستے | خود بیں صنمے کافر ناز میانے
در آرزوئے ہم چو خودی رفتہ ز خویشی | سرمست مئے عشق و زکف دادہ عنانے
آتش بہ جگر . . . . . . ز شوخی | رنگیں چمنے گلبدنے سحر بیانے
رقاصہ بتے خوش نگرے زنگلہ بندے | ہم کبکِ خرامیدہ و ہم سروِ روانے

از بہر گرفتاریٔ ما دام بدوشے　　دز بہر پریشانیٔ جان طرہ فشانے
چوں مصحفیٔ خستہ روانند ہزاراں　　دنبالِ چنیں حور وشے زمزمہ خوانے

اشعار ہندی

خونِ ناحق ہوں میں کیونکر کوئی کھووے مجکو　　رہوں گردن پہ میں دامن سے جو دھووے مجکو

گھر میں جا دیتے ہیں درویش و تونگر ہم کو　　خانہ بر دوش ہیں ہم چاہیئے کیا گھر ہم کو
مرگ نے بھی ترے زنداں کا زبس سمجھا تنگ　　کر دیا خانۂ زنجیر سے باہر ہم کو
خط تو لکھا پہ اٹھانا نہیں دیتا غم رشک　　ننگِ منت کشیٔ بالِ کبوتر ہم کو
ہو گیا اشکوں میں آخر کو تنِ زار نہال　　لاغری تو نے کیا رشتۂ گوہر ہم کو
دیکھنے پائے نہ ہم سبزۂ گلشن کی بہار　　خط کے آتے ہی ملا زہر کا ساغر ہم کو
نالۂ نیم شبی نے یہ بڑا قہر کیا　　لے گیا وادیٔ محشر کے برابر ہم کو

پیار سے دیکھ رہا ہے جو رخِ قاتل کو　　کچھ تو ملتا ہے مزا تیغ تلے بسمل کو
کا تگی کا وہ نہان اب کے ہے حیرت افزا　　جس نے آئینہ بنایا ہے رخِ ساحل کو
ایک ہی آبلہ پاؤں میں تو اب کی نہ پڑا　　کیونکہ طے کر گئے یارانِ عدم منزل کو
سارباں ساتھ نہ ہووے تو بھی لیلیٰ کی　　ناقہ جاتا ہے سوئے نجد لئے محمل کو
مصحفیؔ چین جو پایا ہے لحد میں پسِ مرگ　　استخواں بھی مرے دیتے ہیں دعا قاتل کو

یہ تو کہاں کہ فرشِ مشجر ہے اور ہم　　انجامِ کار خاک کا بستر ہے اور ہم
لیجا کے نامہ بیٹھ رہا اُس گلی کے بیچ　　آوے گر ایک واں سے کبوتر ہے اور ہم
جا کر اسیرِ فتنہ ہوئے اُس گلی کے بیچ　　ہنگامہ ایک حشر کا سر پر ہے اور ہم

گرا بکی مے کدے میں ہمیں بخت لے گئے
تو دیکھیو کہ شیشۂ و ساغر ہے اور ہم

ہے برخلاف ہم سے زمانہ تو کیا ہوا
کی بخت نے مدد تو وہ دلبر ہے اور ہم

سودا سا ہو گیا ہے ہمیں اس کے عشق میں
ہر شب خیالِ زلفِ معنبر ہے اور ہم

کنجِ قفس میں خوب سے کر لیویں پا چھپے
آخر تو ایک دن دمِ خنجر ہے اور ہم

اس مخمصے میں کٹ گئیں راتیں فراق کی
نت دست بر دعا دلِ مضطر ہے اور ہم

دل نذر کر چکے ہیں پری وش کے ہو سو ہو
اے مصحفی اب آگے مقدر ہے اور ہم

زبانِ نالہ کش کس کی ہوئی تھی گرمِ شیون یہ
گدازِ موم کا عالم نظر آتا ہے آہن پر

اسیری گر مقدر ہے تو ہرگز غم نہ کھا اس کا
گراں لگتا نہیں قمری کو اپنا طوق گردن پر

لگیں تلواریں چلنے اس ادا پر بانکے ٹیڑھوں میں
ذرا کج ہو کے بیٹھا تھا وہ ظالم پشتِ توسن پر

فلک رہتا نہیں نازک دلوں کا بن جگر بیندھے
گذارا پھول کا ہوتا ہے آخر نوکِ سوزن پر

رہے عشاق اک سو مٹ گیا اُس کا بھی نظارہ
ستم کرنے لگا مکڑی کا جالا چشمِ روزن پر

دشمنِ دین و دل و جان نہ ہو اتنا بھی
آدمی درپئے انسان نہ ہو اتنا بھی

غنچہ گر وقتِ سحر نیم تبسم بولا
کیا مرا چاکِ گریبان نہ ہو اتنا بھی

نگہِ بازپسیں کی ہے ہوس چاہوں ہوں
دلِ کم بخت میں ارمان نہ ہو اتنا بھی

خار و خس بسترِ دیبا و گلِ بالیں اشک
کیا شبِ وصل کا سامان نہ ہو اتنا بھی

حالتِ عاشقِ شوریدہ ہے عبرت کی جگہ
کوئی دنیا میں پریشان نہ ہو اتنا بھی

کیا کہوں کیسی خرابی میں رہا ہوں میں یار بغیر
گھر کسی شخص کا سنسان نہ ہو اتنا بھی

اپنی طاقت پہ نظر کر تو دلا جانے دے
پیچھے اُس شوخ کے حیران نہ ہو اتنا بھی

مصحفی دل کوئی ہرجائی کو دیتا ہے میاں
جان اور بوجھ کے نادان نہ ہو اتنا بھی

خواہشِ زخمِ جگر پھر دل افگار میں ہے
ہم تو سمجھے تھے کہ برش تری تلوار میں ہے

اُس سے کہنا ہے دمِ ذبح یہی کشتۂ ظلم
کیا صنم رحم بھی تیرے دلِ خونخوار میں ہے

طائرِ نامۂ اُس شوخ نے کس کا مارا
سرخیٔ خونِ کبوتر لبِ سوفار میں ہے

مو قلم سے نہیں مانی کی رقم ہو سکتی
کچھ نزاکت سی نزاکت کمرِ یار میں ہے

اتنی تندی سے نہ چلیو تو صبا بہرِ خدا
کاغذِ نامہ مرا رخنۂ دیوار میں ہے

مرضِ عشق کی صحت کے نہیں ہیں خواہاں
ہم ہیں عاشق ہمیں آرام اس آزار میں ہے

اس کو منظور اجل کا ہے مگر استقبال
اتنی سرعت جو مری نبض کی رفتار میں ہے

پیچھے جانے کے خراماں کوئی پھرتا ہے مگر
کچھ چمک اور بھی ہر رخنۂ دیوار میں ہے

ماہر

غلام محمد خاں ماہر تخلص ساکنِ رام پور شاگردِ مولوی قدرت اللہ صاحب شوق تخلص بعمرِ بست ودو سالہ ازیں جہاں گذشت، از وست :-

جنوں کے اب تو دفتر کی ہوئی ہے مجکو دیوانی
بجا ہے لے چلے مجنوں قلمداں کا مرے بستہ

نہیں ہے اشک محو پاشنہ کوئی ہے لختِ دل
چلا ہے کرتی والوں پر یہ ٹوپی والوں کا دستہ

ترے کاکل کے پیچوں میں دل اپنا بندھ سکے کیونکر
وبالِ جان ہے طے کرنا شبِ تاریک میں رستہ

فقط طالب ہو سیم وزر کے ظاہر اب ہوا پیارے
غلط مشتاقِ الفت تم کو سمجھا تھا یہ دل خستہ

شمع ہے پھر قیامت بہ سرِ پروانہ
صبحِ محشر سے نہیں کم سحرِ پروانہ

شمع یک کا ہے کو ہوتا گذرِ پروانہ
ہے وبالِ سرِ پروانہ پرِ پروانہ

دکھ دیئے بن نہیں عشاق کو معشوق کو چین
شمع خود جلتی ہے بہرِ ضررِ پروانہ

حالِ عاشق کرد سرکش نہیں آگہ سچ ہے
کب ہوئی شمع کو یارب خبرِ پروانہ

عیبِ معشوق بھی عاشق کو ہنر لگتا ہے — شمع کا دود ہے دودِ اگرِ پروانہ
پھیر کر قافیہ لکھ مطلعِ رنگیں ماہر — سر بسر حسن میں بھرا ہو ہنرِ پروانہ

سب سے مشکل ہے محبت میں فنِ پروانہ — دوشِ پروانہ پہ ہے نت کفنِ پروانہ
اس طرح شوق سے آیا کہ نہ نکلا ہرگز — لگنِ شمع تھی گویا وطنِ پروانہ
درگذرا اس سے کروں کیونکہ کسی بات پہ میں — . . . . . . جان و تنِ پروانہ
لطفِ محفل میں ہے عاشق کو تو ہی باعثِ یار — گرم ہے شمع تلک انجمنِ پروانہ
نت فضولی سے ہے دل سوختگاں کو نفرت — پرِ پروانہ ہے بس پیرہنِ پروانہ
آپ سے کاہے کو جلتا یہ بھلا اے ماہر — شعلۂ حسن ہوا راہزنِ پروانہ

مفلس

میر محب علی مفلس تخلص شاگردِ مولوی قدرت اللہ شوقؔ ساکنِ رامپور عمر پنجاہ ساله داشت چہار سال می شوند که ازیں جہاں درگذشت، در مقطعِ ہر غزل مضمونِ افلاس برائے رعایتِ تخلصِ خود می بست ہمہ مسوداتش برباد رفتند ایں چند اشعار بتلاشِ تمام از تصنیفاتش بہم رسیدہ اند:-

اٹھایا منھ سے اپنے کیا نقاب او سیم بر تو نے — کئے بے نور دونو صاف یہ شمس و قمر تو نے
اڑیں خبریں ترے بیمار کے مرنے کی عالم میں — خبر تو بھی نہ لی آ کر ذرا او بے خبر تو نے

جو کہ آیا دور میں تیرے وہ مستانہ بنا — خوبیٔ قسمت نہ ہم کو ایک پیمانہ بنا
دیکھ تیری زلف دل کیا کیا نہ جانانہ بنا — وحشی و خبطی بنا سودائی دیوانہ بنا
تو پتنگا جس کو سمجھے ہے سنا او شمع رو — سو مرا دل ہے پھرے ہے تجھ پہ دیوانہ بنا

گھر بہ گھر اور کو بکو چرچا ہے اپنی چاہ کا | بات تو تھوڑی سی تھی پر ہائے افسانہ بنا
مشک و عنبر میں اسے تو لوں گا میں یار وندام | گر دلِ صد چاک اُس کی زلف کا شانہ بنا
خانۂ حق ہے مرا دل او بتِ کافر سنا | پاؤں پوجوں میں ترے اسکو نہ بتخانہ بنا
مانگتا مفلس پھرا اس شہر میں تا شام بھیک | نہ کوئی کوڑی بنی اس کو نہ کوئی دانہ بنا

مختار

حافظ غلام نبی خاں مختار تخلص برادرِ میانۂ حافظ غلام محمد خاں آزاد تخلص کہ ذکرش درحرف الالف گذشت شاگرد صفی الدین خاں عرف غلام مصطفےٰ مقتون تخلص بودند بعد انقلابِ سلطنت و ہنگامہ ہائے گردشِ ملکی ازوطن برآمدہ روزبرآوردنِ نواب عماد الملک از رعبِ افواج قاہرۂ شاہ درانی ابدالی ہمراہِ نواب موصوف شدہ چند سال ہرجا کہ رفتند از رفاقت دست بردارنہ گردیدہ۔ مدتے درسلکِ جاٹ سورج مل در بھرت پور وڈیک وکھمیر ماندہ و مدتے در فرخ آباد برآمدہ ہمراہِ رکابِ حضور چند جائے متعددہ سیر و سفر نمودہ در ساگر تال و بھوپال تال سرحدِ دکن حاضر بودہ اوقاتِ عمرِ عزیز بسر بردند پس از آنکہ نواب موصوف بارادۂ حج روانۂ سمت شدند مشارٌ الیہ را بر مداخل و مخارج مکاناتِ تعلقہ جاگیرات مثل کالپی وغیرہ مختار ساختند پس ازاں بعد انقضائے چندے بہ سببِ خصومت بعضے از محل ہائے نواب مشارٌ الیہ درجۂ شہادت یافتند، شہادتش در ۱۱۹۷ھ یکہزار و یک صد و نود و ہفت ہجری و مزارش در ساگر تال است، از وست :-

عشق جسمِ خستہ را فارغ زدردِ دل نداشت | رشحۂ آبے دریغ ایں بحر از ساحل نداشت
کاش از بے دولتی افسردہ در شریاں شدے | بے ادب خونے کہ پاسِ دامنِ قاتل نداشت

چہ می سوزی بجرمِ طاقتِ دل دردمندے را | کہ نتواند جوابِ نامۂ دادن سپندے را

زلعلت گر بیابے کامِ دل خواہم مرنج از من | مکرر کے تواں بالیں لطافت قندے را
مرا از خاک یا رب شورِ محشر بر نمی دارد | بچشم انتظارم جلوۂ بالا بلندے را
زما سر گشتگاں ہم اے صبا عرضِ نیازی وہ | فلک در سجدہ یابی ہر کجا گردِ سمندے را
نمی خواہد شکیبائی بہ تنگ آمد زبیتابی | الٰہی مالکِ دل کردۂ مشکل پسندے را
دہم تیغ از نشاطِ جانِ اسمٰعیل می رقصد | خراشیدن چہ حاجت ورنہ حلقِ گوسفندے را
بزیر سایۂ آں زلف دلہا را پناہی دہ | لباسِ فخر جنبدیں کعبۂ نقشِ پرندے را
بیا مختار تسلیم معانی را مسخر کن | چہ نازی گر گرفتی اصفہانے یا خجندے را

بردرِ دل فارغ از اندیشۂ دنیا نشیں | دست بردار از دو عالم واگہی با ما نشیں
سر دریں آشوبگاہ از خطِ ساغر بکش | ہم چو دُردآسودہ زیرِ دامنِ صہبا نشیں
می دہد نام آوری ناموس عزلت را بباد | تا توانی دور تر از صحبتِ عنقا نشیں
تہمتِ سودائے لیلیٰ بر دلِ مجنوں منہ | الفتِ شہرے مخواہ از مردمِ صحرا نشیں
ما و مختار و کلیم ایں جملہ از خود رفتہ ایم | ذوقِ تنہائی اگر داری بیا با ما نشیں

مفتوں

شیخ صفی الدین عرف غلام مصطفیٰ مفتوں تخلص برادرِ کلانِ شیخ رضی الدین عرف غلام مرتضیٰ سروری کہ ذکرِ ایشاں در حرف السین گذشت شخصے قابل وشیریں کلام بود از دوست :-

چہ سرِ لوحِ کتاب ابروئے بسم اللہ را | صفحہ رخسارے بود گیسوے بسم اللہ را
ہرزہ بانی ہا مکن کارت نمی گردد تمام | تا نمی آری بکف گوے بسم اللہ را
ہر دو مصراعش زبس مفتوں بہم پیوستہ است | مطلع من کردہ چار ابروئے بسم اللہ را

بسرِ زلف کسے سلسلہ جنباں شد و رفت آخر از من دلِ دیوانہ پریشاں شد و رفت
انتظارت چہ بلا بود کہ از کوے تو دل خرمنے از گلِ آئینہ بداماں شد و رفت

دل نشیں است بقتونِ تو سیرِ پنجاب می رود تا دکن و ڈھاکہ و بنگالہ عبث

می روم ایں کو کہ دارم در دل اندازے دگر زیں چمن دارم سرِ اندازے و پروازے دگر
کے خدائے بندہ پرور می گذارد ضایعم زد بگوشم مژدۂ کارِ خدا سازے دگر

ز گھڑیالی پسرِ آں فتنہ تمثال شوم در ہر گھڑی نالاں چو گھڑیال

چہ می پرسی از اں بیداد دل خواہ کہ بنواز د دلم را گاہ بیگاہ

بود خوں خوردن از تنبولی ارزاں مگر اوراقِ دل پیچیدہ در پاں

چو پانش سبز تہہ گلگوں نہ باشد زعاشق جاں سپاری چوں نہ باشد

بود آشوبِ دل عطارِ محبوب کہ شد خالِ لبش تخمِ دل آشوب

زیکِ شیشہ بروں آرد عرق را چو صد رنگ از خمِ نیلی مسیحا

چہ می پرسی ز شوخِ مست سقّا کہ بخشد تشنہ را آب منقّا

دو لعلش بوسہ ہا دادہ بہ پیغام مگر آبِ حیاتش بود در جام

مظفر

خواجہ مظفر علی مظفر ولد غلام علی خاں مولفِ کتابِ تواریخ عالی گوہر بادشاہ ابن نواب بھکاری خاں صوبہ دار لاہور ابن نواب روشن الدولہ جوانِ موزون الطبع است مذہبِ نقشبندیہ[1] دارد در ریختہ بشاگردی[2] میر فخر می کند و تحصیل عربی تا شرح سلم از محمد اشرف شاگردِ رشیدِ مولوی نور صاحب بودہ معہذا بہ سببِ معرفتے کہ فقیر را بپدرِ بزرگوارِ ایشاں در شاہجہاں آباد بود و آں بزرگ ایں عاصی را کمال دوست داشتی معزالیہ نیز با فقیر نہایت اتحاد پیدا کردہ اکثر بلا ناغہ در مشاعرۂ عاصی وارد می شود غزلہائے خود ..... ہم نمودہ عمرش تخمیناً بست و ہشت سالہ خواہد بود، از وست:-

لالی نہیں اُس کے لب پہ پاں کی شوخی ہے یہ خونِ عاشقاں کی

نہ گریباں پر ترے دارائی کی تحریر ہے خوں کسی پیارے[3] کا پیارے یہ گریباں گیر ہے

زلفوں کو تیری دنیا اے آفتِ زمانہ مشکِ ختن سے نسبت یہ مو بمو خطا ہے

حسن کے کلیات میں یارو شعرِ ابرو کا انتخاب ہوا

---

(۱) ن - مریدِ خاندانِ طریقۂ نقشبندیہ۔

(۲) ن - و شاگردِ میر تقی میر

(۳) ن - عاشق۔

مخمور

محمد جعفر مخمور تخلص بزرگانش سکنۂ لاہور بودہ اند و خودش در لکھنؤ تولد و نشو و نما یافتہ بہ پیشۂ عطاری بسر می برد معرفت منور خاں غافل تخلص بحلقۂ شاگردی فقیر از یک سال در آمدہ عمرش بست و ہفت سالہ است، از وست:-

جاں بلب ہوں اب تو میری پاس آیا چاہئے
نزع کی حالت میں تو صورت دکھایا چاہیئے

دلِ محزوں مرا سیرِ چمن میں بھی نہیں لگتا
درختِ لالہ و گل مجکو تجھ بن نخلِ ماتم ہے

لیتا ہے جو بوسہ دلِ بیمار تو اُس کا
خالِ لبِ محبوب مگر حبِّ شفا ہے

ڈرہی ہے وہ ہاتھ سے قاصد کے نہ گر جائے
مضمونِ دلِ بیتاب کا نامے میں لکھا ہے

قاصد کی بھی حاجت نہیں کچھ گریہ سے میرے
خط بہہ کے مرا کوچۂ جاناں کو چلا ہے

آپ میں بن کے صبا نامہ بری کرتا ہوں
نہیں پرواتری اے بالِ کبوتر مجکو

ہم ہیں تنہائی ہے اور رنجِ شبِ تار ہے آج
نہ تو مونس کوئی اپنا ہے نہ غمخوار ہے آج

بت کوئی واں بھی گیا دیرِ مغاں سے شاید
ساکنِ کعبہ جو پہنے ہوئے زنار ہے آج

کر ذبح مجھے ٹوٹ گیا خنجرِ قاتل
کیا میری ہی خاطر تھا بنا خنجرِ قاتل

نفرت سے کیا ذبح جو قاتل نے تو میرے
حلقوم پہ رک رک کے چلا خنجرِ قاتل

مخمور وہ لذت ہے مرے خوں میں دمِ ذبح
ہووے گا گلو سے نہ جدا خنجرِ قاتل

ایک دم بیکار یہ دستِ جنوں رہتا نہیں — پھاڑے دامن کو اگر یادِ گریباں بھول جائے
جوہرِ شمشیر پر لکھ رکھ تو اُن کے اسم کو — تا نہ اے قاتل تجھے نامِ شہیداں بھول جائے

تپش سے اس دلِ سوزاں کی اب تلک تہِ خاک — کلیجہ گاوِ زمیں کا کباب ہوتا ہے

پروانے سی نسبت نہیں کچھ عشق میں مجکو — وہ شمع پہ ہوتا ہے فدا میں ترے صدقے

کس نور سے یہ مردمکِ چشم ہے روشن — آنکھوں میں اگر یار کی تصویر نہیں ہے

مجکو تو دورِ چرخ نے پامال ہی کیا — جوں دانہ سر نکالے . . . . . .

مضمون بھرے تھے دلِ مضطر میں ہزاروں — خط باندھ دئے بالِ کبوتر میں ہزاروں

آئینے پر جو مری جان جھکا پڑتا ہے — اپنے بوسے کا ہے مائل دہنِ سرخ ترا

منتظر تیرا زبس اے بتِ مے نوش ہوں میں — عالمِ خواب میں کھوئے ہوئے آغوش ہوں میں
ہر ستارہ یہی مانگے تھا دعا وقتِ سحر — یا الٰہی کہیں اُس گل کا دُرِ گوش ہوں میں

خط لکھا ہی اُس کو میں نے آرزوئے قتل میں — سر نہ ہو جاوے کہیں جسمِ کبوتر سے جدا

تیغِ ساعد سے کہیں اپنے کرے وہ مجروح — عطرداں بازوئے قاتل کا نمکداں بن جائے
فندقِ پا کی جو میں یاد میں روؤں مخمور — رگِ یاقوت ہر اک تارِ گریباں بن جائے

عجب قیدِ کشاکش میں یہ مرغِ روحِ یاراں ہے ۔۔۔ کہ ہر تارِ نفس زنجیر ہے اور چشم زنداں ہے
ہمارے تابعِ فرماں ہوں کیوں یہ پری پیکر ۔۔۔ کہ اپنے ہاتھ پر گل خاتمِ دستِ سلیماں ہے
جہاں چشمِ سیاہِ یار کے مدفون ہیں کشتے ۔۔۔ چراغوں کے عوض روشن وہاں چشمِ غزالاں ہے

معجزہ وادیٔ مجنوں میں یہ دیکھا کہ وہاں ۔۔۔ ہر شجر سے انا لیلٰی کی صدا آتی ہے
آئینہ کیونکہ دمِ صبح وہ دیکھے مخمور ۔۔۔ اپنی صورت سے اُسے آپ حیا آتی ہے

برائے عشق سے کیونکر مرا دلِ نازک ۔۔۔ کلائی شیر کی کس طرح ناتواں توڑے
بیاں میں کیا کروں صیاد کی جفاکاری ۔۔۔ پروں کے ساتھ مری اُس نے استخواں توڑے
جو اُس کی چشمِ مکحل کو دیکھے اے مخمور ۔۔۔ صبا نہ غنچۂ سوسن کے سرمہ داں توڑے

مسرت

لالہ عوض رائے مسرت تخلص قومِ کایتھ ساکنِ شاہ آباد از مشاقانِ قدیم است در کلامِ خود پختگیٔ استادانہ دارد ور ایامیکہ بتقریبِ تلاشِ معاش واردِ لکھنؤ شدہ چند غزلِ خود نوشتہ فرستادہ بود منتخب آنرا بقلم می دہد:-

بے تو شد خندۂ گل چاک گریبانِ چمن ۔۔۔ شبنم اشکے شد و غلطید بدامانِ چمن
نرسد مصرعۂ موزونِ قدت را ہر چند ۔۔۔ مصرعۂ سروِ بلند است بدیوانِ چمن
اے مسرت نہ رسد کس بغزل خوانیٔ تو ۔۔۔ نو کند طرزِ سخن از تو غزل خوانِ چمن

فتنہ تا قامتِ رعنائے تو برخاست نشست ۔۔۔ غلغلِ حشر چو غوغائے تو برخاست نشست
محشرِ نالۂ و آہ از دلِ مستاں می خاست ۔۔۔ شورِ قلقل چو زمینائے تو برخاست نشست

گو بہ مجنوں کہ ز سیلابِ سرشکم امروز
ہر غبارے کہ ز صحرائے تو برخاست نشست

آرزوئے بدلِ سوختہ ام آہ نماند
آتشے گر ز تمنائے تو برخاست نشست

اے حسرت ہمہ شور و شغبِ اہلِ سخن
تا سخن از لبِ گویائے تو برخاست نشست

می فشاند از رہِ بازی غبارِ ما بما
بازیِ طفلانہ دارد نے سوارِ ما بما

جاں بلب در آرزوئے بوسہ اش آوردہ ایم
اے فلک بگذار یکدم اختیارِ ما بما

ساغرِ بشکستۂ گل بر سرِ گلشن زدیم
چوں خزاں بگذشت بے او نو بہارِ ما بما

سوئے ما امشب چہ با ساز و نوائے آمدی
سازگاری کرد بختِ سازگارِ ما بما

یکے صد شد بدورِ نو خطِ او جوشِ سودایم
ز شہرِ سبز می آید پری بہرِ تماشایم

ز سوزِ دل چناں در راہِ شوقش گرم رفتارم
کہ داغِ سینۂ چاک است ہر نقشِ کفِ پایم

ز بارِ درد و غم دعوائے تمکیں بود با کوہم
زنم تا چشم برہم بر دو سیلِ گریہ از جایم

جنونم از نزاکت بر نتابد شورشِ داغے
زند آتش چراغِ لالہ در دامانِ صحرایم

بتغیر از من نزیبد بر کسے آئینِ آزادی
کہ آمد راست ہم چوں سرو ایں خلعت ببالایم

دماغِ من بود از بادۂ رنگیں گلستانی
بگل خندد لبِ پیمانۂ ما از رنگِ صہبایم

بہر جانب کہ رو آرم تدرو و چنگلِ بازم
رہائی کے بود از دستِ آں مژگانِ گیرایم

نہ تنہا ساغرم بر لعلِ خوباں خندہ دارد
بشیراں شیشہ می بندد بہ بزمِ بادہ مینایم

حسرت می زند جوشِ حلاوت ہا کلامِ من
کہ طوطی کردہ گفتارِ آں لعلِ شکرخایم

از چارۂ دردِ دلِ بیمار چہ پرسی
بگذشت ز تدبیر تو ایں کار چہ پرسی

تا داشت زبانی سرِ حرفے نہ کشادی
اکنوں ز دل و حالِ دلِ زار چہ پرسی

داریم سرِ رشتۂ زلفے بہ کفِ خویش
از ما سخنِ سبحہ و زنار چہ پرسی

بگذر ز من اے دل سر خود گیر کہ اکنوں | از خود خبرم نیست ز دلدار چہ پرسی
این پردۂ چشم لست حجاب رخ جاناں | تا ہست نگاہ تو ز دیدار چہ پرسی
ہشیاری ما غفلت عیش است مسرت | از ما خبر عاقل و ہشیار چہ پرسی

موجی

لالہ موجی رام موجی تخلص قوم کاتھ سری باستیہ ساکن ساتڈی جوان غریب و مہذب الاخلاق است معرفت شیخ محمد علیی تنہا بحلقہ شاگردی ایں عاصی در آمدہ شعر زبان ہندی و فارسی ہر دو میگوید اگر لطافت اصلاح بہ فہمش در آید بجائے خواہد رسید عمرش سی و چہار سالہ خواہد بود، از دست:-

اے صبا سوئے قفس گاہی گذر می کردہ باش | بلبل شوریدہ را از گل خبر می کردہ باش
در ہوایت گفتمش چوں باد سر گرداں شدم | گفت تا خاکت خورد خاکے بسر می کردہ باش
منت ساقی بکش از بہر یک جام شراب | جام دل لبریز از خون جگر می کردہ باش
گرم جوشی ہائے محبوباں بود نقشے بر آب | موجیا زیں سرد مہراں الحذر می کردہ باش

شد دل دیوانۂ من رام ہندو زادۂ | کافرے آتش پرستے دیں بدنیا دادۂ
سست عہدی سخت گوئی مثل چشمے کم نگاہ | شوخ پرکارے بمعنی و لصبورت سادۂ

نسیم صبح شاید از سر کوئے تو می آید | ز ہر گل در مشام جان من بوئے تو می آید
ازاں بر طالع زلف رسایت رشکہا دارم | کہ تا از شانہ می افتد بہ پہلوئے تو می آید
فغاں کم کن خمش موجی قیامت می شود برپا | صدائے صور اسرافیل از سوئے تو می آید

خنجر بکف چو آئینہ ابرو کماں گذشت — خلقے ز دل گذشت و جہانے ز جاں گذشت

بہرِ طواف کشتۂ تیغِ ادائے خویش — آں سروِ ناز آمد و دامن کشاں گذشت

تا رفت بہرِ کسبِ ہوا با دمن بہ بام — بر مہ گذشت آنچہ ز مہ بر کتاں گذشت

اے سنگ دل ز رحم نگاہے بسوئے او — موجی بہ شوقِ کوئے تو از خانماں گذشت

اشعارِ ہندی

روئے صنم پہ کاکلِ پیچیدہ دیکھنا — خورشیدِ حشر شام میں پوشیدہ دیکھنا

اس ضعف پر اٹھا ہی لیا میں نے کوہِ غم — اے عشق ہمتِ تنِ کاہیدہ دیکھنا

جو آہ گردنِ تاثیر کی کمند نہ ہو — کبھی وہ عاشقِ ناکام کے پسند نہ ہو

مرا صنم ہے وہ ہوش کہ جس کے مجمر کا — بغیرِ خالِ رخِ گلرخاں سپند نہ ہو

ایسے عارض کے مقابل اے مہِ کامل نہ ہو — مہر کو جز زردیٔ رو جس سے کچھ حاصل نہ ہو

کعبۂ دل کو مرے تو مت جلا اے سوزِ عشق — یہ مقامِ یار ہے تجھ پر بلا نازل نہ ہو

پیشِ محمل اس لئے روتا چلا جاتا ہے قیس — تا نہ گردِ دشت پائے ناقہ راں سے اُٹھ سکے

آوے جو صبا باغ میں گاہی ترے کو سے — بلبل کو ہو نفرت گلِ نوخیز کی بو سے

دیکھے غزالِ چشم کا گر اس کے رنگ سرخ — اپنے ہی خوں میں شیر کا پھر ہووے چنگ سرخ

کیا کہوں تجھ سے جو حالت ترے بیمار کی ہے — تا دمِ مرگ تمنا اُسے دیدار کی ہے

اس کو شبِ وصال یہی وسوسا ہوا | کیونکر چھپاؤں اپنا میں جامہ چسا ہوا
پیشِ نظر ہیں تیرے وہی بدشرا بیاں | موجیؔ میں کیونکہ مانوں کہ توبا رسا ہوا

اک زخم سے جو میں نہ موا اُس نے یہ کہا | کیا ایسے سخت جان پہ تلوار توڑئے

ترکش کمرسے اپنی اگر تم لگا چکے | ہم بھی نشانِ تیرِ بلا دل بنا چکے
ہم ابرِ گریہ صرصرِ نالہ سے بارہا | دریا کو دشت دشت کو دریا بنا چکے

خواب کو بھول گئے دیدۂ گریاں تجھ بن | جوہرِ آئینہ ہو جائیں نہ مژگاں تجھ بن

خط جو کھویا نامہ بر نے خوبیٔ تقدیر ہے | یوں ہی تھا لکھا ہمارا اُس کی کیا تقصیر ہے

رشتۂ جاں ہے مرا ہر ایک تارِ موئے دوست | بڑی دھڑک اے شانہ مت سلجھائیو گیسوئے دوست

واں حنا بندی تھی اور زلف کو سلجھاتا تھا | یہاں پریشانی تھی اور خونِ جگر کھاتا تھا

الفت نے کیا جان سے برباد ہمیں بھی | کیا دور کہیں لوگ جو فرہاد ہمیں بھی
انکار کریں عشق کا کس واسطے موجیؔ | ہے الفتِ طفلانِ پری زاد ہمیں بھی

دلا کس منھ سے میں شکوہ کروں ان گلعذاروں کا | یہ ظالم اک نگہ میں خون کرتے ہیں ہزاروں کا

مخلوق

سید احسان حسن مخلوق تخلص خلفِ میر حسن مرحوم جوانِ شائستہ و باصلاحیت است چوں بحکمِ موزونیٔ طبع کہ ارثِ خاندان اوست از ایامِ ابتدائے شباب چیزے فکر کردہ کلامِ خود را بہ برادرِ کلانِ خود نمودہ و بعدہٗ فکرِ مرثیہ و سلام ہم کردہ می کند از چند سال کہ از فیض آباد بہ لکھنؤ رسیدہ رجوعِ مشورہ گاہ گاہے بہ فقیر ہم آوردہ تا امروز عمرش سی سالہ خواہد بود و ماورائے شعر و شاعری در فنِ افسانہ گوئی ہم رونق تمام پیدا کردہ از وست :-

بعدِ مدت جو تا قفس آئی — ہم نے گُل کی صبا سے بو پائی
وادیٔ غم میں ہم نے بھی اے قیس — مدتوں کی ہے دشت پیمائی
ہم اسیروں تک لے نسیمِ سحر — کبھی دو پھول بھی نہ تو لائی
میں نہ ہوں اور غیر کی خاطر — کرو تم گھر میں مجلس آرائی
ہم سے کیوں آگے قافلہ جاتا — رکھتی پیچھے اگر نہ کم پائی
وائے حسرت قفس سے باغ میں ہم — چھٹ کے تب آئے جب خزاں آئی
پوچھا تب اُس نے حالِ دل میرا — جب زباں میں رہی نہ گویائی
دیکھتا ہوں اُسے تو کہتا ہے — کتنا ہشیار ہے یہ سودائی
چاہ کر اُس کو تو نے کی اے دل — اپنے ہاتھوں سے اپنی رسوائی
اُٹھ چلا جب وہ روٹھ کے مجھ سے — جز سماجت کے کچھ نہ بن آئی
سچ بتا تجھ کو ہے قسم گل کی — کیا صبا باغ میں بہار آئی

پھرتی ہے جو اسیرِ تازہ کی طرح — قفسِ تن میں جان گھبرائی

دیکھتے تھے جہاں سے ہم مخلوق　　اُس نے دیواڑاں سے اٹھوائی

جی کیونکہ نہ دیں اپنا ہم اُس زہرہ جبیں پر　　ثانی ہی نہیں حسن کا کوئی روئے زمیں پر

اُس کے آنے تلک سنبھل جاوے　　پھر بلا سے جو دم نکل جاوے
شمع اُس سے کرے جو دعویِ حسن　　یارب اُس کی زبان جل جاوے

چھاتی پہ نظر آئی ہے زنجیر کسی کی　　شاہد ہے اجل آج گلوگیر کسی کی
حسرت زدہ وہ خود ہے تصور میں کسی کے　　مخلوق کو دکھلاؤ نہ تصویر کسی کی

ہمیں دو جواب جوان دنوں تمھیں غیر سے سروکار ہے
نہ وہ بات ہے نہ وہ آنکھ ہے نہ وہ دوستی نہ وہ پیار ہے
مرے دل میں کرتی ہیں کاوشیں مژہ اس کی پل میں ہزار ہا
نہ وہ تیر ہے نہ سنان ہے نہ چھری ہے اور نہ کٹار ہے
جو نہی رشکِ غیر سے جل کے کل میں تمام ہاتھ پہ کھائے گل
لگے ہنس کے کہنے وہ شوخی سے مرے کیوں گلے کا تو ہار ہے
ترے دامِ زلف میں اے صنم جو اسیر ہے مرا مرغِ دل
اسے صدقے کرکے تو چھوڑ دے کہ شروعِ فصلِ بہار ہے

یادیں جو نہ مطلق ترے کوچے میں گذر ہم　　پھر تو ہی بتا یہ کہ بھلا جائیں کدھر ہم

مُہر

منصور خاں مہر تخلص برادرِ خوردِ عالم خلفِ نواب محبت خاں جوانِ شائستہ و مہذب الاخلاق است بمقتضائے موزونیٔ طبع فکرِ شعرِ ہندی می کند و آنرا بنظرِ جرأت یا فوت می گذارند، از وست:-

ایسے بے مہر کو دیا ہے دل — جس سے سو غم میں مبتلا ہو دل
مطلقاً جس میں بوئے مہر نہیں — اُسی بے مہر سے لگا ہے دل

سیماب سا دلا ہے تو بیتاب کس لئے — تڑپے ہے مثل ماہیٔ بے آب کس لئے
رہ رہ کے آئے ہے یہی اے مہر مجکو سوچ — بے مہر ہے وہ غیرتِ مہتاب کس لئے

جو درد دل سے پہلے ہی تڑپ کر جی سے جاتے ہم — تو بے دردوں کی الفت میں نہ اتنے دکھ اٹھاتے ہم
یہ ظاہر ہے کہ ہوتا ہم سے نامِ عاشقی روشن — برنگِ شمع راہِ عشق میں گر سر کٹاتے ہم
اگر ہم مطلع ہوتے تمھاری کم دماغی سے — تو صاحب خوابِ راحت سے تمھیں ہی کیوں جگاتے ہم

یہ زلفیں ہیں بکھری رُخِ مہ جبیں پر — کہ ہے حرف اب سنبل و یاسمیں پر
خدانے جو تجھ سا کیا یار پیدا — تو رشک آئے ہے آسماں کو زمیں پر
کوئی دھیان سے جائے ہی دھیان اُس کا — کھدا جس کا ہو نام دل کے نگیں پر
زباں پر جو مضطر ترا آہ لادے — تو پہنچے ابھی دم میں عرشِ بریں پر

مست

مست تخلص نوادۂ محمد قاسم خاں، جوانِ وجیہہ و شجاع و خوش وضع است از دو سال لباسِ گیروی پوشیده و دستِ حاجت از ملاقاتِ اغنیا در آستین کشیده بہ پروائی باوصفِ عیال داری بسر می برد و در فنِ موسیقی[1] یگانۂ عصر چوں موزونیٔ طبع نیز داشت چیزے کہ موزوں کردہ بود بہ نظرِ فقیر گذرانیده، از وست:۔

دکھاؤں تجھے ایک نقشہ مصور — رہے گر ترا ہوش برجا مصور
نہ کر[2] دھیان نازک خیالی کا اسکی — لیا ہے تجھے وہم نے کیا مصور
جو کھینچے گا تصویر تو اس پری کی — تو ہو جائے گا تجھکو سودا مصور

مسرور

شیخ پیر بخش مسرور تخلص ولدِ حکیم حیات اللہ متوطنِ قصبہ کاکوری نواسۂ حکیم خیر اللہ جوانیست موزوں طبع ہمیشہ پیشِ جدِ مادریٔ خود در لکھنؤ پرورش یافتہ و فنِ طب آموختہ از ابتدائے سنِ بلوغ طبعش باشعارِ اساتذہ بیشتر میل می نمود و دراں ایام خود ہم چیزے موزوں میکرد کلامِ منظوم خود را بجائے خود نگاہ می داشت و در پئے ایں بود کہ کدام استاد را بہ نظر بگذرانم تا حسن و قبحِ آں واقف شدم آخر حسبِ اتفاق در ۱۲۲۰ھ رجوع بہ فقیر آوردہ حالاکہ مشقِ او بدوازدہ سال رسیدہ وضعِ موزونیش در ریختہ احیائے دلِ مردگان می کند و دریں فن از معاصرینِ خویش پائے کمی نمی آرد بلکہ شیریں گفتاریش نمک بر

---

(۱) ن۔ و در فن موسیقی دخلے دارد۔

(۲) ن۔ خیال اس کی نازک کمر کا اگر ہے۔

جراحتِ عشق بازاں می باشد عمرش تا امروز سی و یک سالہ خواہد بود، از وست:۔

گلشن میں نہ کر تن سے جدا پیرہن اپنا — غنچے کو دکھا یار نہ گل سا بدن اپنا
گلشن میں جو جاتا ہے مرا مہرِ درخشاں — پتوں میں چھپا لیتے ہیں منہ یاسمن اپنا
اُس بن میں مجھے لے گئی وحشت کہ جہاں تھا — نہ یار نہ مونس نہ کوئی ہم وطن اپنا
خسرو کی دغا سے اُسے آگاہی جو ہوتی — جی مفت میں دیتا نہ کبھی کوہ کن اپنا
گردستِ جنوں کی یہی چالاکی ہے مسرورؔ — تربت میں بھی ثابت نہ رہے گا کفن اپنا

تربت پہ مری کوئی صنم خانہ بنا دو — معلوم کریں تا کہ اُسے عشقِ بتاں تھا
اُس کشتۂ دیدار کے اوسان تو دیکھو — جو ذبح کے دم تک سوئے قاتل نگراں تھا
تو سن بھی نہ داں آ کے کبھی شوخ نے پھیرا — جس جا کہ شہیدانِ محبت کا نشاں تھا
مسرورؔ رہا کیا کوئی واماندہ بچھڑ کر — جو یوں جرسِ قافلہ سرگرمِ فغاں تھا

اک نالہ میں اُس دم دلِ سوزاں سے نکالا — دربان نے جو مجکو درِ جاں سے نکالا
ہرگز نہ کھلا مجھ پہ کہ کیوں بادِ صبا نے — جوں نکہتِ گل مجکو گلستاں سے نکالا
جو خار مرے پا میں چبھا اُس کی گلی کا — اُس خار کو میں سوزنِ مژگاں سے نکالا

فرس وہاں جو نہی اُس شہسوار کا پہنچا — نشاں عدم کو ہمارے مزار کا پہنچا
کہا یہ جھاڑ کے گرد اُس نے اپنے دامن کی — غبار یہاں بھی کسی خاکسار کا پہنچا
ابھی سے باغ میں کرتی ہے پہچہے بلبل — پیام کیا اسے فصلِ بہار کا پہنچا

لڑکوں کی فوج ساتھ ہے اور حال غیر ہے — وحشی مزاج ہوں میں مجھے اس میں سیر ہے

کون سے بختِ سیہ پر ہے بلا آئی ہوئی
زلفِ جاناں جو نظر آئی ہے بل کھائی ہوئی

دوڑ دوڑ اُس پاس جانے سے ہوا اظہارِ عشق
پردہ دار اے ولے اپنی ناشکیبائی ہوئی

اپنے بیگانے ہوئے بیزار تیرے واسطے
یہ ستم ہم نے اٹھایا یار تیرے واسطے

کیا غضب ہے تو کبھی غرفے سے بھی جھانکا نہ آہ
ہم ہوئے رو رو پسِ دیوار تیرے واسطے

دور سے مسرورؔ کو شکل اپنی دکھلا دے میاں
ہے کھڑا وہ بر سرِ بازار تیرے واسطے

اس صفائی کی مری جان تری پیشانی ہے
مہِ تاباں کو جسے دیکھ کے حیرانی ہے

سبزہ رنگوں کی یہ ہے زہرِ محبت کا اثر
بعد مردن جو تنِ زار مرا دھانی ہے

حالت ہماری نوعِ دگر گر ہوئی تو کیا
مرنے کے بعد اُس کو خبر گر ہوئی تو کیا

تاب و تواں تو صاف ہیں دے گئی جواب
بے طاقتی شریکِ سفر گر ہوئی تو کیا

بولا نہ وہ ہی منہ سے نہ کچھ بات میں نے کی
اک بت سے صحبت آٹھ پہر گر ہوئی تو کیا

محروم جب ہیں رہے قاتل کے ہاتھ سے
تلوار اُس کی زیبِ کمر گر ہوئی تو کیا

قیدی ہوا ہوں جب سے میں زلفِ سیاہ کا
اٹھا ہی پیچ دار دھواں میری آہ کا

اللہ رے رعبِ حسن کہ قاتل کے سامنے
اٹھا نہیں ہے ہاتھ کسی دادخواہ کا

وہ ننگِ خلق ہوں کہ جسے اہلِ کارواں
نہ ساتھ لے چلیں نہ پتا دیویں راہ کا

یہ فیضِ مصحفیؔ ہے کہ مسرورؔ ان دنوں
ہر سمت غلغلہ ہے تری واہ واہ کا

زور رانا جبکہ یہ دیوان پن دکھلائے گا
ہے یقیں مجکو نیا ہر روز بن دکھلائے گا

ہر گھڑی شام غریبی میں یہ آتا ہے خیال — دیکھیے کس دن خدا صبحِ وطن دکھلائے گا
اس لبِ پان خوردہ کا گر شہر میں شہرہ ہوا — منھ نہ پھر بازار میں لعلِ یمن دکھلائے گا
زلفِ مشکیں کا یہ سودا ایک دن مسرور آہ — اس دلِ وحشی کو صحرائے ختن دکھلائے گا

زلفوں میں رخِ یار نہاں ہو نہ سکے گا — شعلے سے تو ہم سر یہ دھواں ہو نہ سکے گا

تیرِ نگہ میں کیا ترے افسوں تھا اے صنم — گر کر زمیں پہ جو نہ غزالِ حرم اٹھا
عاشق سے کچھ ہوا نہ سوا جان دینے کے — آخر وہ مر گیا ترے جور و ستم اٹھا
پریوں کا جھنڈ تھا ترے کشتے کی نعش پر — اس طرح سے جنازۂ عشاق کم اٹھا
مسرور ہم لکھا کیے وصفِ پری رخاں — کاغذ سے ایک دم بھی نہ اپنا قلم اٹھا

جیتے جی ہم نے کہیں عشق کا چرچا نہ کیا — جان دی اپنی و لے یار کو رسوا نہ کیا
کس سے کرتا میں بھلا شکوۂ ایامِ فراق — اُس کو اور مجکو فلک نے کبھی اِک جا نہ کیا
ایک عالم ہوا انگشت بدنداں مسرور — غم مرے مرنے کا اُس شوخ نے اصلا نہ کیا

اُس کے کوچے میں نت صبح گیا شام آیا — عمر گذری یونہی پر وہ نہ لبِ بام آیا
حیف صد حیف نہ نکلی دلِ شیدا کی ہوس — وصل کے روز ہیں موت کا پیغام آیا
میں نہ کہتا تھا کہ عشق اے دلِ ناداں مت کر — گور میں مجکو سلا کر تجھے آرام آیا

کب درپئے ایذا غمِ ہجراں نہیں ہوتا — کس روز یہ دل مرگ کا خواہاں نہیں ہوتا
جی الجھے ہے دم رکتا ہے ایامِ جنوں میں — پرزے مرا جب تک کہ گریباں نہیں ہوتا

رہ جائیے یہ ہوس نہ دمِ واپسیں ہمیں — دکھلائیے اپنی شکل ٹک اے مہ جبیں ہمیں
مر مٹئے اس کے در پہ یہی مدعائے دل — اے اضطراب یہاں سے نہ لیجا کہیں ہمیں
غصّے میں آکے ہم پہ نہ تلوار کھینچئے — کرتی ہے قتل آپ کی چینِ جبیں ہمیں
جاوے گا اُس کے عشق میں صبر و قرار بھی — مسرور دل کے ہاتھ سے تھا یہ یقیں ہمیں

ہجر کی رات ہو تو وصل کا ساماں مانگوں — وصل کا دن ہو تو میں پھر شبِ ہجراں مانگوں

اے ہمرہاں نہ جلد چلو ناتواں ہوں میں — ٹھہرو ٹک ایکدم کہ پسِ کارواں ہوں میں
ہر دم بسر کروں ہوں سرِ شاخِ نخل پہ — مدت ہوئی ہے مجکو کہ بے آشیاں ہوں میں
ٹھہرا کے ناقہ راہ میں لیلےٰ نے کیوں کہا — اک ناتواں کی منتظر اے سارباں ہوں میں
ہے آہ کا مقام جو عرشِ بریں پہ تو — نالہ کہے ہے سیرکنِ لامکاں ہوں میں
گلگشت کی ہوس ہے کسے دوستی کے ساتھ — صرفِ خیالِ رنگِ رخِ گلرخاں ہوں میں
کیا غم ہے ناتوانی نے جو پیر کردیا — صدمہ اٹھانے کو تو ابھی نوجواں ہوں میں
گھبرا کے دل نکل نہیں جاتا شبِ فراق — مسرور سچ تو یہ ہی عجب سخت جاں ہوں میں

کوئی دیتا ہی نہیں گورِ غریباں سے جواب — روز ہم جا کے عزیزوں کو پکار آتے ہیں

چتون تو لگاوٹ کی نظر آتی ہے مجکو — یہ زلفِ سیہ دیکھ کے بل کھاتی ہے مجکو
بے چین ہوں اور نیند نہیں آتی ہے مجکو — کیا ہجر کی شب دیکھئے دکھلاتی ہے مجکو
وہ قتل کا مائل جو نہ ہووے تو نہ ہووے — تیغِ اُس کی تو خواہانِ اجل پاتی ہے مجکو

شکلِ عقرب ہوئے جب کان کے بالے مجکو — بن ڈسے رہتے ہیں کب زلف کے کالے مجکو

تیرہ روزی اسے کہتے ہیں مرے مہ رو نے — زلفِ مشکیں کے کیا اُسکے حوالے مجکو

آرزو ہے کہ تری بزم میں اِک دم ساقی — لڑکھڑا کر میں گروں اور تو سنبھالے مجکو

ایسی تقدیر کہاں ہے کہ پئے عذرِ گناہ — میں پڑوں پاؤں گلے سے وہ لگالے مجکو

اے جنوں کرنے دے آرام مغیلاں کے تلے — رنج دیتے ہیں بہت پاؤں کے چھالے مجکو

چشمِ گریاں کا ہے احسان مری گردن پر — موتیوں کے یہ پنہا دیتے ہیں مالے مجکو

میں اس انداز کے یہ شعر کہے ہیں مسرور — قدرداں ہو تو اُڑھا دیوے دوشالے مجکو

مجکو کرنا وہی جو بات کرے یار پسند — وہ جو کافر ہے تو کیا میں نہیں زنار پسند

ہر شبِ وصل بدن کو نہیں چھونے دیتے — مجکو آتی نہیں یہ آپ کی تکرار پسند

جس سے جانے ہے کہ پیتے ہی شفا ہوتی ہے — اُسے کرتا نہیں ہرگز ترا بیمار پسند

لختِ دل میرے رقیبوں کو نہ بھائے تو کیا — چیز وہ کیا نہ کریں جس کو کہ دو چار پسند

گرد رہتے ہیں بلاؤں کی طرح سے دونوں — تیری زلفوں کو ہیں شاید تری رخسار پسند

اک غزل اور بھی اس بحر میں کہہ اے مسرور — کیونکہ لوگوں کو ہیں اکثر ترے اشعار پسند

بس کہ مضمونِ دہن ہے اُسے ہر بار پسند — طبع کمبخت ہوئی اپنی بھی دشوار پسند

میرے لاشے کو وہ ٹھکرا کے لگے یوں کہنے — کھول آنکھیں جو تجھے ہے مری رفتار پسند

مہجور

شیخ محمد بخش مہجور تخلص خلفِ حکیم خیر اللہ کہ مشارٌ الیہ در فتحپور استقامت می داشت واز چند سال بحسبِ اتفاقِ آبخور در لکھنؤ آمدہ بہ محلہ مفتی گنج توطن گزیدہ، جوانِ ظریف الطبع

و مہذب الاخلاق است از ابتدائے شباب سرے بہ گفتن شعر بودش و آں روزہا بشاگردی
جرأت سر مباہات می افراخت و حالا ہم از مستفیدانش شمردہ می شود اگرچہ بہ فقیر ہم اعتقادے
از مدت داشتہ و میدارد و شش کتاب در زبانِ اردوئے ریختہ شکر آمیختہ از خامۂ فکرش
رونق سوادہ پذیرفتہ و دوستانِ معنی پرست اکثر نقلہایش برداشتہ بر طاق دلش جا دادند
عمرش چہل و پنج سالہ خواہد بود، از وست :-

بازار عشق میں کوئی لیتا نہیں مجھے
جنسِ زبوں ہوں یا کہ متاعِ گراں ہوں میں

مہجور ہوں مریض کسی پردہ پوش کا
چشمِ اجل سے ہائے جو اب تک نہاں ہوں میں

آنکھ اُس سے خدا جانے کس وقت لڑی تھی
پر اتنا تو ہے یاد کہ بجلی سی پڑی تھی

تھا چشمۂ حیواں پہ سیہ ابر کا ٹکڑا
یا شب لبِ جاناں پہ وہ مستی کی دھڑی تھی

اُس شوخ کی فرقت میں میں کس کس کو مناؤں
مچلائی یہ دل آج ہر کل سانس اڑی تھی

دنیا میں کسی سے کوئی امید رکھے کیا
جیتے جی توقع اُسے یہاں جس باکی بڑی تھی

سو آہ وہ بھولے سے کبھی جانہ پھرا داں
مہجور سو بے کس کی جہاں نعش گڑی تھی

شور سے تیرے تو ہمسایوں کا ہے ناک میں دم
اتنا رسوا نہ کرائے نالۂ شب گیر مجھے

خواب میں دیکھی تھی وہ زلفِ پریشاں سو آہ
ہو گا سودا یہی سب دیتے ہیں تعبیر مجھے

اے رشک نہ کھو آبرو اس دیدۂ تر کی
ہم کو تو توقع نہیں کچھ تجھ سے اثر کی

مہدی

نواب مہدی علی خاں مہدی تخلص ساکنِ بنارس جوانِ شوریدہ مزاج دار متوسلان

نواب قاسم علی خاں صوبہ دارِ بنگالہ است عمرش سی سالہ خواہد بود، چیزے بمقتضائے موزونیٔ طبع موزوں می کند و دیوانے ترتیب دادہ است مطلعے از زبانیٔ منور خاں غافل بسمع رسیدہ۔ اینست:-

قطرۂ اشک جو نہی تا بُنِ مژگاں آیا　　مردمِ دیدہ لگے کہنے کہ طوفاں آیا

مضطر

پنڈت کشمیری مضطر تخلص جوانِ سادہ رو است در مشاعرۂ لالہ موتی رام دیدمش عمرش ہیژدہ سالہ خواہد بود شاگردِ طالب است مطلع خوبی بسمع رسیدہ و چند شعر نیز نوشتہ شد نومشق است، از وست:-

چھڑایا ہاتھ سے میرے اگر دامانِ دلبر کو　　فلک تیرا گریباں گیر ہوں گا روزِ محشر کو

جو فضا سینۂ پر داغ میں ہے میرے صنم　　دیکھنے کو وہ کہاں تختۂ گلزار میں ہے
دیکھے کس شکل سے صورت کبھی مضطر اے وائے　　ایک رخنہ بھی نہیں وا تری دیوار میں ہے

مشہور

مشہور تخلص، شاگردِ میاں پیر بخش مسرور، جوانیست کہ پیشہ علاقہ بندی بسر می برد و پیش ازیں او ہم قصد شعر بانی کردہ بود بمشارٌ الیہ مشورہ آں می برد دریں ایام کم نظر می آید شاید دیگِ سودایش سرد شدہ عمرش تخمیناً بسی رسیدہ باشد حسب و نسبش اطلاع ندارم از وست:-

رخ پہ وا زلف کو اپنی جو نہ خوباں کرتے　　حال یوں کا ہے کو ہم اپنا پریشاں کرتے
گر دکھا دیتا وہ ہم کو رُخِ روشن اپنا　　تیرا نظارہ نہ ہم اے مہِ تاباں کرتے

اے جنوں تجھ سے نہ رکھتے جو سروکار تو ہم — تا بدامن نہ کبھی چاک گریباں کرتے
تو جو آتا نہ تو گل کھا کے تری فرقت میں — تن پہ داغ کو ہم رشکِ گلستاں کرتے
جان جاتی ہے نکل اپنی یقیں تھا ہم کو — گر جدا سینے سے وہ تیر کا پیکاں کرتے
آرزو دل کی بر آئی مری اے ہم نفساں — وہ جو مجکو ہدفِ ناوکِ مژگاں کرتے
اتنی رسوائی نہ حاصل مجھے ہوتی مشہور — رازِ الفت جو مرا یار رہی پنہاں کرتے

ہووے گی تیرے سوا حل یہ مری مشکل کہاں — نیم جاں کر کے مجھے جاتا ہے تو قاتل کہاں
خون ہو کر بہہ گیا آنکھوں سے میری وہ تمام — تیری فرقت میں رہا پہلو میں میرے دل کہاں
تیری ہی باعث سے ہے اک مجمعِ خلق اس جگہ — تو گیا تو اے صنم پھر رونقِ محفل کہاں
دوڑتا پھرتا ہے مجنوں ہر طرف کو بے حواس — شاہدِ حی کا خدا جانے گیا محمل کہاں
تجھ سے حبیب محروم عاشق رہ گیا روزِ وصال — ہووے گی دل کی تمنا پھر بھلا حاصل کہاں
ڈوبتے ترتے ہوئے جاتے ہیں بحرِ عشق میں — ہم کو کیا معلوم ہے کشتی کہاں ساحل کہاں
شاہِ خوباں جان کر آیا ہوں مت محروم پھیر — چھوڑ کر یہ در بھلا جاوے ترا سائل کہاں
کس قدر ہے اس کا شوقِ پائے بوسی دیکھنا — آئے ہے ہر دم تڑپ ظالم ترا بسمل کہاں
کچھ خبر یارانِ رفتہ کی تجھے مشہور ہے — تیری ساتھی چل بسے بیٹھا ہے تو غافل کہاں

مفتوں

نواب فصیح اللہ خاں مفتوں تخلص خلفِ نواب نصر اللہ خاں، جوانِ خوش گفتار است در رام پور شاگردِ احمد خاں غفلت بود، چوں[1] در لکھنؤ گذر افگندہ بمشاعرہ میر صدر الدین

---

(۱) ن۔ ہر گاہ کہ واردِ لکھنؤ گردید اول کلامِ خود بہ میر صدر الدین معائنہ کنانید بعد فقیر را معائنہ کنانید۔

کلامِ خود را خواند بعدِ آں بموجب گفتۂ استاد خود بملاقاتِ فقیر آمدہ کلامِ منظومِ خود را بخامۂ اصلاح فقیر رسانید عمرش بست و پنج سالہ تخمیناً خواہد بود، از وست :-

چلمن کو اٹھا منھ جو دکھایا ہے کسی نے
جوں شمع مرے جی کو جلایا ہے کسی نے

عشاق کے شب خوں کا ارادہ ہی مگر کیا
مسی پہ لکھوٹا جو جمایا ہی کسی نے

مفتوں کے تئیں دیکھ کہا میں نے جو تو آج
غمگین ہے کیا تجکو ستایا ہی کسی نے

تو بھر کے وہ اک آہ لگا کہنے کہ مت پوچھ
دل لے کے ہمیں دل سے بھلایا ہی کسی نے

وہ کیفیت نہ دیکھی میں چمن کی آبِ جاری میں
نظر جو لطف آیا چشم تر کی اشکباری میں

ترے مفتوں کا جو دن آہ و نالہ میں گذرتا ہے
کٹے ہی رات اے رشکِ قمر اختر شماری میں

منیر

خلف الرشید میاں نصیر جوانِ خوش فکر است ہمراہ پدرِ خود بہ لکھنؤ آمدہ و باز بہ دہلی رفتہ عمرش تخمیناً بست سالہ خواہد بود، از وست :-

رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑ کائے ہی
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

محسن

محسن[1] تخلص برادر زادۂ خواجہ حسن کہاری جوانِ موزوں طبع و خوش گفتار است او ہم بطریقِ ندرت بمشاعرۂ مرزا تقی ہوس آمدہ دریں زمیں ایں غزل خواندہ بود، از وست :-

لگا مت بے تامل تیغ ظالم میری گردن پر
رہیں گی حشر تک چھینٹیں لہو کی تیرے دامن پر

---

(۱) ن - میر محسن محسن تخلص ولد خواجہ حسین ۔ یہ شعر ذوق کا ہے (مرتب)

زبس رو ز ازل سے آتشِ ہجراں میں جلتا تھا　　بجائے ابرِ رحمت آگ برسی اپنے خرمن پر
مقابل اُس کے راکب سے کہاں خورشیدِ تاباں ہو　　گمانِ ماہِ نو پڑتا ہو جس کے نعلِ توسن پر
ہوا ہے تازہ محسنؔ داغِ سودا موسمِ گل میں　　گریباں پر کبھی دستِ جنوں ہے گاہ دامن پر

ردیف (ن)

نزہت

مولوی برہان الدین محمد ولد سرفراز علی متوطنِ دتوہ طبعِ موزوں می دارد گاہے فکرِ شعرِ ہندی و ہم فارسی خیال می کردند از اتفاقات در کلتیا ٹولہ متصلِ فقیر خانہ فروکش شدند اصلاحِ سخن فقیر کردہ، از وست :-

نے ہمیں سینہ و دل آتشِ پنہانم سوخت　　کز تفِ شمع رخت دیدۂ گریانم سوخت
ماتمِ تازہ شد از مردنِ مجنوں در نجد　　بے کسی ہائے غزالانِ بیابانم سوخت
چہ تواں کرد ہمہ مایۂ دیں داریٔ دل　　نگہِ نازبتِ دشمنِ ایمانم سوخت
چند روز است کہ خونِ دلِ عاشق نچشید　　جگر از تشنگیٔ آہنِ پیکانم سوخت
یک زماں ہم نہ دہد فرصتِ خوابم نزہتؔ　　شیون و نالہ دگر در شبِ ہجرانم سوخت

فتنہ را بے خوابیٔ از نرگسِ فتانِ اوست　　شعلہ افروزِ بلاہا دامنِ مژگانِ اوست
از قیامت قامت آں سروِ پادے می دہد　　گردۂ دامانِ محشر گردشِ دامانِ اوست
نرگسِ گلزارِ چشمِ نیم خوابش گر ندید　　محوِ دیدارِ کہ یارب دیدۂ حیرانِ اوست
صحتِ بیماریٔ نزہتؔ بسے مشکل بود　　کز تفِ عشقِ نہاں سوزانِ دلِ بریانِ اوست

نامی

مولوی بخش اللہ ولد مولوی امر اللہ نامی تخلص شخصِ خوشنویس وجامع الکمالات است مصنفستان درجوابِ گلستانِ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گفتہ و بوستان را ہم بجواب پرداختہ بکمالِ خویش بلند پرواز است درخوبیہائے چند بستہ شعرے درزمان حسب اتفاق در وصفِ او است شنیدم بقلم داد م عمرش تخمیناً از ہفتاد متجاوز خواہد بود خود را شاگرد قمر الدین منت می گوید، از وست :-

فلک پشت خورشید زین قطب دم ‏ ‏ قمر تاج سیارہ مریخ ہم

نگاہ

شیخ حیدر علی قریشی نگاہ تخلص ولد شیخ نوازش علی بزرگانش سکنہ لاہور بودہ اند و سوداگری پشمینہ واسپ می کردند خودش در لکھنؤ تولد یافتہ باقتضاے ایامِ جوانی مزاجش شورش دوست افتادہ بسرے بگفتنِ شعرِ ہندی پیدا کردہ ومشورۂ آں بفقیر آوردہ از نتائجِ طبعِ اوست :-

جاؤں وہاں کسی کا گذارا جہاں نہ ہو ‏ ‏ دعویٰ کروں تو وہ جو سنے وہ ہاں نہ ہو
اعجازِ خضر ہے سخن اپنا تو اے نگاہ ‏ ‏ آگے مرے کلیم کے منہ میں زباں نہ ہو

روزِ اول سے مقدر میں گرفتاری ہے ‏ ‏ ہنسلی گردن کی مجھے طوق سے بھی بھاری ہے
ہے بڑا فرق مرے یار میں اور یوسف میں ‏ ‏ سخت بے قدر ہے جو چیز کہ بازاری ہے
لاکھ آنکھوں میں زمانے کی سبک ہو جاؤں ‏ ‏ دوش پر یاروں کے مردہ بھی مرا بھاری ہے
منزلِ خوف جہانِ گذراں ہے یہ نگاہ ‏ ‏ چل بسے یار مرے کوچ کی تیاری ہے

چشمِ سیاہِ یار کو کرتی ہے بنگ سُرخ — پوشاک پہنتے ہیں سلاطیں بہ رنگ سرخ

مارے خوشی کے یار کے آتے ہی مر گیا — زندہ سے ہو فزوں مرے مرنے کا رنگ سرخ

کشتہ تھا لعب و بازیٔ طفلاں کا بسکہ میں — خورشید روزِ حشر کو سمجھا پتنگ سرخ

کھاتا ہے جوشش خون مری خاک سے گیاہ — مہندی نے پھر کیا کسی قاتل کا چنگ سرخ

جلادِ چرخ سے نہ ملا خوں بہا مجھے — تیغِ اجل ہے قبضۂ مشکل کشا مجھے

لیلیٰ نے تو کہیں نہ لگایا ہو اُس کو ہاتھ — آتی ہے نخلِ بید سے بوئے حنا مجھے

شاید مزاجِ یار کا کچھ اُس کو پاس ہے — دیتا نہیں جو عیسیٰ مریم دوا مجھے

وہ تیرہ بخت ہوں میں کہ مثلِ قلم سدا — میری زباں رکھے ہے اسیرِ بلا مجھے

روپوش یہ جہاں سے ہوا ہیں کہ خلق نے — پایا نہ زندگی میں بہ رنگِ ہما مجھے

دے نہ تکلیفِ سفر مجکو جوانی میں اجل — کون اس موسمِ گرما میں وطن سے نکلے

سر کو دھنتی ہے گلستاں میں نسیمِ سحری — نکہتِ گل تو الٰہی یہ چمن سے نکلے

سرد مہری کا ترے دھیان جو یار آتا ہے — گور میں بھی مجھے لرزے سے بخار آتا ہے

دم نکل جائے تو چھٹ جاؤں میں اس صدمے سے — نالہ کرتا ہوں تو منھ تک دلِ زار آتا ہے

مجھ مصیبت زدہ کو موت ہی آوے اے کاش — یار کو رحم نہ مجکو ہی قرار آتا ہے

روحِ مجنوں کی لپٹتی ہے بگولا بن کر — عرصۂ نجد میں جو ناقہ سوار آتا ہے

لاؤ بالی کی محبت میں رکھو . . جان — یار ہرجائی سے دل پر جو غبار آتا ہے

ٹھگ تھا وہ کہ واقف نہ ہوا جس کی میں خو سے — پھانسی دی مجھے میری ہی گھلائے گلو سے

کیا نامہ بری کی تھی کسی خستہ جگر کی — بال و پر جبریل ہیں آلودہ لہو سے

ناصر

میرزا میر ناصر تخلص شاگردِ خواجہ حیدر علی آتش، جوان . . . . وسپاہی وضع بود شعر را بطوریکہ دریں زمانہ کم کم رواج یافتہ می گفت و برخود می بچید قضائے کار روز مشاعرہ ارادہ آمدنِ مشاعرہ کردہ از خانۂ خود درواں شدہ بود کہ در اثنائے راہ بابت کودکی(۱) حسین بہ پیادہ ہائے چوکی مناظرہ درمیان آمد حتیٰ کہ نوبت بکشت وخوں رسید آخر بزخم شمشیر زندگانی را جواب دادہ. شہادتش درسنہ یکہزار و دوصد وسی است عمرش از سی متجاوز خواہد بود، ازوست:-

چشم و گردن کا تیرے شب بزم میں افسانہ تھا — تھی تہی قالب صراحی سرنگوں پیمانہ تھا
ہم سے وہ آئینہ رو کس طرح ہوتا صاف دل — دودِ آہ اپنا غبارِ خاطرِ جانانہ تھا
قبرِ ناصر سے بقولِ درد آتی تھی صدا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

نہ دیتے کس طرح بوسہ لبِ جاں بخشِ جاناں پر — غضب ہی تشنہ رہ جانا پہنچ کر آبِ حیواں پر
دہانِ ہرزہ گوئی بند کرنا خوب ہے ناصر — غبار آنے لگے آئینۂ نازک خیالاں پر

نذرِ لحد بعدِ فنا ہوگئے — دین سے ہستی کے ادا ہوگئے
سینہ خراشی سے کھلا رازِ عشق — ناخنِ غم عقدہ کشا ہوگئے
شمع کے مانند جلے استخواں — داغ مرے حق میں ہما ہوگئے
تیغ کا احساں مری گردن پہ ہی — سیکڑوں مطلب تھے ادا ہوگئے

---

(۱) ن- در راہ بابت زنے نوبت کشت وخون آمدہ از زخم شمشیر زندگانی راجواب داد-

روئیے احوال یہ ناصر کے کیا ہم بھی گرفتارِ بلا ہو گئے

نصرت

پنڈت کشمیری نصرت تخلص پیش[1] شاگردِ جرأت بود دریا میکہ لالہ موتی لال مشاعرہ شروع کردہ اکثرے از نوجوانانِ ہندی گو بحلقہ شاگردی میاں نصیر کہ بارِ دگر از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ آمدہ بودند درآمدند او نیز استادی ایشاں را برخود مسلم داشت عمرش بچہل خواہد بود، از وست:-

اُٹھ گیا آغوش سے میری جو وہ دلبر کہیں
چین ہی پاتا نہیں ہے یہ دلِ مضطر کہیں

بن ترے اپنے پریشاں ہیں سبھی سامانِ عیش
مے کہیں مطرب کہیں ساقی کہیں ساغر کہیں

یار و جانے کی ہوس مجکو نہ گلزار میں ہے
طرفہ تر سیر مرے دیدۂ خونبار میں ہے

ہم تو اک دم نہ ٹلیں پھر کہیں گھر سے جاناں
دیکھیں گر کچھ بھی درستی ترے اقرار میں ہے

طرفۃ العین میں دل کو کیا نصرت تسخیر
کیا عجب طرح کا افسوں نگہِ یار میں ہے

جان کر جنسِ محبت کا خریدار مجھے
لے لیا نقدِ دل اپنا سرِ بازار میں ہے

دل تڑپتا رہا جوں طائرِ بسمل شبِ وصل
ہاتھ اٹھایا مرے سینے سی جو اکبار اُس نے

دل مرا کیوں نہ ہو خاموش برنگِ غنچہ
باغِ گیتی میں نہ پایا لبِ اظہار اُس نے

دیکھ کر اُس کو ہوا ہے دلِ عالم پامال
ہمدموں ان دنوں سیکھی ہے یہ رفتار اُس نے

دیکھ لیتے تھے بہر شکل جدھر سے نصرت
بند وہ آج کئے رخنۂ دیوار اُس نے

ناصر

سعادت خاں ناصر تخلص شاگردِ مذنب است، از وست :-

---

[1] ن۔ اول۔

بیتاب ہے مدت سے دلِ زار بغل میں
آجائے کہیں شوخِ طرحدار بغل میں

سو طرح کے صدمے نہ مری جان پہ ہوتے
اک رات جو سوتا مرا دلدار بغل میں

کرتا تھا میں جن لوگوں کی صحبت سے اُسے منع
اُن لوگوں کی رہنے لگا اب یار بغل میں

کچھ بس نہ چلا اُس بتِ بے پیر کے آگے
سر اپنا جھکا میں دیا شمشیر کے آگے

لے مجکو گئی خانۂ زنداں میں جو وحشت
میں پاؤں کو پھیلا دیا زنجیر کے آگے

کل سیرِ گلستاں میں خراماں جو ہوا تو
تھے کبک بھی حیراں تری رفتار کے آگے

ناصر تپِ دوری سے عبث ہوتے ہو بےچین
تم سے جو علاجِ خفقاں ہو نہیں سکتا

نزار

خواجہ محمد اکرم نزار تخلص، از وست:-

کیا کہیے غضب صبر کا مقدور نہیں ہے
اک زخم نہیں دل پہ کہ ناسور نہیں ہے

آتا ہے تو آجا مری بالیں پہ وگرنہ
کوئی دم کو سنے گا کہ یہ رنجور نہیں ہے

کیا پرسشِ احوالِ جگر سوختۂ عشق
اس مملکتِ عشق میں دستور نہیں ہے

نزار

سید قاسم علی نزار ولد میر احمد علی ابنِ میر علی حسین وطنِ بزرگانش مشہدِ مقدس بوده از عہدِ فردوس آرام گاه بہ شاہجہاں آباد استقامت ورزیدند و بداروغگی بوماٹ[1] نویسی صرفِ خاص از حضورِ پر نور مامور شدند و خودش در فیض آباد متولد شده و بہ لکھنؤ نشو و نما یافتہ شوقِ شعر از دو سال دامنِ دلش بسوئے خود کشیده یک و نیم سال گذشتہ باشد کہ کلامِ خود را بہ قلم

---

[1] یہ لفظ اسی طرح لکھا ہوا ہے (مرتب)

اصلاحِ فقیر در آوردہ و دریں عرصۂ قلیل دیوانے درست ساختہ عمرش سی و ہشت سال بحساب آمدہ، از وست :-

پاسِ عزت ہی نہ کچھ دھیان ہے رسوائی کا
حال پہنچا ہے یہاں تک ترے سودائی کا

ٹھوکریں کھاتے ہیں اُس کوچہ میں سر انکے مدام
جن کو دعویٰ تھا ترے در پہ جبیں سائی کا

لاکھ سمجھائیں اُسے پر وہ سمجھتا ہی کوئی
جو کہ مغرور ہو نت اپنی ہی خود رائی کا

دلِ بیتاب کو مطلق نہیں پہلو میں قرار
جب سے عاشق وہ ہوا ایک بتِ ہرجائی کا

کفِ پا ہو گئے گو خارِ مغیلاں سے فگار
اس پہ بھی حوصلہ ہے مرحلہ پیمائی کا

بیٹھے بیٹھے کبھی ہنستا ہے کبھی روتا ہے
قابلِ سیر ہے عالم تری سودائی کا

دور سے آنکھ چراتے ہیں ستارے اُسے دیکھ
زور عالم ہے شبِ ہجر میں تنہائی کا

بھیجا اُس شوخ نے نت وصل کا پیغام نزار
کام آخر ہوا جب زور و توانائی کا

چشمِ بلبل ہی نہیں شیفتہ رخسار کو دیکھ
محو ہے کبکِ دری بھی تری رفتار کو دیکھ

وعدہ تھا صبح کے آنے کا نہ آیا اب تک
اک ذرا اپنی تو بد عہدی و اقرار کو دیکھ

دردِ فرقت سے جو وہ پہنچا ہلاکت کے قریب
رو دیا عیسیٰ نے آخر ترے بیمار کو دیکھ

قتل پر غیر کے جس وقت وہ ہوتی ہے علم
جوش کھاتا ہے مرا خوں تری تلوار کو دیکھ

آگ سوجا یہ لگا دی فلکِ اخضر میں
جا کے پہنچی ہے کہاں آہِ شرر بار کو دیکھ

تھی یہ تسلیم کی جا گہ بزیرِ دمِ تیغ
دم نہ مارا ایں رخِ قاتلِ خوں خوار کو دیکھ

حالِ دل کیا نہیں معلوم ہے میر الحب کو
ناتوانی مری اور عشق کے آزار کو دیکھ

کر جائے سفر جلد کہیں جان بھی تن سے
چھٹ جاؤں میں تا روز کے اس رنج و محن سے

اکدم میں نزار اُس نے کی آخر جو شبِ وصل
شکوہ یہ رہا مجکو سدا چرخِ کہن سے

جب اُس کے چہرے پہ وا زلفِ مشکبار ہوئی — چمن پہ حسن کی چھائی گھٹا بہار ہوئی
مجھے تو غیر کا خطرہ رہا اور اُس کو حجاب — مرے اور اُس کے نہ صحبت کبھی برار ہوئی

خواہش وصل میں تدبیر نہ کچھ کام آئی — اس کی فرقت تو لئے موت کا پیغام آئی
اُس کے گھر جانا نہیں چھٹنے کا گر تجھ سے نزار — یہ سمجھ لے کہ قضا صبح نہیں شام آئی

نالاں

محمد وارث نالاںؔ تخلص، از وست :-

اے چشم رازِ عشق تو افشا نہ کیجیو — ناحق کسی غریب کو رسوا نہ کیجیو

جس وقت تو پسند کرے یہ مکانِ چشم — وہ ہیں نکل کھڑے ہوں مرے مردمانِ چشم

نالاں

میرزا محمد جان نالاںؔ تخلص خلفِ مہدی علی خاں صوبہ دارِ بانس بریلی وغیرہ جوانِ صلاحیت شعار است از ابتدائے عمر سرے بموزونیٔ شعر داشت پیش ازیں بہ لالہ موجی رام موجیؔ تخلص کہ او ہم شاگردِ فقیر است چندے مشورہ کردہ دو سال مشاعرہ ہم نمودہ حالا بہ فقیر رجوعے تمام دارد عمرش بست و سہ سالہ خواہد بود، از وست :-

وصل کی شب مجھے کیا یار نے سونے نہ دیا — دیدۂ مائلِ دیدار[1] نے سونے نہ دیا
گرچہ افسانے سے نیند آتی ہی مجکو لیکن — قصۂ عشقِ دلِ زار نے سونے نہ دیا

---

(۱) دیدۂ طالب دیدار

یادِ روزِ سیہ ہجر دلا کر مجکو — وصل میں بھی تو شبِ تار نے سونے نہ دیا
شدّتِ(۱) درد سے کرتا جو رہا نالہ و آہ — قبر میں بھی دلِ بیمار نے سونے نہ دیا
گرچہ ہوں ساکنِ گلزار و لے نرگس وار — یادِ یارانِ گرفتار نے سونے نہ دیا
چشمِ انجم کی طرح دار ہے نت دیدۂ شوق — ایک شب آرزوئے یار نے سونے نہ دیا
جیتے جی تیرگیٔ گور کا دکھلا کے سماں — یار بن مجکو شبِ تار نے سونے نہ دیا
چھیڑنے کو مرے تصویرِ خیالی نہ بھجی — خواب میں بھی مجھے دلدار نے سونے نہ دیا
بختِ خفتہ اسے کہتے ہیں شبِ وصل بھی آہ — اپنے پہلو میں مجھے یار نے سونے نہ دیا
وہ تو اس بات پہ راضی تھا مگر اے نالاں — پاس میرے اُسے اغیار نے سونے نہ دیا

کیا نازکی سے رکھے وہ صمصام دوش پر — ہو بار جس کو زلفِ سیہ فام دوش پر
عاشق مزاج کہتے ہیں طفلی سے مجکو لوگ — آتا نہ تھا کبھی مجھے آرام دوش پر
پھرتے ہیں تیرے عشق میں اے برہمن پسر — زنار رکھ کے صاحبِ اسلام دوش پر

نامی

میرزا مغل نامی تخلص ولد میرزا حیدر(۲) بیگ بزرگانش سکنۂ شاہجہاں آباد بودہ اند وخودش در لکھنؤ تولد و نشو و نما یافتہ عمرش سی و دو سالہ بحساب آمدہ بمقتضائے موزونیٔ طبع گاہ گاہ چیزے موزوں می کند برادر خوردِ میرزا محمد ہجر است، از وست:-

بجا ہے بلبلِ شیدا کی بیقراری آج — خزاں رسیدہ ہوا موسمِ بہاری آج

---

(۱) ن - نہ گیا مرنے پہ بھی درد جو دل کا میرے -
(۲) ن - میرزا حیدر علی بیگ -

نحیف

شیخ عبدالکریم نحیفؔ تخلص ساکن رنبیرپور، جوانِ قابل و دانا است شعر بزبانِ ہندی وفارسی ہر دو می گوید طبعش بنظمِ سخن بسیار مناسب افتادہ مشورۂ آں بہ فقیر دارد اما ہنوز کم کم کلامِ خود را باصلاح رسانیدہ باعثِ کم گوئی است عمرش تخمیناً سی سالہ خواہد بود، از وست:۔

اک دن بسے گا یہ چمن اجڑا بہار سے
بلبل نہ کر فغاں خلشِ نوکِ خار سے

سنتے ہیں طولِ روزِ قیامت یہ ہے یقیں
ہوگا نہ وہ زیادہ شبِ انتظار سے

اپنی بھی جا لڑی ہے اُسی پردگی سے چشم
جلوے نے جس کے طور کو پھونکا شرار سے

اے دوستو تمھیں یہ مبارک ہو سیرِ باغ
ہم داغ لے چلے چمنِ روزگار سے

واں تجکو زلف و رُخ سے فراغت نہ یاں مجھے
فرصت نصیب گریۂ لیل و نہار سے

شب کس کی مجکو حسرتِ آغوش تھی نحیفؔ
جو صبح تک یہ ہاتھ تھے چسپاں کنار سے

خونِ مرجاں کا ہے دل تیرے لبِ خنداں سے
سینۂ دُر بھی مشبک ہے دُرِ دنداں سے

اشک نے دل میں مرے آہ سے دی آگ لگا
شعلۂ برق فرو ہو نہ سکا باراں سے

تیر پر تیر لگے یار کے یہاں تک کہ نحیفؔ
دل مرا خانۂ زنبور ہوا پیکاں سے

غالباً آتشِ گل تیز گلستاں میں ہے
پھر حرارت سی جو داغِ دلِ بریاں میں ہے

اشک کچھ دیدہ و داماں میں ہوا آب ہونے لگا
کچھ عداوت سی پھر اب دست و گریباں میں ہے

گریہ رو رو کے نہ کر یہاں مری آنکھوں کو سفید
فائدہ واں تو کدورت دلِ جاناں میں ہے

دیکھتا ہوں جسے باندھے ہے سناں و خنجر
کس سے بگڑی ہے جو ایکا صفِ مژگاں میں ہے

خوں سے سیراب سدا رکھتا ہوں لیکن مجھ سے
خلش اس پر بھی دلِ خارِ بیاباں میں ہے

مطربا نغمہ کہ ہنگامِ بہار آپہنچا ساقیا! بادہ کہ صحبتِ گل و باران میں ہو
وصل چاہے ہے تو دلا راتوں کو کر رو کے سحر دُرِ مقصود اسی قطرۂ نیساں میں ہو
رشک سے غنچۂ لب کے تری ہر شام و سحر غنچۂ گل ہوس چاکِ گریبان میں ہو
عرش تک نالۂ مرغانِ چمن جاتے ہیں موسم آباد قیامت سے گلستان میں ہو
دل کی کاہش ہی پہ دل چھوڑ دیا تو نے نحیفؔ ابھی آفت بہت ایسے غمِ پنہان میں ہو

وصف اس کے نورِ تن کا جب سے آیا دھیان میں بالکل اشعارِ مرصع ہیں مرے دیوان میں
صدق کا نقصاں ہی رکھنا نفع ہے بہتان میں عصمتِ یوسف کا شاہد چاک تھا دامان میں
رنجش افزائے دلِ بلبل ہے رونا شمع کا خندۂ گل آفتِ پروانہ ہے بستان میں
کھیل لڑکوں کا نہیں دل کی رہائی زلف سے بود و باشِ گو ہو .. خمِ چوگان میں
جتنا رویا اور اُتنی بے قراری ہو گئی برق چمکے ہے زیادہ شدتِ باران میں
خصم کے تغیرِ حالت پر نہ جایا چاہیے ہو زیاں کاری تو پتھر سے زیادہ سان میں
ہے ماہِ تاباں منکسف مہرِ منیر کیا یہ ہم پلہ ہوں تجھ سے حسن کے میزان میں
ہیں اسیر اس کے بہت تیروں کے پیکانوں کی جا سر بسر آہیں ہیں دل میں ترکش و قربان میں
زلف و عارض کے علاقے سے ہمارا روز و شب دل پرستاں میں ہے گر تو جاں ہے ہندستان میں
منہ لگانا غیر کا ایذا رسانی ہے مری کاوشِ افزوں ہو لبِ سوفار سے پیکان میں
دھوم مستی کی تری از بسکہ پہنچی دور تک عشق میں جس کے ہوا نیلم کو سودا کان میں
سنگلاخ اتنا زمینِ شعر کو مت کر نحیفؔ چل جنابِ مصحفیؔ کے پیچھے اس میدان میں

اے صبا جا اُس گلِ رعنا کے کہنا کان میں طاقتِ دوری نہیں اب بلبلِ بیجان میں
اُن لبوں نے کی مسیحائی نہیں تو اپنا کام تیغِ ابرو کر چکی ہی تھی تمام اک آن میں

دیدۂ خونبار نے دامن کیا رشکِ چمن
یعنی رکھتا لطف ہو سیرِ چمن باران میں

کیا حرم کیا دیر کس کا شیخ کیسا برہمن
بے نشاں دیکھا تجھی کو جلوہ گر ہر شان میں

خوردنِ گندم نے ہم کو ہی نکالا خلد سے
سیر تھے جنت کی دایہ کے ہمیں داماں میں

یہاں ہوا وعدہ برابر وہاں وہی وعدہ ہا
عمر آخر ہو گئی پیمان ہی پیمان میں

کیا کرے بیچارہ دل اس کا مداوا ہاں تو کہو
دل فریبی ہر ادا میں دلبری ہر آن میں

مر گئے پر پھر یہ مٹی ہے بقولِ خاں نحیف
دم کا سارا کھیل ہے اور کچھ نہیں انسان میں

مرغِ دل سینے میں جو گرم نوا ہوتا ہے
گل کھلا ہے درِ گلشن کہیں وا ہوتا ہے

ابکی موسم میں مرے ہاتھوں سے لے وحشتِ عشق
دیکھئے کیا ستم ایجاد نیا ہوتا ہے

اس سے کیا اور توقع ہو کہ یہاں آنے کا
ایک وعدہ تھا سو اب تک وہ وفا ہوتا ہے

کیا خطرناک رہِ عشق ہے یہاں پیاسے کا
آبِ خنجر ہی سے سیراب گلا ہوتا ہے

نجف

کفر ہے دخل مشیت میں نجف بندے پر
جو ہوا خوب، جو ہوتا ہے بجا ہوتا ہے

ناداں

میر شیر علی ناداں تخلص در فیض آباد تولد و نشو و نما یافتہ جوانِ غریب و خود بین است برفاقتِ صفدر علی خاں بہادر خلفِ شجاع الدولہ بہادر مرحوم عزِ امتیاز دارد، استفادۂ شعر خیدسے باوصفِ بے علمی از میاں عیسیٰ تنہا کردہ و وجہِ تخلص گذاشتن ناداں ہمیں است بعد از فوتِ مشار الیہ گاہ گاہے کہ فکرِ سخن میکند برائے اصلاح رجوع بہ فقیر می آرد عمرش سی سالہ خواہد بود، از وست :-

انساں تو کیا فرشتے کا واں تک گذر نہیں — بھیجوں میں کس کو ہائے کوئی نامہ بر نہیں

کتنا ہی برسے خاک یہ میرے سحابِ فیض — ہوں نخلِ بید مجکو امیدِ ثمر نہیں

ہیں رات دن جو نالے کروں اس کا فائدہ — اس سنگدل کے دل میں تو مطلق اثر نہیں

آزاد گر قفس سے ہوا فصلِ گل تو کیا — رونا ہی مجکو یہ کہ مرے بال و پر نہیں

روزِ وصال چہرہ کشا ہووے جس کے بعد — ایسی تو اپنی دھیان میں کوئی سحر نہیں

سو جان و دل سے تم پہ میاں ہیں تو ہوں فدا — الفت اگرچہ تم کو میاں اس قدر نہیں

کیا پوچھتا ہے شیشہ و ساغر کی ساقیا — مدت ہوئی کہ اپنی ہی ہم کو خبر نہیں

دو چار ذبح ہوتے ہیں ہر روز بے اجل — کوچے میں تیری کونسا دن ہے کہ شر نہیں

اس شوخ خانہ جنگ سے گر تو ہوا دوچار — ناداں یہ جان لے کہ ترے تن پہ سر نہیں

جب اس کا مصر میں دیدار عام ہوتا ہے — تو ماہِ مصر بہ منت غلام ہوتا ہے

غضب تو یہ ہے کہ قاصد کی بے شعوری سے — نصیبِ غیر ہی میرا پیام ہوتا ہے

رکھا ہے ہاتھ پہ میں نے بھی سر کو بسم اللہ — جو میرے قتل میں قاتل کا نام ہوتا ہے

پسے ہیں تلووں کے نیچے دل اہلِ محفل کے — جو گرمِ رقص وہ ماہِ تمام ہوتا ہے

بنگاہِ شوق سے دیکھوں ہوں اس کے منھ کی طرف — کبھو جو ہاتھ میں ساقی کے جام ہوتا ہے

میں وہ اسیر ہوں جس کا بہ حسرتِ پرواز — پھڑک پھڑک کے قفس ہی میں کام ہوتا ہے

فروغِ زلف میں کیونکر نہ دیوے وہ رخسار — طلوعِ ماہِ فلک وقتِ شام ہوتا ہے

چمن میں جاتا ہوں ناداں جو یادِ گیسو میں — تو عشق پیچہ مرے دل کو دام ہوتا ہے

غرفے سے جو اس شوخ کی صورت نظر آئی — اک کوندسی بجلی کی مری جان پہ آئی

احوالِ اسیراں کی مگر تجکو خبر ہے — کس طرح سے اے بادِ صبا تو ادھر آئی

عاشق ترا روتا ہے ذرا چل کے خبر لے — یہ بات نہ کہنی تجھے اے نامہ بر آئی
چھوڑوں گا نہ زنہار کوئی اس میں کہے کچھ — جس وقت مرے ہاتھ میں تیری کمر آئی
میں کس کو دکھاؤں شبِ ہجراں کی درازی — بڑھتی ہی گئی یہ نہ قریبِ سحر آئی
امید نہ تھی مجکو تو یہ بادِ صبا سے — دو پھول بھی لے کر نہ مری خاک پر آئی
اک تیرے سوا اور زمانے میں کسی کی — کرنی نہ خوشامد مجھے اے سیم بر آئی
تو حشر کے دن بھی دلِ کم بخت نہ چونکا — سر خاک پہ رکھتے تجھے نیند اس قدر آئی
سنتے ہی رہے ہوش کسی کے نہ ٹھکانے — اُس شوخ کے آنے کی جو ناداںؔ خبر آئی

جو کام کرنا ہو کرلے دلا شتاب شتاب — غروب ہوئے ہستی کا آفتاب شتاب
بحالِ نزع ہوں قاصد رہے گا یہ احساں — تو لائے گا مرے نامے کا گر جواب شتاب
پیالہ دے کے یہ کہتا ہے مجکو ساقیٔ بزم — گزک کے واسطے منگوا تو اب کباب شتاب
قیام بحرِ جہاں میں کہاں ہو ہستی کو — ادھر بنا تو اُدھر مٹ گیا حباب شتاب
نفر جواں کا نہ پہنچا سوار ہوتے ہوئے — ہمیں نے دوڑ کے آخر کو لی رکاب شتاب
بسانِ گرد میں واماندہ رہ گیا پیچھے — یہ ہمرہاں نے اٹھائے قدم شتاب شتاب
گلی میں یار کی جایا نہ کر بہت ناداںؔ — تو ایسی باتوں میں ہو جائیگا خراب شتاب

کبھی کھاتے تھے لبِ یار سے دشنام کو ہم — اب ترستے ہیں فقط بوسہ بہ پیغام کو ہم
بن رہا ہوں میں چراغِ سحری اس پر بھی — اور کہتے ہو یہی آئیں گے کل شام کو ہم
ساقیا ہے یہی انصاف کہ میخانے میں — مے پیئے غیر ترستے رہیں اک جام کو ہم
آج کی شب جو تو اے نالہ کمند افگن ہو — تاک آئے ہیں کسی کوچے میں اک بام کو ہم
آنکلتا جو کبھی تو تو مقابل کرتے — شبِ ہجراں سے تری زلفِ سیہ فام کو ہم

آہ جو یار کے زانو کا یہ سر خوگر ہو | کیا رکھیں اس کے تئیں بالشِ آرام کو ہم
بن ہر موے نکلنے لگے فوارۂ خوں | یہ طپش ہے تو بنا دیں گے چمن دام کو ہم
بزمِ رنداں کا قدح نوش ہی تو اے نادِ علی | سمجھے ہیں کفر سے بدتر ترے اسلام کو ہم

ناسخ

شیخ امام بخش ناسخ تخلص خلف الرشید شیخ خدا بخش مرحوم وطنِ بزرگانش دار السلطنت لاہور و خودش در فیض آباد تولد شدہ و بہ لکھنؤ بہ سنِ تمیز رسیدہ جوانِ سمین و سپاہی وضع حلیم الطبع و تہذیب الاخلاق دیدمش عمرش سی و ہفت سالہ است از سنِ نسبت سالگی بمقتضائے موزونی طبع فکرِ شعرِ ہندی میکند و در تلاشہائے معنیِ تازہ می نماید، اجدادش تجارت پیشہ بودہ اند و خودش نیز بہمیں وتیرہ بسر می برد از انتخاب کلامِ اوست :-

ملا عکسِ شفق کو رتبہ اکسیر پانی میں | طلائی ہو گئی ہر موج کی زنجیر پانی میں

دشنام کی تلخی سے ان کو نہ کر آلودہ | ہیں تیرے لبِ شیریں ظالم شکر آلودہ
کی قدر مری افزوں اور آکے مصیبت نے | ہے گردِ یتیمی سے میرا گہر آلودہ
جو نظم پڑھے اس کی، ہو اس کی زباں شیریں | ہر مصرعۂ ناسخ ہے شہد و شکر آلودہ

وہ مجنوں ہوں کہ ہر عالم میں لیلیٰ میری شامل ہے | دلِ نالاں جرس ہے سینۂ بے کینہ محمل ہے
ٹپکتا ہے لہو لکھتے ہیں جب اشعارِ رنگیں ہم | ہمارے ہاتھ میں خامہ گلوئے مرغِ بسمل ہے
توقع ہے شبِ فرقت میں مجکو صبح ہونے کی | معاذ اللہ کتنا موت سے انسان غافل ہے

رہے ہم قید میں گو روح چھوٹی محبسِ تن سے | موئے پر بھی نہ اترا شِل قمری طوق گردن سے

اے فلک دیکھوں تو کب تک روزِ وصل آتا نہیں — منتظر بیٹھا ہوں میں بھی گردشِ ایام کا

پاس سے اغیار کے گر پاس آ سکتے نہیں — دور سے بھی کیا ب مجھے صورت دکھا سکتے نہیں
اس قدر نازک مزاجی نے کیا ہے بے دماغ — ناز معشوقوں کے بھی اب ہم اٹھا سکتے نہیں

ہووے محبوب اجل آ کے ہم آغوش کہیں — یار و اغیار کے شکوے ہوں فراموش کہیں

ہمارے کیف کو کچھ خوفِ احتساب نہیں — خیال چشم ہے یہاں ساغرِ شراب نہیں
وہ بے نقاب ہوا ہے تو یہ تماشا ہے — دوچار ہونے کی آنکھوں کو اپنی تاب نہیں
وفورِ اشک سے کیوں بھر گلے تلک پانی — ہمارا کاسۂ سر کاسۂ حباب نہیں

دل اس کو دیا میں نے تقصیر اسے کہتے ہیں — مارا غمِ فرقت میں تعزیر اسے کہتے ہیں
جو مجھ سے گریزاں تھا کل اُس کو میں گھر اپنے — باتوں میں لگا لایا تقریر اسے کہتے ہیں

تھا آگے جسم اس کا مستور پیرہن میں — اب گم ہوا ہے تیرا رنجور پیرہن میں
دو گز کفن ہی آخر سب کو لباسِ تن ہے — پھولے نہیں سماتے مغرور پیرہن میں

ظلم سے ظلم ہوں ولے اس کو ادا سمجھتے ہیں — اہل وفا جفا کو بھی عین وفا سمجھتے ہیں

مزا وصال میں کیا گر فراقِ یار نہ ہو — نہیں ہے نشہ کی کچھ قدر گر خمار نہ ہو
ہزار دن گور کی راتیں ہیں کاٹنی ناسخ — ابھی سے روزِ سیہ میں تو بے قرار نہ ہو

پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے ہر روش میں جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

رہا گر شغل رونے کا یونہی اس چشمِ گریاں کو کروں گا بعدِ مردن بے نشاں گورِ غریباں کو
درازی یاد دلواتی ہی اُس زلفِ پریشاں کو عزیز اس واسطے رکھتا ہوں میں شبہائے ہجراں کو
پری رو اس ستم گر کو اگر کہیے تو زیبا ہے کہ وحشت اس قدر ہوتی نہیں انساں سی انساں کو
یقیں ہی شوقِ کامل سو اگر ریگِ رواں ہو کر رواں ہو بعدِ مردن خاک میری کوئے جاناں کو
دکھا کر وہ سہی قامت حنائی ہاتھ کہتا ہے کیا شمشاد سے پیدا خدا نے شاخِ مرجاں کو
نہ کیونکر چشمِ مستِ یار خوش ہوں میری رونے سی کہ ناسخ دوست رکھتا ہی ہر اک میخوار باراں کو

دل مرا مرگِ شبِ فرقت میں ایسا شاد ہے شیونِ یاراں مجھے شورِ مبارکباد ہے
گرد آلودہ نہ دامانِ صبا کو بھی کیا مشتِ خاک اپنی بسانِ رنگِ گل برباد ہے
قصرِ تن کی بے ثباتی کا جو آتا ہے خیال ہر حباب اپنی نظر میں قلعۂ فولاد ہے
کیا سمجھ کر کوچۂ خوباں میں پھر جاتا ہے تو آفتِ سالِ گذشتہ تجکو ناسخ یاد ہے

فکر سے میں نہیں خالی غمِ جاناں میں کبھی کبھی زانو پہ مرا سر ہے گریباں میں کبھی
راہ پاوے ترے کوچے میں جو وہ آنے کی نہ رکھے بادِ صبا پاؤں گلستاں میں کبھی
سر دھری پہ ہے شعلہ رخوں کے ناسخ گرم پہلو نہ ہوا فصلِ زمستاں میں کبھی

میرے نعشے کے وہ ہمراہ لحد تک ہووے اے اجل تیرا قدم مجکو مبارک ہووے
دوست گر جنسِ محبت کے خریدار نہیں کوئی دشمن ہی مری جان کا گاہک ہووے

زار انتظارِ خط نے کیا اس قدر ہے مجھے
پہچانتا نہیں ہے مرا نامہ بر مجھے

اِک دلِ مجنوں ہی جس کی لاکھ جا تدبیر ہے
جس پری کی آنکھ ہے سو حلقۂ زنجیر ہے

ہوں میں ایسا کوہکن جس کا فلک ہے بے ستوں
کہکشاں کہتے ہیں جس کو میری جوئے شیر ہے

کرلے مجھ مجنوں کو خوش خلقی سی جو چاہے اسیر
کافی اک موجِ تبسم کی مجھے زنجیر ہے

ناتوانی وہ مری پوچھے تو کہیو قاصدا
یہ ترا موئے کمر ناسخ کی بس تصویر ہے

دلِ صد چاک میں گر جلوۂ جاناں ہوتا
روز اس گنجِ شہیداں میں چراغاں ہوتا

زلف سے اس کی جو تشبیہ نہ دیتے شاعر
اس قدر حال نہ سنبل کا پریشاں ہوتا

دوش پر ریگِ بیاباں کے جنازہ ہی مرا
شہر میں کیوں سببِ داغِ عزیزاں ہوتا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

نصیر

میاں نصیر الدین نصیرؔ تخلص ساکنِ شاہجہاں آباد از اولادِ شاہ صدر جہاں جوانیست ذی فطرت و صاحب ہوش دراں ایام کہ فقیر در دہلی بر مکانِ میاں خورم علی خورمؔ تخلص طرحِ مشاعرہ انداختہ بود چندے بتدیانہ موزوں می کرد و در مشاعرہ می آید حالا شوق او در را رہبر شدہ بمرتبۂ کمال رسانیدہ در شاہجہاں آباد علمِ استاذی می افرازد و شریفِ آں شہر بحلقۂ شاگردیش در آمدند و او را استاذی مسلم الثبوت میدانند و ملک الشعرا می گویند البتہ در روانی طبعش شکّے نیست اما چوں در لکھنؤ گذر افگندہ و با فصحاے ایں دیار بلاقات کرد و در مشاعرہا غزلِ طرحی گفتہ خواندہ مرتبۂ سخنِ بلندِ او را معلوم شد در تذکرۂ اول بہ سبب بہم نہ رسیدنِ کلامش دو شعر سماعی نوشتہ بودم لہذا چوں دریں نزدیکے دو سہ بار مشارٌ الیہ بایں دیار آمدہ در غزلہاے

طرحی شریکِ مجلسِ یاراں شد انچہ از کلامش بیاد فقیر ماندہ آنرا بنوکِ قلم دادم، عمرش از شصت متجاوز خواہد بود، از وست:-

کسی کے حال پر گر رحم کرتا وہ ستم گر ہے
تو ہر چشم حلقۂ جوہر سے نکلتا اُس کو خنجر ہے

بلا سے قتل گاہِ عاشقاں کوئی ستم گر ہے
ہمارا لختِ دل نامہ ہی اور آنسو کبوتر ہے

ہوا ہے دیکھ صورت کس پریرو کی یہ دیوانہ
کہ پائے آئینہ میں حلقۂ زنجیر جوہر ہے

نہیں بجز جہاں میں قابلِ صحبت تنک مایہ
تسلی بخشِ کامِ تشنگاں کب آبِ گوہر ہے

نہ پایا ہم نے ہوتے رزق اہلِ حرص کو قانع
کہ پائے آسیا ہیں روز گھر بیٹھے یہ چکر ہے

سبک رویوں کا بالاتر ہے رتبہ اہلِ تمکیں سے
کہ گل ہے افسرِ دریا غریقِ بحر پتھر ہے

غزل کو میری کہتے ہیں یہ اربابِ سخن سن کر
نصیر اب تو ہی دریائے معانی کا شناور ہے

کیا ہوا گر چشم ترسے خوں ٹپک کر رہ گیا
بادۂ گلگوں کا ساغر تھا چھلک کر رہ گیا

تاب اُس بالی کے موتی کی نہیں کیا زلف میں
اے دلِ آشفتہ سچ کہہ کیا تو تک کر رہ گیا

سرزمینِ شام میں تارا گرا ٹوٹا ٹوٹ کر
یا اندھیری رات میں جگنو چمک کر رہ گیا

دل اس کے خندۂ دنداں نما کے مول بکا
ہزار شکر کہ یہ موتیوں کی تول بکا

جس گھڑی زلف کے چہرے پہ ترے بال کھلے
دامِ الفت کے اسیروں کے پر و بال کھلے

نہیں ہے رُخ پہ اس کے لاجوردی کان کا تیا
جھمکا ہے لالۂ احمر پہ نافرمان کا تپا

کروں جو ڑے کا تصور کہ خیالِ گردن
زندگی ہو گئی اے جان وبالِ گردن

نیازؔ

مولوی نیاز احمد نیازؔ تخلص کہ بندہ در ایامِ طالب علمی شانِ عالم وجاہتِ ایشاں را دیدہ بلکہ چندر روز مہمان ہم از ایشاں در شاہجہاں آباد خواندہ بود زبانی صاد روار د چوں ظنطنۂ فصاحتِ من از لکھنؤ بگوشِ مبارکِ ایشاں رسیدہ غزلے کہ بعد تحصیل فنون فضائل خود گفتہ بودند از بریلی بہ فقیر نوشتند چوں بر پشتِ تختِ مشائخی در بریلی تمکن دارند و در وجد و حال نام برآوردہ از مضامینِ آں معنی ہمہ اوست می تراود و آں اینست :-

کسیکہ سر نہان است ..... ہمہ اوست

عروسِ خلوت و ہم شمعِ انجمن ہمہ اوست

زمصحفِ رخ خوباں ہمیں نمود رقسم

کہ خط و خال و رخ و زلفِ پرشکن ہمہ اوست

نظر بہ عیب مکن در ظہورِ باغِ وجود

کہ طوطیانِ چمن زاغ و ہم زغن ہمہ اوست

زسرِ عشق چو واقف شوی یقیں دانی

کہ قیس و لیلیٰ و شیرین و کوہ کن ہمہ اوست

شنیدہ ام بہ صنم خانہ از زبانِ صنم

صنم پرست و صنم گر صنم شکن ہمہ اوست

رساند مطربِ خوش گو ہمیں ندا در گوش

کہ چوب و تارِ صد لے تنن تنن ہمہ اوست

نوازشؔ

نوازش حسین خاں نوازشؔ تخلص عرف مرزا خانی ولد حسین علی خاں ابنِ نواب ناصر خاں صوبہ دارِ کابل و پشاور و غزنی قوم مغل چگتی وطنِ بزرگانش .. .. .. خود در اکبر آباد تولد شدہ و در لکھنؤ نشو و نما یافتہ، جوانِ مہذب الاخلاق و خود بیں و خوش اختلاط است از سنِ ہیژدہ سالگی شوقِ موزونی شعر بہم رسانیدہ در وضعِ گفتن و خواندنِ شعر تتبعِ میر سوز است و خود را شاگردِ ایشاں می گوید دیوانِ اول بطورِ ایشاں گفتہ و حالا یک دیوان دیگر ہم جمع نمودہ، از وست :-

بلبل کو رگِ گل ہی ہے دامِ گرفتاری
صیاد نہ لے سر پہ الزامِ گرفتاری

او بلبلِ شوریدہ کیا پھول کے بیٹھی ہے
پھر نکہتِ گل لائی پیغامِ گرفتاری

جی وے گی ابھی اپنا بلبل قفسِ تن میں
صیاد تو لیتا ہے کیوں نامِ گرفتاری

شہبازِ دلِ عاشق دام اُس کے میں آیا جب
پابند . . . . . . ہنگامِ گرفتاری

پھر بعد کئی دن کے ہاتھوں پہ لگا رکھتے
آغاز سے بہتر تھا انجامِ گرفتاری

تاریکیٔ گور اُس دم یاد آئی نوازش کو
اُس زلف نے دکھلائی جب شامِ گرفتاری

عکس کس کا یہ مرے پیشِ نظر رہتا ہے
جو درِ دیدہ کھُلا آٹھ پہر رہتا ہے

کس کی آمد کا تصور یہ بندھا ہے مجکو
جو مرا دھیان سدا جانب در رہتا ہے

شب کو میں نے جو کہا آج تو رہتا ہوں کہ میاں
روز کا ہے کو کسی کے کوئی گھر رہتا ہے

منھ سے یہ شوخ کے چھوٹا نہ ذرا بل بے بخیل
کہ یہ گھر ہے ترا رہ جا نہ اگر رہتا ہے

نظر

میرزا علی نظر تخلص خلفِ مرزا محمد زمان در اولادِ مالک اوشتر وطنِ بزرگانش مدینہ منورہ وجدِ مادری مرزائے مذکور عبد الواحد خاں ولد خدمت طلب خاں بخدمتِ متوفی گری نوابِ جنت آرامگاہ امتیاز داشت قوم مغل از مرزایانِ دفتر بودہ اند در ولایت ایشاں را قراقم نیلوی می گویند و متوطنِ دشت قیچاق انداز مدت بچند سال در شاہجہاں آباد اقامت گرفتہ مرزائے مسطور خودش در لکھنؤ متولد شدہ از ابتدائے عمر طبع رسا و ذہنِ عالی داشت انچہ کہ موزوں کردہ بہ نظرِ فقیر گذرانیدہ حالا ترقی بسیار کردہ شعر را بہ فصاحت و بلاغت تمام می گوید و مرتبہ ریختہ برابر فارسی رسانیدہ و طرزِ عاشقانہ و معنی بند ہر دو بسیار خوب می گوید و کلامش از غلطی پاک و در فنِ شاعری چالاک و از احوال و مبادیٔ شعر ماہر غرض شاعرِ مسلم الثبوت است در

کمال راسخ الاعتقادی تا الی الآن می نمیش و عمرش بست و شش ساله خواہد بود، ازوست:-

ضعف ہی مانع نہیں ہو کچھ مری رفتار کا
سر پہ ہے کوہِ گراں سایہ تری دیوار کا

حسن پر گرتی ہیں یوں چشمِ حریصِ اہلِ درد
جوں غذائے خوش پہ مائل ہووے دل بیمار کا

دل ہی جب ہارے تو پھر کس کام کے صبر و شکیب
فوج کو دیتا ہے ذلت بھاگنا سردار کا

دامنِ صحرا کو یکسر موتیوں سے بھر دیا
وا ہوا دستِ سخا جب چشمِ گوہر بار کا

آخرِ کار یہ حیرت نے کیا کام اپنا
اُس نے پوچھا تو ہمیں بھول گیا نام اپنا

صورتِ دائرہ اس صفحۂ ایجاد کے بیچ
آخر آغاز سے جا ملتا ہے انجام اپنا

پرفشانی کا مزا خاک میں مل جاتا ہے
یاد آتا ہے تڑپنا جو تہِ دام اپنا

عرش پرواز رہے ہم تو اسیری پر بھی
طائرِ روح نے چھوڑا نہ لبِ بام اپنا

قاصد اور نامے پہ موقوف نہیں کام اپنا
آپ لے جاتے ہیں ہم یار کو پیغام اپنا

فرقتِ روح کا لازم نہیں انساں کو ملال
کیوں برا مانئے مانگے جو کوئی دام اپنا

شہر کو ایک قدم چل نہ سکے صحرا سے
حلقۂ چشمِ غزالاں یہ ہوا دام اپنا

ملنے لگا ہر ایک سے وہ عہدِ شباب میں
سمجھا کہ پائے حسن ہے میرا رکاب میں

تربت پہ میری شمع نہ رکھنا کہ مردے کو
ہوتی ہو تُن کے رونے سے شدت عذاب میں

کھا کر گزک وہ دل کی مرے بولا غیر سے
بوآشنا کی آتی ہے کچھ اس کباب میں

غفلت سے طرفہ معجزہ رکھتے تھے جس سے رات
زندہ نظر پڑا مجھے ہر مردہ خواب میں

وحدت کو غور کیجے تو کثرت سے ہو فروغ
نقطے سے جیسے ہووے فزائش حساب میں

ہر دم نیا ہے رنگ زمانے کا اے نظر
کیا کیا تماشے دیکھتے ہیں انقلاب میں

بے طرح آئی ہے اُس کو کمرِ یار پسند
جان کا اپنی ہے دشمن دلِ دشوار پسند

اب ٹپکتے ہیں مرے سر سے وہ غصہ ہو کر
یہ وہی دل ہے کیا تھا جسے سو بار پسند

جلد آغاز پہ انجام قریں ہوتا ہے
اسی باعث ہے مجھے گردشِ پرکار پسند

روح کو جسم سے بے وجہ نہیں ہے الفت
کیوں مسافر نہ کرے سایۂ دیوار پسند

جادۂ شرع کا سالک ہے بہ مجبوری شیخ
کور کو کیونکہ نہ آوے رہِ ہموار پسند

بار ہوں خاطرِ گلزار کا میں برق کو کاش
آشیاں کے مرے آجاویں خس و خار پسند

جانے دیتے تھے جسے قول و قسم لے لے کر
جیتے ہیں اُس کے لبِ نام کو ہم لے لے کر

زخمِ شمشیرِ تغافل کے اٹھاتا ہے مزے
جان دیتا ہے ترا کشتہ جو دم لے لے کر

آنکھ بھی اُن پہ نہ ڈالی مرے استغنا نے
نذر کو آئے تجھے جو جاہ و حشم لے لے کر

کوئے جاناں میں جو آتے ہیں نظر میں اُنکے
اپنی آنکھوں سے لگاتا ہوں قدم لے لے کر

نقطۂ موہوم سے اُس کا دہن پیدا کیا
میری دقت نے سخن میں بھی سخن پیدا کیا

بعد جلنے کے بھی میرا پردہ رکھا عشق نے
مثلِ اخگر جسم سے میرے کفن پیدا کیا

میرے سوزِ عشق نے یوں اُسکو دل میں راہ کی
سنگ میں جس طرح آتش نے وطن پیدا کیا

عاشقِ جاں باز کا ملنا نہایت ہے محال
دوسرا شیریں نے کس دن کوہ کن پیدا کیا

پڑ گیا عکسِ بناگوش اُس کا جو وقتِ خرام
باغ میں لالہ نے رنگِ یاسمن پیدا کیا

کیا مزا ملتا ہے تجکو گر ملے وہ اے نظر
اُس سے پوچھوں جس نے یہ چاہت کا فن پیدا کیا

اثر تو دیکھ مرے دل کے داغِ سوزاں کا
کہ تارِ شمع ہے جو تار ہے گریباں کا

تلاش سے نہ رہا باز پائے خفتہ مرا
ہے عزم خواب میں بھی اس کو کوئے جاناں کا

غمِ فراق پئے کیوں نہ خونِ دل میرا
کہ میزبان کے سر پہ ہو خرچ مہماں کا

کم تو اُس سے نہیں مجکو ہے یہی حسرت
وہ کون ہے جو اُٹھاتا ہو بوجھ داماں کا

میں بے نصیب ہوں اس پہ بھی بے نصیب نہیں
زمینِ شور سے اُگتا ہو نخل حرماں کا

فروغِ عمر نے کھینچا نہ طول زیرِ فلک
کہ دیر پا نہیں ہوتا چراغ زنداں کا

دلیلِ عالمِ نیرنگ ہے یہی تو نظر
نہ ایک طور پہ دیکھا مزاج انساں کا

سمجھ کے عاشقِ صادق جدا نہ ہونے دیا
کسی کا اس نے مجھے مبتلا نہ ہونے دیا

دو چار عکس سے اپنے ہی وہ ہمیشہ رہا
اس آئینے نے کسی کا بھلا نہ ہونے دیا

میں آپ نذر کئے لا کے استخواں اپنے
خراب و خوار تجھے اے ہما نہ ہونے دیا

قضا نے اُس کی دمِ تیغ سے رکھا محروم
مرے نصیب یہ آبِ بقا نہ ہونے دیا

میں خواب میں تو بھلا دیکھتا کبھی اُس کو
فلک نے یہ بھی مرا مدعا نہ ہونے دیا

ہزار رنگ زمانے نے بدلے گرچہ نظر
مری وفا نے اُسے بیوفا نہ ہونے دیا

خیمۂ تن علمِ آہ سے برپا ہووے
مر کے جی اُٹھے جو عاشق تو تماشا ہووے

دعوئ حسن کرے اُس سے بھلا کیا خورشید
نقشِ پا جس کا حریفِ یدِ بیضا ہووے

عیشِ امروز سے کیا کام ہو اس کو جو کوئی
بستۂ سلسلۂ وعدۂ فردا ہووے

رگِ گل کرتی ہے دعوائے نزاکت یارو
پیچ و تابِ کمرِ یار کا چرچا ہووے

ہوں وہ غم دیدہ کہ مانی مری کھینچے جو شبیہ
بانگِ شیون لبِ تصویر سے پیدا ہووے

وعدۂ وصل نہ حرماں زدہ ایسے سے کرو
جس کے نالے کی غذا خونِ تمنا ہووے

سخت نومید ہوں یارب مددِ طالع سے
کاش بیداری مری خوابِ زلیخا ہووے

وہ پرِ کاہ ہوں میں گلشنِ ہستی میں نظر
قطرہ شبنم کا جسے لطمۂ دریا ہووے

رات بھر اُس کو تڑپنے کے سوا کام نہیں کسی کروٹ دلِ بیتاب کو آرام نہیں
دیکھ کر دور ہی سے مجکو یہ بولا صیاد صیدِ لاغر ہے یہ بابِ قفس و دام نہیں
رات دن اُس کا تصوّر ہے سر کسائے قاصد عالمِ وصل میں گنجائشِ پیغام نہیں
کہہ کے یہ بات مجھے قافلے والے گئے چھوڑ تو یہیں رہ کہ ترے پاس سرانجام نہیں

صدمۂ دستِ جنوں سے کوئی ٹل جاتا ہوں ہوں میں وہ چاک کہ دامن سے نکل جاتا ہوں
دلِ پر آبلہ ہے میری لحد میں ہمراہ باغِ امکاں سے لئے ساتھ یہ پھل جاتا ہوں
حق میں ہو وے مری مانندِ حنا سرمۂ خواب ہر شب آنکھیں میں ترے تلووں سے مل جاتا ہوں
نظرِ بد کہیں میری ہی نہ لگ جائے اُسے جب بناؤ اپنا وہ کرتا ہے میں ٹل جاتا ہوں
زخم کھا کر دمِ شمشیر کا گرتے گرتے قوتِ بازوئے قاتل سے سنبھل جاتا ہوں
تیری تصویر بغل میں ہے مرے نزع کے دم ساتھ اپنے لئے یہ حسنِ محل جاتا ہوں
عشق نے تیرے یہ صورت تو مری پہنچائی آئینہ دیکھ کے میں آپ دہل جاتا ہوں
جادۂ راہِ فنا شمع کا شعلہ ہے مجھے مثلِ پروانہ میں دنبالِ اجل جاتا ہوں
غم و شادی کا مری کچھ نہیں باعث جوں طفل آپ ہی میں روتا ہوں اور آپ ہی بہل جاتا ہوں
وہ شناور ہوں کہ دریائے تعلق سے نظر ہاتھ دو مار کے بس صاف نکل جاتا ہوں

لبوں پہ گل کے لئے جانِ زار آہی گئی قفس سے چھوٹے نہ ہم اور بہار آہی گئی
خیالِ ہجر نہ مطلق رہا تھا روزِ وصال غضب ہوا کہ شبِ انتظار آہی گئی
وہ گرچہ بچ کے چلا پر نشے میں وقتِ خرام قدم تلے مری خاکِ مزار آہی گئی
گیا نہ پیش مرا احترازِ موسمِ گل چمن سے کان میں صوتِ ہزار آہی گئی
ستم گری ترے قامت کی پہلے پنہاں تھی کھلی جو گات قیامت دو چار آہی گئی
چھپایا غیروں نے گو اُس کا باغ میں جانا نسیمِ گل سے مجھے بوئے یار آہی گئی

کیا تھا قصدِ ہلاک اپنا رک کے مجنوں نے — کہ اس میں لیلیٰ محمل سوار آ ہی گئی
خیال اُس کی درستی کا پھر نظرؔ ہے عبث — شکستِ دل پہ جب انجامِ کار آ ہی گئی

قابلِ نظارہ یہ موجِ سراب لائے دل نہیں — ہستیٔ موہومِ عالم جو خطِ باطل نہیں
ہاتھ اٹھانا مذہبِ خوباں سے شاید ہی گناہ — دستِ رد بھی جو نصیبِ کاسۂ سائل نہیں
آسماں اک بے گنہ شام و سحر کرتا ہی ذبح — یہ شفق کا رنگ ہی خونِ سرِ بسمل نہیں
اہلِ دل قالب تہی کرنے کو یہاں موجود ہیں — وہ اگر آوے تو بے تعظیم یہ محفل نہیں
گر ذرا شورش پہ آؤں آوے طوفاں شہر میں — اضطرابِ دل مرا موجِ لبِ ساحل نہیں
عاشقِ حیراں ہوں کیوں لیوے وہ مجھ سے منہ پھرا — پیکرِ تصویر کو رنجِ شکستِ دل نہیں
رحم آتا ہے مجھے احوالِ چرخِ پیر پر — اس مسافر کو کہیں آسائشِ منزل نہیں
بطنِ مادر سے نکل کر اس لئے گریاں ہی طفل — یعنی ہے بزمِ عزا یہ عیش کی محفل نہیں
اب نظرؔ دل سے اٹھاوے لالہ رویوں کا خیال — غیرِ داغِ یاس ناداں ان سے کچھ حاصل نہیں

چشم کو شوقِ تماشا نگراں رکھتا ہے — عشق دل کو مرے سرگرمِ فغاں رکھتا ہی
صبر کا مجھ پہ تو ناخن کا گماں رکھتا ہے — اب وہ طاقت دلِ بیتاب کہاں رکھتا ہی
گالیاں دو مجھے میں چپ رہوں سبحان اللہ — پر کوئی منہ میں مری جان زباں رکھتا ہی
موسمِ گل میں شگفتہ ہو دلِ بلبل خاک — کہ غمِ آمدِ ایامِ خزاں رکھتا ہی
شور و شر ہوتا ہے تصویر سے عاشق کی عیاں — لبِ خاموش بھی اندازِ فغاں رکھتا ہی
بدگمانی سے میں ناچار ہوں اپنی ورنہ — دوستی کس سے تو اے دشمنِ جاں رکھتا ہی
خوب دیکھا تو نہیں اس کا گنہ اس میں نظرؔ — دل مرا مجھ ہی کو رسوائے جہاں رکھتا ہی

نہ موت آوے نہ وہ ہم کلام ہوتا ہے
کسی کا کیونکہ زمانے میں نام ہوتا ہے

برنگِ لالہ گلستانِ دہر میں اپنا
مدام خونِ جگر صرفِ جام ہوتا ہے

ہے نزع میں کئی دن سے اسیرِ غم تیرا
نہ کوچ ہوتا ہے اور نہ مقام ہوتا ہے

یہی ہے ایک دلیلِ قوی تناسخ کی
تہی ہو شیشہ تو لبریز جام ہوتا ہے

اگر ذرا بھی تو تکلیف دستِ تیغ کو دے
تمام عمر کا قصہ تمام ہوتا ہے

مجھے ہے رشک اسی بات کا نظرؔ وہ شوخ
دو چار آئینہ کیوں صبح و شام ہوتا ہے

شبِ فراق سحر ہوتے مجکو مار چلی
نہ آیا تو صنم اور جانِ بے قرار چلی

خبر یہ سنتے ہی بس مر گئے اسیرِ قفس
کسی نے جو نہی کہا باغ سے بہار چلی

جو ہم کو قتل بھی کرکے چلا تو مقتل سے
تو پیچھے پیچھے ترے روح اے نگار چلی

نہ اس قدر تھا گماں تیری بے وفائی کا
بہت شتاب تو اے عمرِ مستعار چلی

جب آیا نجد تو شوقِ وصال میں لیلےٰ
کبھی پیادہ چلی اور کبھی سوار چلی

غبارِ دل جو نکالا میں آہ کرکے نظرؔ
تو بعدِ مرگ اک آندھی ترے مزار پہ چلی

بو کی مانند میں آوارہ ہوں نہاں گل کا
چھوڑ جاؤں گا بس اک لحظہ میں داماں گل کا

کبھی ہمدم کو نہ ہمدم کی ہوئی غمخواری
سوزنِ خار سیئے کیونکہ گریباں گل کا

شاخ سے توڑ کے گل بادِ صبا تو نے کیا
داغ گوں زخم پہ بلبل کے نمکداں گل کا

جی جلاویں گے صبا ہم بھی جو زر ہاتھ آیا
سنتے ہیں اب کی برس نرخ ہے ارزاں گل کا

میرے گریہ سے فزوں کیونکہ نہ ہو حسنِ گل
رنگ ہوتا ہے عجب موسمِ باراں گل کا

تو گرفتارِ قفس ہوں ابھی مر جاؤں گا
نام آگے نہ مرے لیجیو یاراں گل کا

دیکھ لے گلشنِ تصویر میں تصویرِ ہزار
ساتھ بلبل نے نہ چھوڑا کسی عنواں گل کا

بوسہ لینے نہیں دیتے ہیں گرن پھول ترے
حسن نے گل کو بنایا ہے نگہباں گل کا

ساتھ اُس شوخ کے گلشن میں گئے تو لیکن
ہم سے دیکھا نہ گیا حالِ پریشاں گل کا

روز و شب جب سے ہے گلچینِ قضا کا خطرہ
نظر اس باغ میں ہو کیا کوئی خواہاں گل کا

سیرِ چمن عدو نے دلِ زار ہو گئی
اُس بن تو موجِ گل ہمیں تلوار ہو گئی

وہ بے نصیب ہوں کہ جو آیا وہ بے نقاب
حیرت سے اُس کا پردۂ رخسار ہو گئی

آیا جو سرسری بھی عیادت کو تو مری
بس اتنے ہی میں خاطرِ بیمار ہو گئی

دیکھا جہان نے تجھے چشمِ قبول سے
عاشق کی آنکھ تھی کہ گنہگار ہو گئی

امیدِ ضبط تھی دلِ خانہ خراب سے
عاشق سمجھ گیا وہ مجھے اضطراب سے

بل بے نزاکت اُس کی کہ دریا میں وقتِ غسل
چھڑیاں بدن پہ صاف لگیں موجِ آب سے

بوسہ لیا جو مصحفِ رو کا وہ رُک گیا
حاصل ہوا عذاب یہ ہم کو ثواب سے

رہتا ہے واژگوں ہی مرا کاسۂ سوال
سیکھی ہے میں نے بس یہ قناعت حباب سے

حسرت پہ میری بزم میں اُس بادہ نوش کے
جاتا نہیں ہے ... خونیں کباب سے

ساقی تو جام دے کہ لبِ شکوہ وا نہ ہوں
بہتر ہے پہلے زخم کا دھونا شراب سے

حالِ شبِ فراق سے میرے عجب نہیں
خالی ہو روزِ حشر بھی گر آفتاب سے

بوسے میں اس کے دو کی جگہ چار لے گیا
شکرِ خدا کہ وہ نہیں واقف حساب سے

منصف ہو دیکھے گر کوئی دیواں مرا نظرؔ
فرصت ملے نہ اُس کو کبھی انتخاب سے

باہر ہوا میں جبر سے نہ اختیار سے
کس کو مفر ہے شعبدۂ روزگار سے

گر دردِ انتظار کا عالم یہی رہا
محشر سے پیشتر میں اٹھوں گا مزار سے

ہو خاک . . . . مرا عزم دیکھیو — اُلجھا ہے دستِ شوق عنانِ سوار سے
شادابیِ چمن پہ ٹھہرتی نہیں جو آنکھ — لے دی گئی انتقامِ خزاں اس بہار سے
فرقت کی شب میں شاہِ ولایت کی ہے قسم — آمد شدِ نفس نہ تھی کم ذوالفقار سے
ہرگز چمن کا نام نہ لوں گا میں پھر نظر — گر دل پہ کوفت آگئی صوتِ ہزار سے

آسماں تیری سی بیدادگری کیا جانے — کج خرامی کے سوا کج نظری کیا جانے
سوزنِ عیسیٰ مریم کو نہ تکلیف کرو — دلِ صد چاک کی وہ بخیہ گری کیا جانے
نکہتِ زلف تری اس کو نہ ہوتا رہبر — باغ کی راہ نسیمِ سحری کیا جانے
دشتِ پرخارِ جنوں میں ہوں بھٹکتا پھرتا — رہ گئے پیچھے کہاں ہم سفری کیا جانے
دل پہ جو صدمہ ہے وہ آنکھوں کو معلوم نہیں — حالتِ خانہ نشیں رہ گذری کیا جانے

لحظے کے لحظے وہ مہِ نامہرباں ملے — اتنی تو ہم کو دادِ دل اے آسماں ملے
گر اختیار اپنے مٹا بیٹھ ہو مرا — ایسا میں خاک میں کہ نہ ہرگز نشاں ملے
قسمت میں نزعِ روح کے کیا لکھ دیا تھا یہ — کنجِ لحد میں بھی نہ مجھے آشیاں ملے
طالب ہو اس کے کیا کوئی بوس و کنار کا — جس کی کمر نہ ہاتھ لگے نہ دہاں ملے
نظمِ سخن میں طرزِ نظر سب سے ہے جدا — کیونکر کسی کی اس کی زباں سے زباں ملے

اطاعت دل کی واجب ہو نہ کیونکر دیدۂ تر کو — جہاں میں ہے سراسر فیض شیشے ہی سے ساغر کو
نہیں ہے فقر کے دریا میں خطرہ چار موجہ کا — سمجھتے ہیں سبک تب کشتیِ درویش لنگر کو
پھنسا مت دل کسی کی زلف میں ظالم نہ چھوڑیگا — فلاخن دیر تک رکھتی ہے سرگرداں پتھر کو
اگر خط یار کو لکھا بھی میں تو رشک کے مارے — فلک نے بالِ عنقا کر دیا بالِ کبوتر کو

گر اُس کے وصفِ لب میں شعرِ رنگیں کوئی لکھتا ہوں / رگِ یاقوت کر دیتا ہوں نقشِ تارِ مسطر کو

جس زمیں میں بیٹھ کر اک دم میں اشک افشاں ہوا / نقشِ ہر قطرہ سے پیدا نوح کا طوفاں ہوا

آدم و حوا کی الفت سے کھلا ہم پر یہ بھید / روزِ اول عشق کا مورد دلِ انساں ہوا

طبع سے جاتی نہیں ہرگز مری خوئے خلیل / نیم نانِ جو پہ بھی میں طالبِ مہماں ہوا

رحم کھا کر اس نے آخر آپ پوچھا حالِ دل / اپنا چپ رہنا ہی اپنے درد کا درماں ہوا

مہربانی میں بھی اس کی مرگ ہے عشاق کی / برق اک ہم پر گری جس دم کہ وہ خنداں ہوا

ہم نہ سمجھے تھے کہ دل ہم سے خفا ہو جائیگا / آشنایوں یک بیک ناآشنا ہو جائے گا

گر دلِ بیمار کی آیا عیادت کو وہ شوخ / دل میں ہے جتنا گلہ حرفِ دعا ہو جائے گا

باغ میں دیکھے گر اُس کے دستِ رنگیں کی بہا / لالۂ احمر وہیں دزدِ حنا ہو جائے گا

مائلِ سرو نہ دیوانۂ شمشاد تھے ہم / گلشنِ دہر میں تھے سب سے پرآزاد تھے ہم

دفن کرنا تھا دبستاں ہی میں ہم کو پسِ قتل / کشتۂ الفتِ طفلانِ پری زاد تھے ہم

آبِ حیواں پہ ہمیں بختِ سیہ کیوں لایا / تشنۂ آبِ دمِ خنجرِ فولاد تھے ہم

تیغ سے منہ نہ پھراتے تھے دمِ خوں ریزی / زخمِ کاری پہ ستائش کنِ جلاد تھے ہم

جانتے تھے ہمیں سب کاملِ فن گرچہ نظر / عشق بازی میں نہ مجنوں تھے نہ فرہاد تھے ہم

ردیف (و)

وحشت

میرزا باقر علی خاں وحشتؔ تخلص قوم مغل اہل ایران از مرزایان باختر۔ والدِ بزرگوارش میرزا حسین علی خاں برادرِ مہدی علی خاں صوبہ دارِ بانسؔ بریلی از امرائے قدیم بسیار موقر و ممتاز بودہ۔ مقدماتِ ریاست و رفیق پروری و اخراجات . . . بارا نفس نفیس ایشاں ہمیشہ سردار۔ شجاعت و سخاوتِ ایں خاندانِ علیا ضرب المثلِ دانایانِ روزگار۔ خودش جوانِ صلاحیت شعار و نرم گفتار از عہدِ عنفوانِ شباب طبعِ موزونش سرے بصاحب کمالانِ نظم داشت و بہ قدرِ مرتبہ و حالِ ہر کس مسلوک ہم پیش می آمد۔ چوں بسنِ تمیز رسیدہ در کلامِ خود بہ عرصۂ قلیل از فیضِ خدمتِ استادان فصاحتے و بلاغتے پیدا کردہ عمرش قریب بکہل رسیدہ باشد از نتائجِ طبعِ آں بزرگوار است :-

نقشِ شیریں کھودنا یہ کوہ کن کی رمز ہے	یعنی سنگیں دل نہ سمجھے کوئی پتھر سے جدا
گو رلگ کر گلے کیونکر نہ دے وحشتؔ فشار	ایک مدت ہم رہے آغوشِ مادر سے جدا

داغِ پلنگ ہو گئے سب چشمِ انتظار	جب سے کہ مجھکو شوق ہوا ہے نگار کا
ہاتھ آوے گر وہ ہاتھ تو سینے پہ میں رکھوں	نایاب ہے علاج دلِ بے قرار کا
کارِ جہاں ہیں دخلِ نقیضین سے خراب	ہر کام میں فساد ہے لیل و نہار کا

دزدِ معنی ہی فلک دیکھے مصراعِ ہلال	صاف مضموں ہی بندھا اُس میں ترے ابرو کا
یاد کر اُس کو یہ رویا ہوں چمن میں وحشتؔ	کہ ہر اک تارِ کفن تار ہوا آنسو کا

ہوا ہے خط سے جوہردار آئینہ ترے رو کا
صفائی کے سبب ظاہر ہوا یا عکس گیسو کا
نگہ آفت، بلا قامت، کمر ہیچ و دہن معدوم
جو دیکھو غور سے تو وہ صنم پتلا ہے جادو کا
ہوا برگشتہ بختی سے ہمارے حق میں سم وحشت
خطِ پشتِ لبِ جاناں تھا نسخہ نوش دارو کا

ہم کو ایذا دے نہ تو اے سنگدل پچھتائے گا
توڑ کر آئینۂ دل منہ بھی پھر دکھلائے گا
شوخ ہے ایسا کہ گر اکدم رہا پرتو فگن
عکس اس کا خانۂ آئینہ میں گھبرائے گا
لاغری کہتی ہے پوشیدہ نگاہوں سے مجھے
استخواں میرے ہما کے بدلے عنقا کھائے گا
دست و پا تصویر کے زنجیر سے مانی تو باندھ
ورنہ اُس میں میرا نقشہ بھی پچھاڑیں کھائے گا

اضطرابِ دل رقم خط میں جو یکسر ہو گیا
اپنا مرغِ نامہ بر لوٹن کبوتر ہو گیا
بام پر مجکو اگر وحشت بلاتا ہے وہ شوخ
اُس کا چہرہ چاند سا خورشیدِ محشر ہو گیا

کیونکر نہ اُن کو جائے سخن ہو سخن کے بیچ
جن کو ابھی کلام ہے تیرے دہن کے بیچ

یہاں تو اندھیرے سی گھبراتا ہی جی حیرت ہی
گور کی کیونکہ کٹے گی شبِ تار آخرِ کار
سوتے تھے اُس سے لپٹ کر تو عوض میں اسکے
گور میں ہم پہ ہوا خوب فشار آخرِ کار

ٹہرا نہ کوئی بھی مرا آزار دیکھ کر
آنکھیں تلک تو پھر گئیں بیمار دیکھ کر

رحم آئے گا نہ واں بھی ترے دادخواہ پر
محشر میں جرح ہووے گی اُس کے گواہ پر
ہی جا رہی یہ ہیں زوال و کمالِ حسن
لکھا قضا نے یہ ورقِ مہر و ماہ پر

بولے منجم اُس کا جو دیکھا کسوفِ خط　　بھاری ہے ملکِ حسن کے یہ بادشاہ پر

تھے جو تربت پہ ترے طالبِ دیدار کے پھول　　جوشِ حسرت سے ہوئے نرگسِ بیمار کے پھول
منقبض وصل کی شب مجھ سے رہا تو ایسا　　کہ ہوئے غنچے کلی کے ترے سب ہار کے پھول

ضعف سے کیا کہیں کہاں ہیں ہم　　اپنی نظروں سے خود نہاں ہیں ہم

رنگِ ثبات بسکہ نہیں اُس نگار میں　　آتی ہے بوئے یاس گلِ انتظار میں
جس در سے چاہے جا تو دلا قید ہونے کو　　زنداں کے در ہیں حلقے جو ہیں زلفِ یار میں

مدت کی ہوس یہ دلِ نخچیر سے نکلی　　پرواز کی حسرت جو پرِ تیر سے نکلی
قسمت میں لکھا وہ کہ نہیں جو مرے شایاں　　یہ رسمِ غلط کاتبِ تقدیر سے نکلی

طاقِ نسیاں پہ ہمارا جام ہے　　خونِ عنقا بادہ گلفام ہے

تیغ سے خنجر سے نہ ڈر جائیں گے　　چینِ جبیں دیکھی تو مر جائیں گے
خوف اسیری میں رہائی کا ہے　　ضعف یہی ہے تو کدھر جائیں گے
کاٹنی ہیں گور کی اندھیاریاں　　کیا شبِ دیجور سے ڈر جائیں گے
کتنوں کی جاں بخشی کریں گے وہ لب　　کتنے ہی اس بات پہ مر جائیں گے

از بسکہ مجکو مرگ سے اپنے سرور ہے　　یہ گور کی بغل نہیں آغوشِ حور ہے

تن پروری سے اپنی ہے منظور نفعِ غیر — آخر تو ایک دن یہ بدن رزقِ مور ہے
جس شعر میں کہ میرے ہی مضموں فراق کا — اک حرف دوسرے سی جو دیکھو تو دو ہے

منشیٔ تقدیر کا ہوں گا گریباں گیر میں — بن پڑھائے لکھ دیا کیوں خطِ پیشانی مجھے

ہوں وہ بیار خجل جس سے مسیحا ہووے — جاں بلب ملک مدادا میں مداوا ہووے
گر کفِ دست کو میرے وہ کرے گل تکیہ — نورِ عارض سے اُسی دم یدِ بیضا ہووے

کس کے جلوے سے منور یہ مرا کاشانہ ہے — ہے گلِ خورشید گر گل بھی چراغ خانہ ہے

واہب

شیخ ہدایت حیدر واہب تخلص سکنۂ فیض آباد جوانِ غریب و دلچسپ است بمقتضائے موزونیٔ طبع چیزے کہ موزوں می کند آنرا بنظرِ خواجہ حیدر علی آتش می گذارند و در ستار نوازی نیز دستے تمام دارد عمرش سی وہفت سالہ تخمیناً خواہد بود، از دست :-

سینے کے داغوں کی گرمی سے گریباں جل گیا — آبِ اشکِ آتشیں سے اپنا داماں جل گیا
ضبط کرتے کرتے وحشت میں جو اُف میں نے کیا — خار و خس پھکنے لگے بیدِ بیاباں جل گیا
گر یہی ہے انقلابِ دہر تو سُن لیجیو — قبر میں ہندو گڑا واہب مسلماں جل گیا

عاشقوں سے رازِ الفت کا نہاں ہوتا نہیں — بلبلِ بیتاب سے ضبطِ فغاں ہوتا نہیں
لے چلی ہے وحشتِ دل اُس بیاباں میں جہاں — یہ زمیں ہوتی نہیں یہ آسماں ہوتا نہیں
پنج روزہ حسن پر نازاں نہ ہوئے پُر غرور — کوئی باغ ایسا نہ دیکھا جو خزاں ہوتا نہیں

عیش و عشرت میں بسر کر یہ شبابِ چند روز — پیر ہو کر کوئی اے غافل جواں ہوتا نہیں

طالعِ بد باز رکھتا ہے مجھے مقصود سے — یار ہوتا ہے تو پھر تنہا مکاں ہوتا نہیں

گل زرد ہوئے ہیں تری گل پیرہنی سے — تنگ آئے ہیں غنچے تری غنچہ دہنی سے

حسرت سی ہم آغوشی کے میں زرد ہوا ہوں — وہ سبز ہوئے جاتے ہیں نازک بدنی سے

تدبیر سے تقدیر کا لکھا نہیں مٹتا — فرہاد کو شیریں نہ ملی کوہ کنی سے

عاشق ہوں میں آزاد نہیں ہوں مجھے کیا کام — رومال سے سیلی سے چھڑی سے کفنی سے

بن موت کے آئے نہیں مرتا کوئی واہب — اندیشہ ہے قاتل کی کسی تیغ زنی سے

وارفتہ

جوانے دیدم در مشاعرۂ میاں صدر الدین از قومِ کاتیھ تخمیناً عمرش سی سالہ خواہد بود وارفتہ تخلص می نمود کاغذِ اشعارش بدست آمدہ از وچیزے نقل گرفتہ شد، این است:-

ہوا ہوں کشتۂ ناز و ادا کس حور طلعت کا — کہ اشنگِ چشمِ خوباں سے ہے یہاں غسل اپنی میت کا

نہ جی لگتا ہے بستی میں نہ ویرانہ ہی بھاتا ہے — نرالا کچھ نظر آتا ہے عالم اپنی وحشت کا

وصالِ یار کے سب لطف ہم کو بھول جاتے ہیں — مزا جب یاد آجاتا ہے کچھ کچھ[1] دردِ فرقت کا

نہ بھول اے غیر اس کے اختلاطِ چند روزہ پہ — کبھی ہم سے بھی نقشہ تھا یہی اس کی محبت کا

تمھارا تب سے یہ وارفتہ پابندِ محبت ہے — پنھایا تھا نہ لوگوں نے تمھیں یہ طوقِ منت کا

ناتوانی سے ہمیں تابِ سواری کب ہے — نکہتِ گل کے لئے دوشِ صبا مرکب ہے

شبِ ہجراں میں ترے کاکلِ مشکیں کا خیال — نیش زن دل میں مرے مثلِ سیہ عقرب ہے

(۱) ن- کچھ بھی-

دانۂ خال بلا دام عقب کے کاکل   مرغِ دل تیری گرفتاری کا ساماں سب ہے

ولی

ولی محمد ولی تخلص

نشہ بخشِ عاشقاں وہ ساقیٔ گلفام ہے   جس کی آنکھوں کا تصور بیخودی کا جام ہے

ولی

میرزا محمد علی ولی تخلص۔

خوش آوے کب گلوں کا تبسم ہزار کو   دیکھے جو مسکراتے لبِ بام یار کو

وارث

شاہ محمد وارث الہ آبادی وارث تخلص۔

کیا آہِ ناتواں مری اس کو اثر کرے   اک عمر چاہئے کہ لبوں تک گذر کرے

وحشی

میر بخشی وحشی تخلص از متوسطین است، ازوست:۔

اتنا نہیں کوئی کہ خبر دیوے یار کو   دشوار زندگی ہے دلِ بے قرار کو

وحشی

شیخ کرم علی وحشی تخلص خلفِ شیخ فرحت اللہ جوانِ شوریدہ مزاج وامرد پرست، طالب علم وغریب است بزرگانش سکنۂ لکھنؤ بودہ اند وخودش نیز ہمیں جا تولد ونشوونما یافتہ

بمقتضائے موزونئ طبع انچہ موزوں کردہ بہ نظرِ اصلاحِ فقیر گذرانده اول مشورہ اش بمنور خاں غافل بود آخر آخر رجوع بایں عاصی آوردہ عمرش بست و یک سالہ خواہد بود، از وست:-

مرے کا کیونکہ ہم پر سب کو گماں نہ ہووئے ۔۔۔ پہلو میں اپنے جب وہ آرامِ جاں نہ ہووے
آلودہ گردِ خط سے روئے بتاں نہ ہووے ۔۔۔ اس باغ میں الٰہی دخلِ خزاں نہ ہووے
بن دیکھے اُن کی صورت آتا نہیں ہے آرام ۔۔۔ اتنا بھی دل کسی کا محوِ بتاں نہ ہووے
اُس ماہرو کا جلوہ ہر آن دیکھتا ہے ۔۔۔ دل کیونکہ ٹکڑے ٹکڑے مثلِ کتاں نہ ہووے
دل ہی میں خون کیجے کیونکر نہ آرزو کا ۔۔۔ کیا بوسہ مانگیں اُس سے جس کے دہاں نہ ہووے
شمع و چراغ جلنا آکر جو ہم سے سیکھیں ۔۔۔ جل جائیں وہ سراپا تو بھی دھواں نہ ہووے
کس منہ سے مدح اُس کی وحشی بیاں کروں میں ۔۔۔ جس کی ثنا کے قابل کوئی زباں نہ ہووے

پردۂ غفلت پڑا ہووے تو کیا معلوم ہو ۔۔۔ جب اُٹھے آنکھوں سے تب نورِ خدا معلوم ہو
کیوں کہ زلفوں سے رخِ انور ترا معلوم ہو ۔۔۔ چاند بدلی میں جو چھپ جائے تو کیا معلوم ہو
جس نے دیکھی ہو ترے کوچے کی سیر اے حور وش ۔۔۔ باغِ جنت میں اُسے پھر کیا فضا معلوم ہو
قافلے والوں سے کیونکر جا ملے وہ ناتواں ۔۔۔ جس کو کوسوں تک نہ آوازِ درا معلوم ہو
شعر فہمی فی الحقیقت . . . مشکل ہے بہت ۔۔۔ اہلِ معنی کے سوا جاہل کو کیا معلوم ہو
اے طبیبو دل کی بیتابی سے آیا ہوں بہ تنگ ۔۔۔ مجکو بتلا دو اگر اس کی دوا معلوم ہو
ہاتھ آوے کس طرح تیری کمر ہے بے نشاں ۔۔۔ کوئی ڈھونڈے اس کو جس کا کچھ پتا معلوم ہو
باعثِ تزئینِ معشوقاں ہے ظلم و جور بھی ۔۔۔ خوں ملیں ہاتھوں میں تو رنگِ حنا معلوم ہو
پار دل کے ہو گیا نادیدہ ناوک یار کا ۔۔۔ سچ ہے کیا انسان کو اپنی قضا معلوم ہو
آج میرا گل ہوا ہے کس کی بالیں کا مقیم ۔۔۔ جھوٹ مت کہیو تجھے گر اے صبا معلوم ہو
دل سے وحشی کے اگر ہو جائے ٹک حرفِ دوئی ۔۔۔ تب اُسے کچھ منزلِ شاہ و گدا معلوم ہو

وزیر

وزیر تخلص، خواجہ وزیر فرزندِ خواجہ فقیر و نواسۂ مرزا سیف اللہ بیگ خاں کہ از اقربا و رفقائے نواب امیرالدولہ مرحوم بود از تلامذۂ ناسخ است غزل و قصیدہ میگوید و در نظمِ شعر اکثر معنیٔ بیگانہ می جوید استاد را نیز بر و فخر است، ازوست :-

وسعت

مستقیم خاں وسعت تخلص ولد محمد نور خاں ساکنِ رامپور شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق جوانے قابل و طباع و ذہین و خلیق و متواضع است عمرش چہل و پنج سالہ خواہد بود، ازوست :-

رکھو نہ زلف کا اپنی سدا نقاب میں سانپ
کہ کینچلی سے نپٹ ہوئے ہے عذاب میں سانپ

یہ عالم اُس کے ہے بالوں کے نیلے ڈوروں کا
کہ جوں ہو شاخ پہ صندل کی پیچ تاب میں سانپ

جھجک نہ اے بتِ بدمست شوق سے کر نوش
یہ عکسِ زلف ہے تیرا نہیں شراب میں سانپ

ہماری چشم میں دیکھے وہ عکسِ زلفِ بتاں
کہ جس نے دیکھا نہ ہو کاسۂ حباب میں سانپ

خیالِ جو ہے یوں دل میں اپنے اے وسعت
کہ جوں رہے ہے کسی خانہ خراب میں سانپ

واجد

شیخ محمد بخش واجد تخلص ولد شیخ شاہ محمد وطنِ بزرگانش قریۂ امیٹھی است و خودش در لکھنؤ تولد و نشو و نما یافتہ و از ابتدائے موزونیٔ طبع تا انتہا کلامِ خود را از نظرِ فقیر گذرانیدہ نہایت مہذب الاخلاق و سعادتمند و با اعتقاد یافتمش، بدایتِ شعرش علی الرسمِ زمانہ بود و آخر بطورِ شوکت بخاری سمندِ خیالش بہ طرفِ معنی بندی و نازک خیالی عطفِ عنان نمودہ قوتِ شاعری را بطوریکہ دریں زمانہ تحت لفظ خوانی خوش یافتہ خرج می نماید عمرش بست و ہفت سالہ خواہد بود اگرچہ فقیر اشعارِ خیالی را دوست نہ دارم برائے خاطرش ایں چند از انتخاب او کردہ بقلم دادہ ام، از وست :-

لکھا ہے ہر غزل ہیں میں نے مضموں چشمِ گریاں کا
بجا ہے گر ہو تارِ اشک سے شیرازہ دیواں کا

عیاں کر نخچۂ غم آفتابِ داغِ سینہ کو
کہ ہووے صرف چاکِ صبح تا اپنے گریباں کا

خدا رینائے دل کو کیوں نہ ہو ان نرم رویوں سے
رگِ سنگِ صنم ہر تار ہے زلفِ پریشاں کا

تڑپ کر کاٹتا ہے شب جو تیغِ یار کا زخمی
بیاضِ صبح کرتی ہے اثر پیدا نمکداں کا

نہ بیٹھا گوشۂ یادِ خدا میں یہ کبھی وحشی
لدا ہے پشت پر آہو کی دفتر میری عصیاں کا

مری زنجیر میں موجِ رمِ آہو کا عالم ہے
نگہبانِ اسیری ہو گیا رہبر بیاباں کا

گدا واجد ہوں اُس نورِ نگاہِ مرتضیٰ کا میں
ہوا خاکِ کفِ پا جس کے سرمہ چشمِ شاہاں کا

مرا شہرہ ہے طورِ چرخ پر آتش زبانی کا
صریرِ کلک کو دعویٰ ہے بانگِ لن ترانی کا

جنوں اک طفلِ مکتب ہے میں وہ شوریدہ شاعر ہوں
رمِ آہو ہے مضموں میرے صحرائے معانی کا

تصورِ یار کا میری نگہبانی میں ہے ہر دم
یہاں تک مرتبہ پہنچا ہے اس کی بدگمانی کا

اُس بت کو غم ہوا نہ مرے دل کے داغ کا — کافر کو کب ہے پاس حرم کے چراغ کا

نغمہ سنجی نے مری پھیلائی لوٹے بے خودی — ہمصفیروں کو ملا ساغر لبِ خاموش کا
خواب میں بھی غیر کی جانب نہ کی ہیں نے نگاہ — کام بے ہوشی میں یہاں ہوتا ہے اہلِ ہوش کا
عشق نے مجکو کیا واجد شہِ دیوانگی — افسرِ مجنوں ہوا تب سر مری پاپوش کا

دل جو مجھ وحشی کا پابند بتاں ہو جائیگا — دیدۂ آہو چراغِ کارواں ہو جائے گا
خنجرِ قاتل کی گر امداد مجرم پر رہے — شیر صحرائی ہرن کا پاسباں ہو جائے گا
دل ہے عاشق سینہ صد چاک میں اور جاں چلی — نالہ کر بلبل کہ یہ گلشن خزاں ہو جائے گا
یونہی گر لکھے شبِ فرقت میں مضموں سوزناک — خامۂ معنی سمندر کی زباں ہو جائے گا
نالۂ دل نے کیا میرے جو رام اُس شوخ کو — لطمۂ صرصر کمندِ آہواں ہو جائے گا
دل سعادتمند ہے ٹہرا جو زلفِ یار میں — سنبلستاں میں ہما کا آشیاں ہو جائے گا
وہ نگاہِ گرم رنگِ زرد پر گریاں پڑی — برق سے تاراج کشتِ زعفراں ہو جائے گا
ہو گئی خاصیتِ صرصر جو میری آہ میں — نقشِ باطل یہ حبابِ آسماں ہو جائے گا
لاغری سے ہوں گے مرنے پر نہ ہم ممنونِ خلق — لاشہ اپنا ہی چشمِ عالم سے نہاں ہو جائے گا
ناتوانی تو تو زندانی نہ کر بیمار ہوں — نیلگوں گنڈا مجھے طوقِ گراں ہو جائے گا
یونہی گر مضموں بہار آمیز اے واجد لکھے — اپنا یہ دیوانِ رنگیں بوستاں ہو جائے گا

ہے صفائی سے نہ تنہا گردنِ جانانہ شمع — ہاتھ ہی ہے ساعدِ سیمیں سے لے تا شانہ شمع
اس کی جاں بازی کا سُن لیتی اگر افسانہ شمع — چل کے پھرتی سو قدم گردِ سرِ پروانہ شمع
عشق نے تجکو کیا ساقی شرابِ درد کا — خونِ دل سے بھر لبِ گلگیر کا پیمانہ شمع

شعلۂ ہر حسن سے ظاہر نہیں دودِ سیاہ — جعدِ عنبر گوں کو کھولے ہے برائے شانہ شمع
یہاں تلک محوِ جمالِ یار پروانے ہوئے — رات بھر تنہا جلا کی صورتِ بیگانہ شمع
شعلہ بازی گر وہ مجھ آتش زباں سے سیکھ لے — پھونک دے فانوس کو بھی صورتِ خمخانہ شمع
بعدِ مردن بھی خیالِ شعلہ رویاں آگیا — ڈھونڈتا ہے گور میں میرا دلِ دیوانہ شمع
طورِ ثانی کا ہوا رتبہ تجلی کے سبب — گور پر میری جو آیا لے کے وہ جانانہ شمع
چاک کر ڈالے ابھی پیراہنِ فانوس کو — تیرے مجنوں کا اگر دل سے سنے افسانہ شمع
کہدے شعلے سے کہ آتش سرکشی اچھی نہیں — رحم لازم ہے کہ میں بے بال ہوں پروانہ شمع
سخت جانی سے سرِ پروانہ کٹ سکتا نہیں — کیا تری تیغِ زباں میں پڑ گیا دندانہ شمع
رات کو وقتِ ہم آغوشی بجھا دی یار نے — بسکہ تھی اہلِ حیا کو ننگِ خلوت خانہ شمع
عشق کی آتش کبھی راحت ضعیفی میں گئی — صبح کے ہوتے ہی محفل کر گئی ویرانہ شمع
تا درِ میخانہ بیتابی سے پہنچے سر کے بل — دیکھی گر اُس شعلہ رو کی لغزشِ مستانہ شمع
رحم معشوقوں میں گر ہوتا تو کیوں مرتے پتنگ — بازیٔ عاشق کو سمجھی بازیٔ طفلانہ شمع
اشک بے حاصل نہیں بہتے ہیں روئے صاف کے — دل میں کرتی ہے مگر پنہاں غمِ پروانہ شمع
موتی گانوں سے نہیں زینت کی خواہش حسن کو — اپنی زلفِ دود میں کب کھینچتی ہے شانہ شمع
ولئے بے دردی دمِ تیغِ زباں سے رزم میں — سر قلم کرتی ہے پروانہ کا کیا مردانہ شمع
کشتہ واجد شعلہ رویوں کا ہوں گر لودے کوئی — خاکِ تربت سے مری بن کر اُگے پروانہ شمع

وامق

شیخ بہادر علی وامق تخلص از ساداتِ ترمزی بزرگانش دراصل از خطۂ ترمز بودہ اند از مدتِ چہار سال در قصبہ جرآمؤ سرکارِ شاہ آباد قنوج مضافِ صوبۂ اکبر آباد استقامت درزیدہ اند و خود ش ہم دراں جا نشو و نما یافتہ درایامیکہ برائے تحصیلِ علوم در لکھنؤ قیام ورزیدہ

آں روز ہا بہ سبب موزونیٔ طبع چیزے موزوں می کرد بذریعۂ میر ساجد علی صاحب برائے مشورۂ سخن پیشِ فقیر رسیدہ چوں فکرِ ہندی و فارسی ہر دو می کرد آخر آخر بعد گفتنِ ریختۂ چند از نظم ہندی درگذشتہ بہ فارسی گوئی کمرِ ہمت محکم بر بست جوانِ خلیق و صلاحیت شعار است عمرش ..... خواہد بود از وست :-

مکن آزردہ دل ظالم چو من آزردہ جانے را | زند یک نالۂ آزردہ دل برہم جہانے را
چناں برخورد پیکانش کہ آتش داد پولادش | نشانِ تیر بارش کردہ چو دم استخوانے را

چرا نہ یار رسن در گلوے ما نکند | چہ واقع است دگر عنبریں کمند ترا

محبت پیشگاں را صبر ہم یک گونہ می باید | چرا رسوائے عالم میکنی اے چشمِ تر ما را
اے تشنہ رہ چارہ ذقن گیر خدا را | از چشمۂ حیواں مطلبِ آبِ بقا را
ہر عاشقِ دل خستہ کہ پا بوسِ تو خواہد | از خونِ جگر دام کند رنگِ حنا را

امشب بکوئے دوست گذر کردہ ایم ما | خود را ز دیر و کعبہ بدر کردہ ایم ما
بر ما بسانِ روزِ قیامت گذشتہ است | دور از رخش شبے کہ سحر کردہ ایم ما
صد بحرِ اشک تا بہ فلک جوش می زند | زاں آستیں کہ از مژہ تر کردہ ایم ما

ہمہ جا چرخ کماندار نشانم کردہ است | تیر ہا می رسد از ثابت و سیارہ مرا

دارد دلِ ما را خمِ زلفِ تو مشوش | تا نالہ فراموش کند راہِ لب ما

رہبرِ سوختگاں سوختہ می یابد — در رہِ عشقِ تو پروانہ بود ہادیٔ ما

ہر دو را در سرِ زلفِ تو بہم باید بست — دل گنہگارِ تو و دیدہ گنہگارِ من ست
از درِ دیر سوئے کعبہ نخواہم رفتن — رشتۂ زلفِ بتاں رشتۂ زنارِ من ست

ہر جا کہ می روم رخِ او در نظر بود — ہرگز میانۂ من و جاناں حجاب نیست

یک بار رخِ خوبِ ترا سیر بہ بینم — جانم بلب آمدہ جز اینم ہوسے نیست

آہِ من ترجمۂ حالِ پریشانی ہست — نالہ ام مصرعۂ برجستۂ دیوانے ہست
داغدارانِ تو در زیرِ زمیں مدفون اند — بہ تہِ خاک نظر کن کہ چراغانے ہست
زود باز آئی کہ ایں آتشِ خاموش مرا — از خرامِ تو امید دوسہ دامانے ہست
ایں ملاحت بہ گلِ لالہ و ریحاں مفروش — زخمِ دل بیں کہ سزاوارِ نمکدانے ہست

زمن نیاز و از دہر زماں جفائے ہست — میانۂ من و اد طرفہ ماجرائے ہست
برہنہ پا بہ بیابانِ عشق میگردم — چو گردباد مرا تا بسر ہوائے ہست

ہیچم ز بیابانِ محبت خبرے نیست — مستانہ رہے می روم راہ بری نیست
ہر چند کہ آئینہ صفت روئے تو باشم — از چشمِ سیاہ تو امید نظری نیست
... بہ گلستانِ جہاں ہم سر سبید م — زاں رو کہ مرا غیرِ تو اصنعِ ثمری نیست

دریغ کس نہ رسد گردِ وصیتِ من
مرا کہ برلبِ خاموش داستانے ہست
زلکھنؤ چہ سفر می کنی مرو واثق
دریں دیار زمینے وآسمانے ہست

جلوۂ روئے تو دیدم چمن از یادم رفت
بوئے زلفِ تو شنیدم ختن از یادم رفت
آں چناں محوِ تماشائے تو گشتم صیاد
کہ دریں کنجِ قفس پر زدن از یادم رفت

خندہ زد زخمِ دلم از لبِ خندانے چند
نکِ سودہ برو ریخیت نمکدانے چند
ایں کہ یاراں بہم آمیزش والفت دارند
جمع گشتند دریں حلقہ پریشانے چند
یادِ روزے کہ سراسیمہ و بگسستہ عناں
می گذشتی بسرِ بے سروسامانے چند
ہم چو نقشِ قدم افتادہ بخاکِ کویش
ہر طرف می نگرم دیدۂ حیرانے چند
مایلِ گریہ چنانم کہ زبس جوششِ سرشک
از سرِ ہر مژہ ام ریختہ طوفانے چند
یادِ آں روز کہ واثق ہمہ شب می گردم
ہمرہِ بادِ صبا سیرِ گلستانے چند

نہ تنہا چشمِ حیرانم برخِ او در نظر دارد
کہ چوں طاؤس ہر موئے تنم چشمِ دگر دارد
گریباں کردہ ام نذرِ جنونِ عالمِ مستی
نمی خواہم دمے عشقِ تو از من دست بردارد

کرد بیتاب مرا ہجرِ تو . . . . کہ مپرس
دارم از جورِ تو ظالم گلہ چنداں کہ مپرس

کجا بہ می شود زخمِ دلم از مرہمے
حسنِ ملیحش را بود شورِ نمکداں در بغل

تا نبود گدا زدل محرمِ سوز و سازِ من
بہ کہ فلاں نہ نشنود قصۂ جانگدازِ من

مستِ مئے مجسّم دیر و حرم مرا بہ کیست   پائے خم و سبو بود سجدہ گہِ نمازِ من

چساں یارب زنم در دامنِ آں تند خو دستے   کہ دارد غمزۂ سفاک بر تیغ و در و دستے

چہ می آید بدستت از پریشاں کردنِ دل ہا   سعیت کردم مزن ہر دم بزلفِ مشکبو دستے

دگر آں شوخ را میلِ حنا بندیست میدانم   کہ رونقے می برد و آمیتق بخونِ من فرو دستے

وفا

میرزا بہادر علی بیگ وفاؔ تخلص، شاگردِ شیخ پیر بخش مسرورؔ جوانِ سپاہی وضع است در توپخانہ نوکری دارد بمقتضائے موزونیِ طبع خود را مصروفِ شعر گفتن داشتہ دریں فن در عرصۂ قلیل قوتے و طاقتے پیدا کردہ عمرش از سی تجاوز خواہد بود، از وست:۔

جو قتل روبرو اپنے یہ خوب رو کرتے   نگہ کے کشتوں میں کیا ہم سرخرو کرتے

یہ جو کے وصل کی شب ڈر نہ اے خروسِ سحر   کھلا کے سرمہ ترا بند ہم گلو کرتے

یہ بانکپن ہے نیا قتل کر کے عاشق کو   نہیں وہ دامنِ پرخوں کو شست و شو کرتے

کب دل اپنا نہ پھنسا زلفِ گرہ گیر میں تھا   یہ تو دیوانہ سدا حلقۂ زنجیر میں تھا

کر کے وہ ذبح ہوا خوش کہ نکالا ہم نے   ایک مدت سے جو ارمان دلِ نخچیر میں تھا

تن میں آتی تھی ہر اک زخم سے جانِ تازہ   صاف اعجازِ مسیحا تری شمشیر میں تھا

کھینچ نقشے کو مصور بھی ہوا وارفتہ   کیوں نہ یہ کہئے کہ جادو تری تصویر میں تھا

تھا وہاں قتل کے ساماں میں وہ ظالم دن رات   دلِ نادان یہاں وصل کی تدبیر میں تھا

جس نے لاکھوں ہی پری خواں کو کیا دیوانہ   وہ پری زاد کبھی اپنی بھی تسخیر میں تھا

صیدِ لاغر مجھے جان اُس نے رکھا زہ پہ وہیں   تیر باریک جو اُس ترکش پر تیر میں تھا

ہو خفا پھینکدیا اُس نے ترا خط جو وفاؔ   کیوں لکھا حرفِ وفا نامی کی تحریر میں تھا

ہزاروں ہوتے ہیں گلرو نہاں زمیں کے تلے
نہ پھولے کیونکہ بھلا گلستاں زمیں کے تلے

عبث ہی ڈھونڈنا یارانِ رفتگاں کو یہاں
ملے گا اُن کا تو جا کر نشاں زمیں کے تلے

یقیں ہے گور میں بہنا یہ اپنی چشموں کا
کرے گا خون کا دریا رواں زمیں کے تلے

ہے دودِ آہ کا باعث کہ گور میں بھی ہم
بناتے روز ہیں اک آسماں زمیں کے تلے

جو زندگی میں تھے محوِ جمالِ لالہ رُخاں
گئے وہ داغ بدل لالہ ساں زمیں کے تلے

ہما کو عشق کے کشتوں نے جو دیا ہے مزا
وہ ڈھونڈھتا ہی مرے استخواں زمیں کے تلے

جو دلستاں ہی مرے دل کو تو ہی رہنے دے
میں لے کر جاؤں یہ آفت کہاں زمیں کے تلے

پھرے نہ ملکِ عدم سے جو اپنے یار وفا
کوئی ملا انھیں اچھا مکاں زمیں کے تلے

مُہرِ دہاں نہ اُس کی کبھی عمر بھر کھُلی
بارے جواب کھلی ہی تو دشنام پر کھلی

گر زلف و رخ کا اُس کے تصور رہا یہی
تو جان لو کہ چاہ یہ شام و سحر کھلی

کیا دل کے عقدے کھولتے پھر اُس کے روبرو
پاتے صنم کی چینِ جبیں ہم اگر کھلی

ہیں کس کے محوِ دید بھلا اس قدر کہ جو
دن رات آنکھ رکھتے ہیں شمس و قمر کھلی

دیتا ہے نقدِ جان ہر اک مشتری بہا
گوشِ صنم پہ قیمتِ سلکِ گہر کھلی

باتوں میں یا حیا تھی و یا گالیاں ہیں اب
نام خدا کھلی تو زباں اس قدر کھلی

پوشیدہ رازِ دل کو کیا اشک نے عیاں
اس طفلِ ناسمجھ کی یہ گر کر خبر کھلی

دیتا ہی زرگری میں تو یوں سب کو گالیاں
لیکن ہمیں سناتا ہے وہ سیم بر کھلی

ہے انتظار کس گلِ رعنا کا اے وفا
نرگس جو آنکھ رکھتی ہی آٹھوں پہر کھلی

ردیف (ہ)

ہنر

میرزا مغل بیگ ہنر تخلص برادرِ خوردِ مرزا علی ثمر، جوانِ وجیہہ است، سرے بگفتنِ شعر دارد از بسکہ کم فرصت است ہنوز پیشِ فقیر نیامدہ مگر کلامش را کہ برادرش می بیند گاہ گاہے برائے نظرِ ثانی من ہم میخواند از لطافتِ طبعش معلوم می شود کہ رفتہ رفتہ بجائے خواہد رسید ہنوز ابتدا است عمرش بست سالہ خواہد بود، از وست :-

قد رشکِ صنوبر ہے چہرہ مہ تاباں ہے
دنداں درِ یکتا ہے لب لعلِ بدخشاں ہے

تھی گات غضب جس کی اور انداز ستم تھا
شب رقص کی محفل میں لیا چھین دل اس نے

میں کیا کہوں جو کچھ کہ قلق نزع کے دم تھا
اک تیرے نہ آنے سے مری جان پہ ظالم

گو سیلیٔ خزاں سے ہوا زرد روئے گل
بلبل کو کب لگی ہے برا رنگ و بوئے گل

آٹھوں پہر زباں پہ جو ہے گفتگوئے گل
کیا تازہ گل بدن پہ تو عاشق ہوا ہنر

ہوس

نواب میرزا محمد تقی خاں ہوس تخلص خلفِ نواب میرزا علی خاں مرحوم جوانیست بزیورِ فضل و کمال آراستہ و در حالِ مہذب الاخلاقی پیراستہ محامدِ خاندان عالیہ ایشاں از روئے حسب و نسب محتاج بشرح و بیاں نیست بزرگانِ ایشاں ہمیشہ مقربِ ملوک و سلاطین بودہ آمدہ اند خود مقربِ نواب وزیر ابتدائے سلسلہ نسب بمالک اشتر منتہی می شود، چوں

درآغازِ ریعانِ جوانی موزونیٔ طبع داشتند چیزیکہ موزوں می کردند بہ نظرِ میر حسن مصنفِ مثنویِ سحر بیان می گذرانیدند بعد از وفاتِ آں بزرگ فقیر را بہ شرفِ استادی عزِ امتیاز بخشیدہ، در عرصۂ قلیل رخشِ طبیعت را از میدانِ فصاحت و بلاغت تیز تر دوانیدند مثنویٔ لیلیٰ مجنوں و دیوانِ غزلیات از تصنیفاتِ ایشاں بر صفحۂ روزگار یادگار است و اشعارِ آبدارش زبان زدِ صغار و کبار چوں در تذکرۂ اول بہ سببِ سہولتِ طرفین مرفوع القلم ماندہ بودند لہٰذا ابتلافیٔ آں پرداختم تا حقِ نمک تلف نہ شود عمرش از چہل متجاوز خواہد بود انتخابِ دیوانش اینست :-

جانہ صحرا میں کہ صحرا کہیں برباد نہ ہو
دیکھ ہر صید تجھے اپنا ہی صیاد نہ ہو

بندگی میں ہے مری جان اطاعت لازم
منتظر حکم کا رہ گو کہ کچھ ارشاد نہ ہو

اپنے یاروں کو وہ واماندہ کیا ہے کیونکہ
جوشِ گریہ سے جسے طاقتِ فریاد نہ ہو

ہے قسم تجکو کہ مستانہ پھرا ہے بادِ بہار
خاک جب تک کسی دیوانے کی برباد نہ ہو

صبر کر نالۂ موزوں نہ کر اے مرغِ اسیر
تجھ سے آزردہ کہیں خاطرِ صیاد نہ ہو

راحتِ ملکِ عدم یاد نہیں یاروں کو
عالمِ آزادی کا بھولا ہے گرفتاروں کو

وہ جو ہیں دیکھنے والے ترے اے مایۂ ناز
سرزنش کرتے ہیں یوسف کے خریداروں کو

داغ چیچک کے ہیں کیوں عارضِ رنگیں پہ ترے
کوئی پھولوں میں بساتا نہیں انگاروں کو

بیکسی ہی نے نہ دنیا کو تجا میرے بعد
غم بھی مرقد پہ مرے بیٹھ رہا میرے بعد

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

ملنے مرنے کا مجھے غم نہیں پر یہ غم ہے
کون ہوگا ہدفِ تیرِ بلا میرے بعد

کیا عجب مدفنِ لیلیٰ سے جو نکلے یہ صدا
میرے مجنوں ترا کیا حال ہوا میرے بعد

میں تو زنداں ہی میں دی جان بلا سے میری
باغِ عالم میں رہی گو کہ فضا میرے بعد

جلتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے
یاد آئے گی تمھیں میری وفا میرے بعد

اب تو کرتے ہو بہت لطف و کرم تم لیکن
بھول جانا نہ مجھے بہرِ خدا میرے بعد

اٹھ گیا میں جو جہانِ گذراں سے تو ہوسؔ
خاک چھانے گی بہت بادِ صبا میرے بعد

ہے سرخ لہو سے مژۂ چشمِ تر ایسی
سرخی نہیں دیکھی رگِ گلبرگ پر ایسی

اشکوں کی دکھاتی ہے لڑی چشمِ تر ایسی
یہ لطف نہ شبنم میں نہ سلکِ گہر ایسی

تاثیر نہ ہو جس کی ذرا دل میں کسی کے
کیا لطف کوئی آہ بھرے بے اثر ایسی

گر دستِ خیال اس کو لگے تو وہ لچک جائے
مانا ہے رگِ گل سے وہ نازک کمر ایسی

ڈرتا ہوں خدا خیر کرے دیکھیے کیا ہو
کچھ ہوش نہیں میں نے سنی ہے خبر ایسی

مشہور ہے کل صبح وہ جاوے گا سفر کو
مجکو تو خدایا نہ دکھانا سحر ایسی

پھر اس نگہِ گرم نے گرم اس کو کیا ہے
سوزش تو نہ رکھتا تھا یہ داغِ جگر ایسی

کہتے ہیں جسے سرورقِ جلدِ صباحت
سینے کی ترے لوح ہے اے سیم بر ایسی

ہوتا ہوں غلام اس کا ہوسؔ میں دل و جاں سے
تصویر دکھا دے کوئی مجکو اگر ایسی

خدنگِ یار نے گر سینہ اک نخچیر کا توڑا
سنانِ غمزہ نے دل لاکھ بے تقصیر کا توڑا

زبس ہے زندگی میں اس سے الفت بعدِ مردن بھی
پڑا تھا قبر پر مجنوں کے اک زنجیر کا توڑا

کیا پہلے نشانہ دل مرا آخر کو پچھتا کر
کماں اس نے جلا دی اور پیکاں تیر کا توڑا

ہوسؔ غمِ تشنہ کامی کا نہ کھا تو کوئے قاتل میں
نہیں اے یار یہاں آبِ دمِ شمشیر کا توڑا

ناحق کی اک بلا میں مجھے مبتلا کیا
او آرزوئے حسن بتا تو نے کیا کیا

سمجھے نہ ہم سرائے جہاں بے ثبات ہے / نقارہ گرچہ کوچ کا ہر دم بجا کیا
کیا فائدہ تجھے ہوا اے اضطرابِ دل / ناحق ہمارے صبر کو ہم سے جدا کیا
سویا جو میرے گھر کبھی وہ مستِ خوابِ ناز / تلووں سے اُس کے اپنی میں آنکھیں ملا کیا

ہمیں جو قیس غریب الوطن نظر آیا / تو جسم وہم تہِ پیرہن نظر آیا
میں دیکھ داغِ جگر خوش ہوا کہ مدت میں / گلِ حدیقۂ رنج و محن نظر آیا
خیالِ یار سرِ گرمِ کار و تیشہ بدست / عجب شکوہ سے گل کوہ کن نظر آیا
بنائی شکل جو قاتل کی میری آنی نے / تو اُس ورق میں بھی اک بانکپن نظر آیا
گرا تھا خونِ سرِ کوہ کن جہاں اُس جا / ہر ایک رنگ کا تختہ چمن نظر آیا
تری شبیہ بنانے لگا جو راقمِ صنع / بغور دھیان کیا تب دہن نظر آیا
جدھر وہ نورِ مجسم تھا مثلِ قبلہ نما / اُسی طرف کو رخِ انجمن نظر آیا
صفائی جسم کو دیکھو گیا جو باغ میں وہ / بدن میں عکسِ گل و یاسمن نظر آیا
جلا جو آتشِ فرقت میں اُسکی رات ہوس / برنگِ شعلہ ہر اک موئے تن نظر آیا

نہ مجنوں ہی تھا واں نہ واں کوہ کن تھا / سدا دشتِ غربت ہمارا وطن تھا
سحر کو عجب لطف دیکھا چمن میں / کہ بلبل تو روتی تھی گل خندہ زن تھا
نہ تھی تیرے وحشی کو جامہ کی حاجت / تہِ خاکِ دشتِ جنوں پیرہن تھا

بیمارِ عشق ساتھ سب ارمان لے گیا / سوزِ غمِ فراقِ بتاں جان لے گیا
غش ہوں گے گل اگر کوئی جھونکا نسیم کا / بلبل میں بوئے زلفِ پریشان لے گیا

ہوئے عازمِ ملکِ عدم جو ہوس تو خوشی یہ ہوئی تھی کہ غم سے چھٹے
یہ فراغِ الم سے نہ واں بھی ملا وہاں غم یہ رہا کہ وہ ہم سے چھٹے

کبھی دیر میں تھے کسی بت پہ فدا کبھی کعبے میں کرتے تھی جا کے دعا
ترے کوچے میں بیٹھے تو خوب ہوا کہ کشاکشِ دیر و حرم سے چھٹے

یہی کہتی تھی لیلیٰ پردہ نشیں کہ فراق کی اب اُسے تاب نہیں
ملوں اس سے میں تا مراقبیں حزیں غمِ ہجر کے درد و الم سے چھٹے

طلب اُس کی موئے پہ بھی رکھتے تھے ہم کہ وہ رشکِ گل از رہِ لطف و کرم
رکھے خاک پہ بھی جو ہماری قدم کبھی پاؤں نہ نقشِ قدم سے چھٹے

میں ہوا ابھی جو بسملِ تیغِ جفا وے باقی ہے دل میں ابھی تو وفا
کہ یقیں ہے لہو مرا جائے حنا جو لگے تو نہ پائے صنم سے چھٹے

کیوں نہ شاکی ہوں بختِ سیاہ سے ہم کہ وہ معدنِ شفقت و لطف و کرم
کرے نامۂ شوق جو ہم کو رقم تو سیاہی نہ نوکِ قلم سے چھٹے

ہوئے خوف سے گوشہ گزین عسس گیا سینہ پلنگِ فلک کا جھلس
شبِ ہجر میں یار بغیر ہوس مرے نالہ . . . . . جم سے چھٹے

ہوس شکوہ نہیں کچھ شوخیٔ رفتارِ خوباں سے یہ میری بے قراری خاک میں مجکو ملاتی ہے

قفس کو چھوڑ کر جانا بہت آسان تھا ہم کو یہ یہ غم ہے کہ ویراں خانۂ صیاد ہوتا ہے
شبِ فرقت کو کاٹیں ہیں ہوس آنکھوں میں ہم اُس بن کوئی کیا جانتا ہے ہم یہ کیا بیداد ہوتا ہے

کیا مزا ہو جو کسی سے تجھے الفت ہو جائے جی کڑھے فکر رہے میری سی حالت ہو جائے

تیرا بیمار دمِ نزع یہ مانگے تھا دعا ۔ دیکھ لوں پھر اُسے گر تھوڑی سی مہلت ہو جائے
جائیو مت تو صبا باغ سے زنداں کی طرف ۔ مجکو ڈر ہے نہ اسیروں پہ قیامت ہو جائے
اے دل اکدن تو گذر کر طرفِ اہلِ قبور ۔ تا کہ دیکھے سے انھوں کے تجھے عبرت ہو جائے
دیکھ تصویر کو مجنوں کی ہوس رشک نہ کر ۔ چاہیے عشق میں تیری بھی یہ صورت ہو جائے

کہیں کیا جو دنیا سے ہم لے چلے ۔ غم و درد و رنج و الم لے چلے
عدم ہی کے رہرو مسافر تھے ہم ۔ سرائے جہاں میں بھی دم لے چلے

کاش یارب اُس کو چوری ہی سے اکدم دیکھئے ۔ جان آنکھوں میں ہو کب تک ہجر کا غم دیکھئے
لاگ حسن و عشق کی موقوف ملنے پر نہیں ۔ ہو زیادہ شوق جتنا یار کو کم دیکھئے
میری حیرانی پہ کیا ہنستے ہو میں تو محو ہوں ۔ آئینہ میں اپنے ٹک مکھڑے کا عالم دیکھئے
ہے بہار آخر چمن کی بلبلوں سے جا کے صبح ۔ رخصتِ گل خوب رو رو مثلِ شبنم دیکھئے
وہ بھی تو غم سے مرے گھلتا ہی رہوے میں ہوس ۔ رشک تب آوے جب اُس کو شاد و خرم دیکھئے

تا کے فراقِ یار میں رنج و تعب رہے ۔ کیا لطف زندگی کا اگر جاں بلب رہے
اے چشمِ حیرت اُس کی طرف ٹکٹکی نہ باندھ ۔ مرنے تلک ضرور ہے پاسِ ادب رہے

نغمہ سنجانِ چمن طرزِ فغاں بھول گئے ۔ سنتے ہی میری زباں اپنی زباں بھول گئے
داستانِ عشق کی بے صرفہ کہی ہم نے دریغ ۔ اُس میں جو جو تھے خموشی کے مکاں بھول گئے
ناقہ کرنا تھا تمھیں دیر کی جانب راہی ۔ راہِ مقصد بھی تم اے کعبہ رواں بھول گئے
بعدِ مردن بھی کوئی نعش کے ہمراہ نہ ہوا ۔ جی سے ایسا ہمیں یارا

دل شکستہ میں رہا کارگہ مینا میں / توڑنا اس کا زبس شیشہ گراں بھول گئے
پھر بھی دل عشق پہ خوباں کے جلاتے لیکن / ہم ابھی تیری جفاؤں کو کہاں بھول گئے
سیر لالہ کو جو جاتے تھے چمن کا رستہ / دیکھ کر لب پہ ترے سرخیٔ پاں بھول گئے
شبِ ہجراں میں ہیں آثارِ سحر ناپیدا / شاید اس رات موذن بھی اذاں بھول گئے

قفس پر برگِ گل رکھنے سے اے صیاد کیا حاصل / گذشتہ صحبتوں کو پھر دلانا یاد کیا حاصل
جہاں سنتا نہ ہو کوئی کسی کی ایسی محفل میں / خموشی ہی بھلی ہے نالہ و فریاد کیا حاصل
نہیں دیوانگانِ عشق میں مطلق لہو باقی / جو اُن کی فصد کو آیا کوئی فصاد کیا حاصل
کرو کچھ فکر ایسی جس سے راہِ عشق طے ہووے / ہوس گر لاکھ فن کے تم ہوئے استاد کیا حاصل

قیامت یہ بھاتا ہے اُس بت کا کہنا / ہمیں اب تو جانے دو پھر آئیں گے ہم
ہوس دیکھ آئے ہیں اس کے کفک کو / ان آنکھوں سے اب خون برسائیں گے ہم

تمھارا دھیاں یہاں آٹھوں پہر ہے / کہو یارانِ رفتہ کیا خبر ہے
سفیدی مو کی اس ظلمت سرا میں / نمودِ صبح ہے وقتِ سحر ہے
فلک نازک مزاجوں کو نہ دے رنج / انھیں صندل لگانا دردِ سر ہے
عزیز آتش کو رکھ اے باغباں تو / درختِ خشک کا تیرے ثمر ہے
ملامت کیوں مجھے کرتا ہے صیاد / کہ میرا بوجھ میرے دوش پر ہے
شبِ غفلت ہے ہنگامِ جوانی / میاں یہاں آنکھ کھلنے تک سحر ہے
خبر میری پہنچ جاوے گی واں تک / مرا رنگِ پریدہ نامہ بر ہے
دیارِ تن میں کیوں ہے مضطر اے روح / ارادہ یہاں سے جانیکا کدھر ہے

نہ پایا کھوج برسوں نقش پائے رفتگاں ڈھونڈے — نہ ہو ممکن پتا جن کا انہیں کوئی کہاں ڈھونڈے

جاتے ہیں سیر کرنے کو کھترانیوں میں ہم — دل ہی لٹکتے پاتے ہیں چووانیوں میں ہم

بیٹھے تھے ایک عمر سے زندانیوں میں ہم — صد شکر اب گنے گئے فریادیوں میں ہم

کھلتا نہیں کہ کاسۂ سر میں لکھا ہے کیا — کچھ . . . تو پاتے ہیں پشیانیوں میں ہم

گو جی بٹا ہوا ہے وے لے خیالِ زلف — بھولے نہ تجکو لاکھ پریشانیوں میں ہم

فرہاد و قیس سے ہمیں نسبت کوئی نہ دو — نہ کوہیوں میں ہیں نہ بیابانیوں میں ہم

تیغِ نگہ کے کاٹ کی تعریف کیا کریں — برش نہیں یہ پاتے صفاہانیوں میں ہم

مجھ گرفتارِ قفس کا کوئی دم ساز نہیں — ہائے بے بال و پری طاقتِ پرواز نہیں

بیچ زنداں کے مواقید ہیں شاید مجنوں — آج زنجیر کی جھنکار کی آواز نہیں

تمھارے در پہ کھڑے بیقرار ہیں دو تین — نگاہِ لطف کے امیدوار ہیں دو تین

نہ ناامید ہو دستِ جنوں کو تیرے لئے — ابھی تو باقی گریباں میں تار ہیں دو تین

ہے بزمِ بادہ کشاں اے ہوسؔ جہانِ خراب — جو لاکھ مست ہیں تو ہوشیار ہیں دو تین

خواہ وہ قید رکھیں خواہ اب آزاد کریں — ہم کو طاقت نہ رہی اتنی کہ فریاد کریں

ٹک تو فرصت دے ہمیں اے طپشِ شوقِ چمن — ہم کوئی دن تو بھلا خاطرِ صیاد کریں

ہمدم

نمی دانم کہ کیست گمراہ ایں قدر کہ در مشاعرۂ مرزا نقی ہوسؔ کہ بکمال شہرۂ آفاق .

دریں زمینِ طرحی این غزل خواندہ بود از کتابِ مشاعرۂ مرزا محمد علی بیگ این چند شعر انتخاب کردہ نوشتہ شد، ازوست :-

سدا خورشید کو ہو رشک جس کے روئے روشن پر — ثمر کیونکر جھکا دے سر نہ اُس کے نعلِ توسن پر
جو ہیں افسردہ دل کب صدمۂ عشق انکو ہوتا ہے — اثر کرتی نہیں ہے چوٹ ہرگز سردِ آہن پر
پڑا رہتا ہوں کاٹوں پر غمِ فرقت میں میں دن بھر — بسر کرتا ہوں اکثر رات ساری خالی گلخن پر
عبث عشقِ بتاں میں رات دن نالاں ہے تو ہمدم — نہیں ممکن کہ دل پتھر کا پگھلے تیری شیون پر

ہلال

ہلالؔ تخلص شاگردِ زلالؔ در مشاعرۂ منور خاں عاقلؔ طرحے گفتہ ہمراہ استادِ خود آمدہ بود خواندہ رفت عمرش قریب بست سال خواہد بود، ازوست :-

تم جو سحر جلوہ نما ہو گئے — آئینہ خانہ کی جلا ہو گئے
ناز اٹھانے ہی نہ پائے ترا — ہم تو ادا ہی میں ادا ہو گئے
مانگ کا مضموں جو لگا سوچنے — بال مرے حق میں بلا ہو گئے
بیچ سے پردا جو دوئی کا اُٹھا — ہو کے فنا عین بقا ہو گئے
عشق میں خوباں کے تو ہم جوں ہلالؔ — خلق میں انگشت نما ہو گئے

ہاتف

شیخ حیدر علی ہاتفؔ تخلص بزرگانش سکنۂ دہلی بودہ اند وخودش در لکھنؤ تولد و نشو و نما یافتہ عمرش بست و چہار سال خواہد بود از چند سال شوقِ شعر پیدا کردہ و کلامِ خود را بنظرِ شیخ امام بخش ناسخؔ گذرانیدہ جوانِ غریب باخلق است، ازوست :-

عاشقی کا مری احوال نہ پوچھ اے ہاتفؔ — نہ بتاؤں گا میں یہ بات بتانے کی نہیں

ہے مجھے خلد میں بھی کوچۂ جاناں کا خیال
آگیا مجکو گلستاں میں گلستاں کا خیال

استخواں گور میں جبتک کہ نہ ہو جائیں گے خاک
تب تلک مجکو رہے گا سگِ جاناں کا خیال

چاندنی شب کا یقیں کیوں نہ شبِ تار یہ ہو
بسکہ رہتا ہے مجھے اس مہِ تاباں کا خیال

خطِ مشکیں رخِ تاباں پہ نمایاں ہووے
مسکنِ مور دلا ملکِ سلیماں ہووے

رعب اسے کہتے ہیں جاؤں جو میں اُس کوچہ میں
سگِ دلدار مجھے شیرِ نیستاں ہووے

رونا یہ چاہئے عاشق کو غمِ فرقت میں
کہ ہر اک داغِ بدن دیدۂ گریاں ہووے

جس نے سونگھا ہو کبھی اُس کا پسینہ ہاتفؔ
عطر سے کیوں نہ دماغ اُسکا پریشاں ہووے

گو خطِ سبز سے آلودہ وہ زنگار میں ہے
پر صفا اب تلک آئینۂ رخسار میں ہے

نالۂ مرغِ چمن کی نہیں آتی جو صدا
اس سے ہوتا ہے یہ ثابت کہ وہ گلزار میں ہے

بند زنداں میں ہم اور کوچۂ جاناں میں رقیب
قید میں مرغِ چمن زاغ چمن زار میں ہے

دل کہاں تیر لگایا تھا کہیں اُس مہ نے
اُس کا پیکاں یہ مرے سینۂ افگار میں ہے

وہ بھی دم بھرتے ہیں اے جان تری الفت کا
جنگ بس اتنے لئے مجھ میں او اغیار میں ہے

پھر گئی آکے کئی بار اجل اے ہاتفؔ
جان کیا نکلے مری دل تو مرا یار میں ہے

کس طرح کسی کو دہن اُس کا نظر آوے
جو چیز کہ معدوم ہو وہ کیا نظر آوے

اغیار کا کیا ذکر ہے ہم رشک سے مر جائیں
گر تجھ سے بہم صورتِ زیبا نظر آوے

آنکھیں مری روشن ہیں ترے نور سے اے ماہ
گر تو ہو نہاں چشم سے تو کیا نظر آوے

ہشیار

سید امجد علی ہشیار تخلص ولد سید غلام حسین تولدش در الہ آباد است وطنِ بزرگانش

شاہجہاں آباد خود بود و باش از چندے در لکھنؤ دارد مشارٌ الیہ داماد میاں تجلّی است، عمرش تخمیناً چہل و پنج خواہد بود، باوصفِ بے علمی و ناخواندگی چیزے کہ موزوں می کند از زبانش درست می برآید این فیضِ خاندانِ میر محمد تقی مرحوم است بسرے بگفتنِ ہجوہا ہم دارد و ہرچہ می گوید از نظرِ ناسخ می گذراند، از وست :-

کس نے غرفے سے دکھایا رخِ پرنور نہیں ۔۔۔ جو نظر آئی شبِ مہ شبِ دیجور نہیں

دراز دستِ ستم جس کا اک جہان پر ہے ۔۔۔ دل اپنا ان دنوں مائل اُسی جواں پر ہے
قلق ہے دل پہ یہاں تک کہ میری اِک پل میں ۔۔۔ ہزار لختِ جگر چشمِ خوں فشاں پر ہے
دھمک سے جس کی لرزتا ہے آسمان و زمیں ۔۔۔ وہ کوہِ عشق گرا مجھ سے ناتواں پر ہے
کیا ہے قتل جو لاکھوں کو بے گناہ اُس نے ۔۔۔ تو شورِ حشر کا سا اُس کے آستاں پر ہے
اگرچہ خاک نشیں ہوں میں چشمِ عالم میں ۔۔۔ ولے دماغ مرا ہفتم آسماں پر ہے
غمِ فراق سے ہوں جس کے جاں بلب ہشیار ۔۔۔ مزاج اس کا مرے اب تک امتحاں پر ہے

لے ہاتھ میں جب تیغ و سپر وہ نظر آئے ۔۔۔ ہم نذر کو ہاتھوں پہ لئے اپنا سر آئے
خوبی تو نوشتے کی مرے دیکھیو یارو ۔۔۔ افسوس مجھے کیونکہ نہ اس بات پر آئے
نامے مرے اُس پاس جو لے کر گئے قاصد ۔۔۔ سو اُن کے جواب آئے نہ وہ نامہ بر آئے
ہشیار گیا ہاتھ سے اپنا دلِ ناداں ۔۔۔ ہم کوچۂ دلدار سے پھر پھر کے گھر آئے

عشق میں تیرے ہوئی یہاں تک تو رسوائی مجھے ۔۔۔ اپنے بیگانے سبھی کہتے ہیں سودائی مجھے
اک نگہ کے ساتھ میری اُڑ گئے ہوش و حواس ۔۔۔ کن نے غرفے سے یہ اپنی شکل دکھلائی مجھے
زندگی نے باز رکھا مجھکو میرے قتل سے ۔۔۔ موت سو سو بار تیرے سامنے لائی مجھے

یہ نصیحت کب تری ناصح پسند آئی مجھے　　توجو کہتا ہے مجھے ہشیار مت مل یار سے

ردیف (ی)

یاس

میر الٰہی بخش یاس ولد رحمت علی، بزرگانش از شاہجہاں آباد و خودش در لکھنو تولد و نشوونما یافتہ و بہ سنِ تمیز رسیدہ بمقتضائے موزونیٔ طبع چیزے کہ موزوں می کند وگاہ گاہے حسبِ اتفاق آنرا بہ نظر می گذارند چنداں بایں امر مصروف نیست. عمرش تخمیناً سی سالہ خواہد بود، از وست:-

سامنے کیوں آئینہ حیراں نہ ہو دیکھ کر　　مار مرتے ہیں ہزاروں اُس کے گیسو دیکھ کر

صورت کفن میں ہے یہ ترے خاکسار کی　　چھاتی پھٹے ہے دیکھ کے جس کو مزار کی

ہیں سینکڑوں جہاں میں طرحدار آدمی　　بندے ہیں ہم اُسی کے جو ہو یار آدمی
قاتل جو تو کرے ہے مجھے قتل بے گناہ　　کیا منصفی کریں گے نہ دو چار آدمی

یار

میر احمد یار تخلص

آفریں اے دستِ گستاخِ محبت آفریں　　یہ گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا

اگر پرسی دریں فرخندہ دفتر　　دروغ چند یابی راست کمتر

مرا معذور دار اے مردِ ہشیار　　اگر آمیختم حنظل بہ شکر

کہ کار ریختہ کارانِ جہانست　　سخن گفتن نہ زیبائے زہر در
. . . .　　کہ در پیری ہمینم شد میسر

تاریخ خاتمہ تازہ گفتہ شد اینست :-

در سوادِ اعظمِ ایں تذکرہ　　ماند از رفتار چو پائے قلم
یافتم تاریخِ ختمش مصحفیؔ　　یادگارِ خامۂ جادو رقم

قطعۂ تاریخِ دیگر کہ شاگردم مرزا رمضان بیگ طپاں کہ ذکرش در حرف الطا گزشتہ گفتہ نیز دریں فرخندہ دفتر نوشتہ شد اینست :-

قطعہ تاریخ

طپاں چوں از پئے تاریخِ ایں جلد　　درِ معنی بہ سلکِ نظم سفتہ
نمودہ قطعِ پائے ہند ناگہ　　طلسماتِ خیالِ ہند گفتہ

تمت تمام

کتبہ رمضان بیگ طپاں سنہ ۱۲۳۷ھ